سالگرہ نمبر2
ماہنامہ
حنا
فروری 2015

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیات

انشاء نامہ

ناولٹ

مکمل ناول

سلسلے وار ناول

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماہنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ

اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

مستقل
سلسلے

کچھ نہ کچھ ادھر بھی ادھر سے ہماریاں

قارئین کرام! فروری 2015ء بطور سالگرہ نمبر 2 پیش خدمت ہے۔

گزشتہ شمارہ سالگرہ نمبر تھا۔ جسے قارئین کی کثیر تعداد نے سراہا اور ہماری حوصلہ افزائی کی، جس کے لئے ہم آپ سب کے مشکور ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک فرانسیسی جریدے میں آقا دو جہاںؐ کے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت ایک ایسی مذموم حرکت ہے جس کا مقصد مذاہب عالم کے درمیان تصادم کی فضا پیدا کر کے عالمی امن کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

عالم اسلام اس قبیح حرکت پر بجا طور پر سراپا احتجاج ہے اور دنیا بھر کے مسلمان شدید غم و غصے کی حالت میں ہیں۔ کیتھولک عیسائیوں کے مذہبی پیشوا پوپ فرانسس نے بھی فرانسیسی جریدے کی اس مذموم حرکت کی مذمت کی ہے۔ ان کا کہنا بالکل درست ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کی آڑ میں کسی مذہب کی توہین نہیں کی جا سکتی، نازیبا زبان استعمال کرنے والوں کو جوابی گھونسے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ یہ کسی بھی انسان کا حق ہے کہ وہ جس بھی مذہب کو پسند کرے اسے اختیار کرے لیکن اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے مذہب کا مذاق اڑائے یا اس کے خلاف اشتعال پھیلائے۔ تمام الہامی مذاہب، مذہبی رواداری کی تعلیم دیتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مغربی ممالک، جو آزادی اظہار کے علمبردار ہیں، کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی جائے کہ اگر ان ممالک میں ہٹلر کی حمایت یا ہولوکاسٹ کے متعلق سوال اٹھانا جرم ہے تو ایسی قانون سازی کیوں نہیں ہو سکتی ہے کہ پیغمبر اسلام کی ذات اقدس کے متعلق بھی کوئی توہین آمیز حرکت جرم قرار دی جائے۔

تم آخری جزیرہ ہو:۔ اس ماہ ام مریم کا ناول "تم آخری جزیرہ ہو" اپنے اختتام کو پہنچا، ام مریم کے ناول کے بعد ہم جس مصنفہ کا ناول شروع کر رہے ہیں، اس نے تحریر کی دنیا میں بڑی تیزی سے اپنا نام اور مقام بنایا وہ نام ہے نایاب جیلانی کا۔ اس ماہ سے نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول "پربت کے اس پار کہیں" شروع کیا جا رہا ہے، انشاء اللہ نایاب جیلانی کی یہ تحریر قارئین کی توقعات پر پوری اترے گی۔

اس شمارے میں:۔ نایاب جیلانی، ام مریم اور سدرۃ المنتہیٰ کے سلسلے وار ناول، قرۃ العین رائے کا مکمل ناول، رمشا احمد کا ناولٹ، شگفتہ شاہ، ثمینہ شیخ، سیما بنت عاصم، مریم ماہ منیر اور سویرا فلک کے افسانوں کے علاوہ حنا کے بھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

حمد باری تعالیٰ

ہم اب اک دوسرے ک جسم و جاں ہیں
ہمارے بیچ کیسی دوریاں ہیں

ہیں سنگتاں آئینوں کے اندر
ابھی تو اور بھی حیرانیاں ہیں

تعاقب میں رواں جنگل کا جنگل
سر ساحل شکستہ کشتیاں ہیں

شعاع نور کا کیسے گزر ہو
فضا میں منجمد تاریکیاں ہیں

یہاں تو سانس بھی لینا ہے مشکل
ہوا میں خون تشنہ جھاڑیاں ہیں

یہیں سب قافلے ہیں آ کر
یہی وہ خواب آور وادیاں ہیں

پروفیسر حامدی کاشمیری

نعت رسول مقبول ﷺ

مسلسل خواب میں تھا خواب میں ہوں
یہ کیسے عالم اسباب میں ہوں

ہے سارا شہر گرد تیرہ میں گم
میں تنہا ہالہ مہتاب میں ہوں

فراغت سے عدو بیٹھے ہوئے ہیں
میں اپنے حلقہ احباب میں ہوں

نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے
ابھی میں جس کے گرداب میں ہوں

تحفظ کیا کروں اب مال و جاں کا
گرفت پنجہ سیلاب میں ہوں

مبارک ان کو ساحل کی فضائیں
ابھی تک میں حصار آب، میں ہوں

پروفیسر حامدی کاشمیری

سید اختر ناز

اللہ کی راہ میں

حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، ہم لوگ دن کے شروع حصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں کچھ لوگ آئے جو ننگے بدن اور ننگے پاؤں اور تلواریں گردن میں لٹکا رکھی تھیں، ان میں سے اکثر لوگ قبیلہ معنر کے تھے بلکہ سارے ہی لوگ معنر کے تھے، ان کے فاقہ کی حالت دیکھ کر آپ کا چہرہ مبارک بدل گیا پھر آپ گھر تشریف لے گئے (کہ شاید وہاں ان کے لئے کچھ مل جائے لیکن وہاں بھی کچھ نہ ملا، آپ نماز کی تیاری کرنے گئے ہوں گے) پھر باہر تشریف لاکر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم فرمایا، انہوں نے پہلے اذان دی (ظہر یا جمعہ کی نماز تھی) پھر اقامت کہی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھائی پھر بیان فرمایا اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ترجمہ:۔ ”اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم خدائے تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔“
(سورۃ النساء آیت ۱)

اور سورۃ حشر میں ہے۔

ترجمہ:۔ ”اور اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بھیجا ہے۔“ (سورۃ حشر آیت ۱۸)

آدمی کو چاہیے کہ اپنے دینار، درہم، کپڑے، ایک صاع گندم اور ایک صاع کھجور میں سے کچھ ضرور صدقہ کرے، حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی ہو تو اسے ہی صدقہ کردے۔“

(یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کے پاس زیادہ ہو، صرف وہی صدقہ کرے بلکہ جس کے پاس تھوڑا ہے، وہ بھی اس میں سے خرچ کرے) روای کہتے ہیں۔

چنانچہ ایک انصاری ایک تھیلی لے کر آئے (وہ اتنی وزنی تھی کہ) ان کا ہاتھ اسے اٹھانے سے عاجز ہونے لگا بلکہ عاجز ہو ہی گیا تھا پھر تو لوگوں کا تانتا بندھ گیا (اور لوگ بہت سامان لائے) حتیٰ کہ میں نے غلہ اور کپڑے (اور درہم و دینار) کے دو بڑے ڈھیر دیکھے، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ انور (خوشی سے) ایسا چمک رہا ہے کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے پر سونے کا پانی پھیرا ہوا ہے (اس کام کی فضیلت سناتے ہوئے) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ جاری کرتا ہے تو اسے اپنا اجر ملے گا اور ان کے اجر میں سے کچھ کم نہیں ہوگا اور جو اسلام میں برا طریقہ جاری

کرتا ہے تو اسے اپنا گناہ ملے گا اور اس کے بعد جتنے لوگ اس طریقہ پر عمل کریں گے ان سب کے برابر گناہ اسے ملے گا اور ان کے گناہ میں سے کچھ کم نہیں ہوگا۔"
(اخرجہ مسلم و النسائی و غیر ہما کہذافی الترغیب ۵۳/۱)

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدھ کے دن قبیلہ عمرو بن عوف کے پاس تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اے جماعت انصار!" انہوں نے عرض کیا۔

"لبیک یا رسول اللہ!" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"زمانہ جاہلیت میں تم لوگ اللہ کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے لیکن اس زمانہ میں تم میں یہ خوبیاں تھیں کہ تم یتیموں کا بوجھ اٹھاتے تھے، اپنا مال دوسروں پہ خرچ کرتے تھے اور مسافروں کی ہر طرح کی خدمت کرتے تھے، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کی دولت عطا فرما کر اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیج کر تم پر بہت بڑا احسان کیا تو اب تم اپنے مال سنبھال کر رکھنے لگے گئے ہو (حالانکہ مسلمان ہونے کے بعد اور زیادہ خرچ کرنا چاہیے تھا کیونکہ اسلام تو دوسروں پر خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے) لہٰذا انسان جو کچھ کھاتا ہے، اس پر اجر ملتا ہے بلکہ درندے اور پرندے جو کچھ (باغوں کھیتوں وغیرہ میں سے) کھا جاتے ہیں، اس پر بھی اسے اجر ملتا ہے۔"

(بس یہ فضیلت سننے کی دیر تھی کہ) وہ حضرات انصار ایک دم (اپنے باغوں کو) واپس گئے اور ہر ایک نے اپنے باغ کی دیوار میں تیس تیس دروازے کھول دیئے۔
(اخرجہ الحاکم وصححہ کذافی الترغیب ۱۵۶/۴)

سخاوت

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے جو بیان فرمایا، اس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور اللہ کی حمد وثناء بیان کی اور فرمایا۔

"اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین کے پسند فرمایا ہے، لہٰذا اسلام میں سخاوت اور حسن اخلاق کے ساتھ اچھی زندگی گزارو، غور سے سنو! سخاوت جنت کا ایک درخت ہے اور اس کی ٹہنیاں دنیا میں جھکی ہوئی ہیں، لہٰذا تم میں سے جو آدمی سخی ہوگا، وہ اس درخت کی ایک ٹہنی کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہوگا اور وہ یونہی اسے پکڑے رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں پہنچا دیں گے۔"

"غور سے سنو! کنجوس دوزخ کا ایک درخت ہے اور اس کی ٹہنیاں دنیا میں جھکی ہوئی ہیں، لہٰذا تم میں سے جو آدمی کنجوس ہوگا، وہ اس درخت کی ایک ٹہنی کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہوگا اور وہ یونہی اسے پکڑے رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں پہنچا دیں گے۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا۔

"تم لوگ اللہ کی وجہ سے سخاوت کو اختیار کرو، اللہ کی وجہ سے سخاوت کو اختیار کرو۔"
(اخرجہ ابن عساکر کذافی کنز العمال ۲۱۰/۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مال خرچ کرنے کا شوق

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے کچھ عطا فرما دیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''تمہیں دینے کے لئے اس وقت میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے، تم ایسا کرو کہ میری طرف سے کوئی چیز ادھار خرید لو، جب میرے پاس کچھ آئے گا تو میں وہ ادھار ادا کر دوں گا۔''

(اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسروں کو دینے کا بہت زیادہ شوق تھا)۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (ازراہ شفقت) کہا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ اسے پہلے دے چکے ہیں (اب مزید دینے کے لئے کیوں اس کا ادھار اپنے ذمے لے رہے ہیں) جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بس میں نہیں ہے، اس کا اللہ نے آپ کو مکلف نہیں بنایا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ بات پسند نہ آئی۔

ایک انصاری نے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ خرچ کریں اور عرش والے سے کمی کا ڈر نہ رکھیں۔''

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے، انصاری کو اس بات پر خوشی اور مسکراہٹ کے آثار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے پر نظر آنے لگے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اسی کا مجھے (اللہ کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے۔''

(اخرجہ الترمذی کذانی البدایۃ ۶/۵۶)

خرچ کرنے سے پہلے مرجانا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ ان کے پاس کھجور کے چند ڈھیر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا۔

''اے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ! یہ کیا ہے؟''

انہوں نے عرض کیا۔

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مہمانوں کے لئے یہ انتظام کیا ہے۔''

(کہ جب بھی وہ آئیں تو ان کے کھلانے کا سامان پہلے سے موجود ہو)۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''کیا تمہیں اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ دوزخ کی آگ کا دھواں تم تک پہنچ جائے؟ (یعنی اگر تم ان کے خرچ کرنے سے پہلے ہی مر گئے تو پھر ان کے بارے میں اللہ کے ہاں سوال ہوگا)

اے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ! خرچ کرو اور عرش والے سے کمی کا ڈر نہ رکھو۔''

(اخرجہ البزار باسناد حسن والطبرانی واخرجہ ابونعیم فی الحلیۃ ۱/۱۴۹)

سات دینار

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک کا رنگ بدلا ہوا تھا، مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ کسی درد کی وجہ سے نہ ہو۔

میں نے کہا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کو کیا ہوا؟ آپ کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ان سات دینار کی وجہ سے جو کل ہمارے پاس آئے ہیں اور آج شام ہو گئی ہے اور وہ ابھی تک بستر کے کنارے پر پڑے ہوئے ہیں۔''

ایک روایت میں یہ ہے کہ ''وہ سات دینار ہمارے پاس آئے اور ہم ابھی تک ان کو خرچ نہیں کر سکے۔''

(اخرجہ احمد وابویعلی قال الھیثمی ۱۰/ ۲۳۸، رجال ھما رجال الصحیح)

نزع کے وقت

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سات دینار تھے جو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس رکھوائے ہوئے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ بیمار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اے عائشہ! یہ سونا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھجوا دو، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ہوش ہو گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنبھالنے میں ایسی مشغول ہوئیں کہ وہ دینار بھجوا نہ سکیں، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی مرتبہ ارشاد فرمائی لیکن ہر مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمانے کے بعد بے ہوش ہو جاتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کے سنبھالنے میں مشغول ہو جاتیں اور وہ دینار نہ بھجوا پاتیں۔

آخر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ دینار خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھجوائے اور انہوں نے انہیں صدقہ کر دیا۔

پیر کی رات کو شام کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزع کی کیفیت طاری ہونے لگی تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا چراغ اپنے پڑوس کی ایک عورت کے پاس بھیجا (جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ تھیں) اور ان سے کہا۔

''ہمارے اس چراغ میں اپنے گھی کے ڈبے میں سے کچھ گھی ڈال دو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزع کی کیفیت طاری ہو چکی ہے۔''

(اخرجہ الطبرانی فی الکبیر ورواتہ ثقات محتج بھم فی الصحیح ورواہ ابن حبان ۲/ ۱۷۸)

اللہ سے ملاقات

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں مجھے حکم دیا کو جو سونا ہمارے پاس ہے میں اسے صدقہ کر دوں، (لیکن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مشغول رہی اور صدقہ نہ کر سکی) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو افاقہ ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''تم نے اس سونے کا کیا کیا؟''

میں نے کہا۔

''میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم بہت زیادہ بیمار ہو گئے ہیں، اس لئے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایسے لگی کہ بھول گئی۔"
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"وہ سونا لے آؤ۔"
چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سات یا نو دینار لائیں، ابو حازم راوی کو شک ہوا کہ دینار کتنے تھے؟ جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لے کر آئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اللہ سے ملاقات اس حال میں ہوئی (یعنی اگر ان کا انتقال اس حال میں ہوتا) کہ یہ دینار اس کے پاس ہوتے تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا گمان کر سکتے؟ (یعنی ان کی بہت ندامت ہوتی) اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اللہ سے ملاقات اس حال میں ہوتی کہ یہ دینار ان کے پاس ہوتے تو یہ دینار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھروسے کو اللہ پر نہ رہنے دیتے۔"
(اخرجہ احمد قال الہیثمی ۱۰/۲۳۹)

غریب کا صدقہ کرنا

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، ایک آدمی نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔
"اے مال والو! نیکیاں تو تم لے گئے ہو کہ تم لوگ صدقہ کرتے ہو، غلاموں کو آزاد کرتے ہو، حج کرتے ہو اور اللہ کے راستے میں مال خرچ کرتے ہو۔"
حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
"اور تم لوگ ہم پر رشک کرتے ہو۔"
اس آدمی نے کہا۔
"ہم لوگ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں پر رشک کرتے ہیں۔"
حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
"اللہ کی قسم! کوئی آدمی تنگ دستی کی حالت میں ایک درہم خرچ کرے، وہ ہم مالداروں کے دس ہزار سے بہتر ہے کیونکہ ہم بہت زیادہ میں سے تھوڑا سا دے رہے ہیں۔"
(اخرجہ البیہقی فی شعب الایمان کذافی الکنز ۳/۳۲۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سخاوت

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ سخی کوئی عورت نہیں دیکھی، البتہ ان دونوں کی سخاوت کا طریقہ الگ الگ تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھوڑی تھوڑی چیز جمع کرتی رہتیں، جب کافی چیزیں جمع ہو جاتیں تو پھر ان کو تقسیم فرما دیتیں اور حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو اگلے دن کے لئے کوئی چیز نہ رکھتیں، یعنی جو کچھ تھوڑا بہت آتا، اسی دن تقسیم کر دیتیں۔
(اخرجہ البخاری فی الادب المفرد ۴۳)

☆☆☆

انشاء نامہ

میں بتاؤں جگنو میاں سے میری ملاقات پہلے کس طرح سے ہوئی تھی، یہ بہت پہلے کی بات ہے، جگنو میاں اسکول میں پڑھتے تھے اور بوائے اسکاؤٹوں کے ایک جتھے کے ساتھ مضافات میں کیمپ لگائے ہوئے تھے، ایک لڑکا درخت پر لکڑی کے ایک تختے کو کیلوں سے اس طرح جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس پر چیزیں لٹک سکیں، جگنو میاں نے اسے ایک طرف ہٹا کر کہا۔

"میاں! تم سے نہیں ہو گا، ادھر لاؤ میں ٹھونکتا ہوں کیل۔" تختے کو دیکھ کر وہ کہنے لگے۔

"ذرا ایک منٹ ٹھہرو، اس تختے کا یہ سرا جو ٹیڑھا ہے، پہلے اسے برابر کرنے کی ضرورت ہے، بس آری سے کاٹ دیا جائے گا۔"

آری بھی کہیں سے مل گئی اور جگنو میاں نے کاٹنا بھی شروع کر دیا، لیکن ایک دو ہاتھ چلا کر رک گئے اور کہا۔

"کس کباڑ خانے سے اٹھا لائے یہ آری، ذرا اس کے دندانے تیز کرنے چاہئیں، یوں کام نہ چلے گا۔"

دندانے تیز کرنے کے لئے ریتی چاہیے تھی، کسی کی خوشامد کر کے کوئی شخص مانگ لایا، لیکن قباحت یہ تھی کہ اس کی ہتھی نکلی پڑ رہی تھی، اس پر جگنو میاں نئی ہتھی لگانے کے لئے کوئی مناسب لکڑی تلاش کرنے لگے، خیر لکڑیوں کی وہاں کیا کمی تھی، لیکن جب تک کلہاڑے کی تیز دھار نہ ہو، لکڑی ٹھیک کٹنا ممکن نہیں، کلہاڑے کی دھار تیز کرنا کوئی ایسا علم تو نہیں جو صرف کابلی پٹھانوں کو آتا ہے، لیکن سان کا پتھر اس وقت تک کہاں بنتا ہے جب تک اس کے سہارے کے لئے لکڑی کی ٹانگیں مضبوط نہ ہو، اس کام کو ڈھنگ سے کرنے کے لئے جگنو میاں نے سب سے پہلے بڑھیوں والا بنچ بنانے کا فیصلہ کیا، جس میں جمائے بغیر آپ لکڑی پر رندہ کر ہی نہیں سکتے، دقت یہ تھی کہ اچھے اوزاروں کے بغیر بنچ کا بننا نہ ممکن، آخر بے چارے جگنو میاں کو اوزار لینے کے لئے شہر جانا پڑا اور وہ پھر نہیں لوٹے۔

ہاں کئی ہفتے بعد شہر سے کوئی آدمی آیا تو اس نے اطلاع دی کہ جگنو میاں ہر طرح خیریت سے ہیں، بازار میں مل گئے تھے، اوزار بنانے کی ولایتی مشینوں کے تھوک بھاؤ پوچھتے پھر رہے تھے۔

اس کے بعد تو ایک زمانے میں جگنو سے میری اچھی خاصی دوستی بھی رہی، کچھ دنوں ہم کالج میں پڑھتے رہے، لیکن افتاد قسمت کہ جگنو میاں پڑھائی میں زیادہ نہ چل سکے، وہ جس کام کو شروع کرتے، بڑے ذوق شوق سے شروع کرتے، لیکن راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ آن پڑتی تھی، مثلاً ایک بار انہوں نے جدید اردو ادب کا مضمون لیا، تھوڑے دن بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اس کے لئے قدیم اردو ادب کا پڑھنا

ضروری ہے، قدیم اردو ادب کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیے ابھی دو ہی ہفتے ہوئے تھے کہ دریافت ہوا کہ جب تک عربی پر عبور نہ ہو، فارسی کا علم مکمل ہو ہی نہیں سکتا، عربی میں ہاتھ ڈالا، پتا چلا کہ منبع عبرانی زبان ہے، جگنو میاں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عبرانی کے معلم کی تلاش شروع کر دی، دوڑ دھوپ کے بعد ایک شخص ملا تو اس نے بتایا کہ عبرانی کا فیقی اور آرامی وغیرہ زبانوں سے جو یکانی حروف میں مٹی کے لوحوں پر لکھی جاتی تھیں، گہرا تعلق ہے، جگنو میاں کو یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ ان حروف کا آخری ماہر دو سال قبل کسمپرسی کے عالم میں فوت ہو گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بے چارے کو پھر سے مضمون کا انتخاب کرنا پڑا۔

اب کے انہوں نے جغرافیہ لیا، کورس میں صرف ہندوستان کا جغرافیہ تھا، لیکن ہندوستان کوئی فضا میں معلق چیز تو ہے نہیں، آخر ایشیا کا حصہ ہے، لہٰذا جگنو صاحب نے، جو ہر مسئلے کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کے قائل ہیں، ایشیا کے متعلق پڑھنا شروع کیا، دوران مطالعہ انہیں خیال آیا کہ یہ مطالعہ تقابلی ہونا چاہیے، جب تک افریقہ، یورپ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ کا بھی زیادہ نہیں، تھوڑا تھوڑا حال نہ پڑھا جائے، ایشیا کا صحیح مقام کیسے معین کر سکتے ہیں، بات ٹھیک تھی، لیکن پورے کرہ ارض کا جغرافیہ جاننے کے بعد انہیں شوق ہوا کہ دوسرے سیاروں سے اتنی بے اعتنائی نہیں برتنی چاہیے، بالخصوص مریخ کے متعلق تفصیلی تحقیقات کر کے عام غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہیے، یہ کام تمام ہوا اور وہ زحل کی طرف توجہ کرنے والے تھے کہ کسی نے کہا۔

''میاں کس چکر میں ہو، یہ تمہارا سارا نظام شمسی کائنات کا ایک حقیر حصہ ہے، ایسے نہ جانے کتنے نظام شمسی اس میں بھرے پڑے ہیں۔''

جگنو میاں صاحب کائنات کی کنہ تلاش کرنے چلے تو اپنی بھی خبر بھول گئے۔

جگنو میاں نے کوئی ڈگری نہ لی لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا، انہیں تو محض علم کی طلب تھی، ورنہ خدا کا دیا سب کچھ تھا، روٹی کمانے کے لئے بزنس کی طرف رجوع کیا اور وہ بیس ہزار روپے جو خاندانی جائیداد سے ان کے حصے میں آئے تھے، انہوں نے ایک گیس پلانٹ میں لگا دیئے، اس میں کچھ گھاٹا ہوا، جس کی وجہ یہ تھی کہ گیس بنانے میں جو کوئلہ استعمال ہوتا ہے، وہ مہنگا پڑتا ہے، پندرہ ہزار روپے لے کر انہوں نے گیس پلانٹ سے قطع تعلق کر لیا اور کوئلے کی کان میں روپیہ لگا دیا، یہ کاروبار بھی ایسا کامیاب نہ رہا، کیونکہ کانکنی کے حصے اونے پونے بیچ دیے اور دس ہزار روپے جو حاصل ہوئے، کان کنی کی مشینیں بنانے کے ایک کارخانے میں لگا دیے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں انہیں بہت فائدہ ہوتا، بشرطیکہ گیس، جس کے بل پر کارخانہ چلتا ہے، اتنی مہنگی نہ ہوتی، انہوں نے وہ کاروبار بھی پانچ ہزار کا گھاٹا اٹھا کے چھوڑ دیا اور اس کے بعد ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری صنعت میں پاؤں جمانے کی کوشش کی، لیکن کسی نے غلط نہیں کہا کہ۔

''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے''

جگنو میاں کی گھریلو زندگی بہت خاموش اور پرسکون تھی، انہوں نے شادی بھی نہیں کی، البتہ محبت متعدد بار کی، افسوس یہ کہ کبھی اس محبت کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، ان کی پہلی محبت کا قصہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کیونکہ ان دنوں ہمارے تعلقات خاصے گہرے تھے، انہیں ایک لڑکی سے فوری اور بے پناہ قسم کی محبت ہوگئی، جیسی پرانی داستانوں کے ہیرو ہیروئنوں میں ہوا کرتی تھی،

یعنی آنکھیں چار ہوتے ہی عشق وغیرہ، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی نیت نیک تھی، ملاقات کے بعد ہی انہوں نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "میں اپنے گھر کی زینت بناؤں گا، تو اس لڑکی کو، چاہے ادھر کی دنیا ادھر کیوں نہ ہو جائے۔"

"کب؟" میں نے پوچھا۔

"کیا فوری طور پر شادی کر رہے ہو؟"

"نہیں جی!" انہوں نے کہا۔

"میں پہلے اپنے کو اس کے قابل بنانا چاہتا ہوں۔"

اپنے کو اس کے قابل بنانے کے لئے انہوں نے اپنی روحانی اور اخلاقی سطح کو بلند کرنا شروع کیا، انہیں افسوس ہوا کہ وہ اب تک ایک مذہب سے، جو اخلاق کی بنیاد ہے، اتنے بیگانہ کیوں رہے، انہوں نے محلے کے مدرسے فیض العلوم میں داخل ہو کر علوم قرآنی کی باقاعدہ تحصیل شروع کر دی، تھوڑے دنوں بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ تضیع اوقات ہے تاوقتیکہ کسی کو عرب کی تاریخ معلوم نہ ہو اور عرب قبائل کے سماجی پس منظر سے کما حقہ واقفیت نہ ہو، جگنو میاں نے نہایت خضوع وخشوع سے ان چیزوں کا مطالعہ شروع کیا اور دو سال تک اس میں جتے رہے، دو سال کے بعد جب انہوں نے اپنے کو اس لڑکی کے قابل محسوس کیا تو انہیں یہ بھی نہیں معلوم نہ ہوا کہ موصوفہ ایک ان گھڑ گاؤدی سے شادی رچا چکی ہیں، جس کا مونگ پھلی کا بزنس ہے اور جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ مدینہ کس شہر کا نام ہے یا پودینے کی طرح کوئی چیز، جو کھیتوں میں اگتی ہے۔

☆☆☆

☆☆☆

☆☆☆

قسط کا خلاصہ

جہان ثوالے کو کھونے کے تصور سے ہراساں ہے، ایسے میں ثوالے اسے زینب سے نکاح کو فورس کرتی ہے، صرف وہی نہیں جب معاذ بھی وہی بات کہتا ہے اور اس کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ یہ پیا جان کی خواہش تو جہان کے پاس انکار کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔

معاذ اور پرنیاں کے تعلقات کی سرد مہری جہان کی بہتری کی کوشش اور معاذ کو سمجھانے بجھانے کے باوجود بڑھتی جاتی ہے۔

جہان ثوالے کی بیماری کے متعلق جان کر خود کو فضا میں معلق محسوس کرتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

چالیسویں اور آخری قسط

اس کے رنج والم کا، بے قراری کا، وحشت و اضطراب کا یہاں تک کہ ہیجان کا بھی وہی عالم تھا، وہ اسی طرح زاروقطار روتی اُسے موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی، اسے مجرم گردان رہی تھی۔

''اگر تم ایسا نہ کرتے، اگر تم میری خواہش پوری کر دیتے...... مجھے...... مجھے اپنی چاہت کا مان دے دیتے، تو کبھی یوں برباد نہ ہوتی میں...... تم نے ہی مجھے بربادی کی انتہا تک پہنچایا، تم تھے جس نے مجھے ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیا۔''

مسلسل رونے سے اس کی آواز بھاری ہو چکی تھی، مگر غبار ختم نہیں ہو رہا تھا، وہ یونہی رو رہی تھی یونہی تڑپ رہی تھی، یونہی مسلسل بول بھی رہی تھی، جہان خود اذیتوں کے پل صراط پہ کھڑا اسے ٹوٹتا بکھرتا دیکھنے پہ مجبور تھا جیسے۔

''میں...... میں تو تھی ہی بری ناں......؟ میں تو تھی ہی ضدی...... آپ تو ایسے نہ تھے، آپ نے محض اپنی انا کو بچایا اور مجھے برباد ہونے دیا، اگر...... اگر آپ ایک بار مجھ سے کہہ دیتے، مجھ سے محبت کرتے ہیں، میں کبھی یوں خود کو داؤ پہ نہ لگاتی، مہندی کی رات تک منتظر رہی تھی میں آپ کی...... مگر آپ کیوں کہتے؟ کیوں کرتے ایسا؟ آپ نے محبت کی ہوتی تو ناں...... وہ تو میں نے کی تھی اور آپ سے کیا چاہا تھا؟ صرف اپنی نسوانیت کا بھرم اور وقار...... آپ نے وہ بھی نہ سونپا مجھے، پھر کیسے نہ کہوں، کہ میری ساری بربادیوں کے ذمہ دار آپ تھے۔'' وہ کہتی رہی تھی، روتی رہی تھی، اسے مارتی رہی تھی، یہاں تک کہ تھک گئی، بول بول کر بھی...... رو رو کر بھی، جہان ہنوز خاموش تھا، چہرے پہ گمبھیر سنجیدگی تھی، گاڑی ہنوز رکی ہوئی تھی، زینب نے خود ہی خود کو سنبھالا اور آنسو پونچھ دیئے، وہ بے حد نڈھال ہو چکی تھی، مگر دکھ اور شکوہ ہنوز تھا، جہان کی خاموشی بے پناہ اذیت میں مبتلا کر دینے والی تھی، جہان نے ٹشو کیس سے ٹشو کھینچے اور اس کا چہرہ جو ہنوز پسینوں اور آنسوؤں سے تر تھا صاف کرنا چاہا، زینب نے چہرے سے جھلکتی رعونت کو چھپائے بغیر اس کا ہاتھ جھٹک دیا، جہان ہرگز برا نہیں مانا اور گہرا متاسفانہ سانس بھر کے بولا اس کے لہجے کی تھکن میں واضح اضطراب ڈولتا تھا۔

''مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں ہے زینب! کہ میں تمہارا مجرم ہوں، اس بات کا ملال مجھے آج مزید بوجھل کر رہا ہے کہ تم صرف مجھ سے محبت کرتی تھیں اور میری منتظر تھیں، تم نے یہ بھی ٹھیک کہا، مجھے میری انا نے روکا اور میں تم سے تمہاری محبت سے محروم رہ گیا، میں اس بزدلی سے شرمندہ ہوں، جس نے ہم دونوں کو اتنا عرصہ تشنہ رکھا، مجھے تمہیں بتانا تو چاہیے تھا، زینب تم ٹھیک کہتی ہو...... محبت پہ انا کو اہمیت دینے والے ہی نامراد ہوتے ہیں، میں نے بھی اپنے حصے کی سزا! اپنے حصے کی اذیت کاٹ لی، مجھے معاف کر دو، کہ میں تمہیں ہرٹ کر چکا ہوں۔''

زینب جیسے ساکن بیٹھی تھی بیٹھی رہی، اس نے جہان سے نہ آنکھ ملائی تھی، نہ بات کا جواب دیا جہان کو بھی شاید جواب کی ضرورت نہیں تھی، جبھی گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

☆☆☆

وہ سلسلے وہ شوق وہ نیت نہیں رہی

اب زندگی میں ہجر کی وحشت نہیں رہی
ٹوٹا ہے جب سے اس کی مسیحائی کا طلسم
دل کو کسی مسیحا کی حاجت نہیں رہی
پھر یوں ہوا کہ کوئی شناسا نہیں رہا
پھر یوں ہوا کہ درد میں شدت نہیں رہی
پھر یوں ہوا کہ ہو گیا مصروف وہ بہت
اور ہم کو یاد کرنے کی فرصت نہیں رہی
اب کیا کسی کو چاہیں کہ ہم کو تو ان دنوں
خود اپنے آپ سے بھی محبت نہیں رہی

اس کے اندر ایسی خاموشی اتر آئی تھی، ایسی بربادی جو طوفان گزر جانے کے بعد ہی محسوس کی جاسکتی ہے، وہ خود اپنے آپ سے بھی بے زار تھی، بے حد خفا، کیوں...... آخر کیوں خود پہ ضبط کھویا تھا اس طرح......؟ تک نہیں بنتی تھی کوئی، سارے بھرم کھول دیئے، اپنے ہی ہاتھوں، اسے کب عقل آنی تھی......؟ وہ اب ہرگز بچی نہیں تھی، پھر کیوں مناسب رویہ نہیں رکھ پائی تھی، ساری دنیا کو تو محبت نہیں مل جایا کرتی۔

ساری دنیا کو عزت بھی نہیں پوری ملتی، ان اہم لوازمات کے بغیر بھی زندگی کو متانت وقار اور سادگی و بربادی سے گزارا جاسکتا ہے، اس بار بار طاری ہو جانے والی وحشت نے تو اسے کہیں کا بھی نہ رہنے دیا تھا، وہ ہرگز تماشا بننا نہیں چاہتی تھی، مگر پھر بھی بن جایا کرتی، ایسا کیا تھا آخر جہان میں کہ وہ اسے کھونے کے احساس سے پاگل ہوئی جاتی تھی، کوئی تک نہیں بنتی تھی کہ وہ یوں محبت کی سوالی بن گئی تھی، کاسہ پھیلائے خیرات کی منتظر بھکارن...... کتنا حقیر کر ڈالا تھا، اس نے خود کو خود ہی، اب کیا حل تھا......؟ اسے سمجھ نہیں آتی تھی، بہت دیر تک روتی رہی، دل کا بوجھ ہلکا ہی نہیں ہونے میں آتا تھا، تب وضو کر کے دو رکعت نماز حاجت کی نیت باندھ لی، حاجت سوائے دل کے سکون کے اور کوئی نہیں تھی اور اللہ کی یاد میں دلوں کا سکون پوشیدہ ہے بلاشبہ، بہت دیر تلک ہاتھ پھیلائے سابقہ لغزشوں کی معافی اور آئندہ کے لئے صبر و استقلال کی گزارش رب کے حضور پیش کرتی رہی تھی۔

اس رات جہان اس کے کمرے تک آ گیا تھا، اس کی دستک کے جواب میں وہ اندھی گونگی بہری بن گئی تھی...... ہمدردی...... جہان کو ہمدردی کھینچ لائی تھی، اسے یہ بھی نہیں چاہیے تھی، وہ جہان سے ملنا نہیں چاہتی تھی، جہان جبکہ اسی کوشش میں تھا، اس سے اگلے دن اس نے زینب کو کچن میں گھیر لیا تھا۔

''مجھ سے خفا ہو ابھی تک......؟'' وہ سوال کر رہا تھا، زینب نے جواب نہ دینے کی قسم کھالی۔

''کمرے میں چلو باتیں کرنی ہیں کچھ ضروری، بھاگ کیوں رہی ہو مجھ سے؟'' اس پہ جھک کر وہ شوخ استفسار کر رہا تھا، زینب نے بغیر لحاظ کے اسے پیچھے دھکا دے ڈالا۔

''کمرے میں چلو زینب! ورنہ میں کسی کی پرواہ کیے بغیر سب کے سامنے لے جاؤں گا۔'' یہ

کہیں سے بھی وہ جہان نہیں تھا، جسے وہ جانتی تھی، وہ تو اس کی بات پہ ہی بھک سے اڑ گئی۔
''خبردار...... فضول باتیں نہ کریں میرے ساتھ۔'' اس نے غراکر کہتے آنکھیں نکالیں۔
''یہ فضول باتیں نہیں...... محبت کا ادنیٰ سا اظہار ہے زوجہ محترمہ!'' وہ بغیر متاثر ہوئے گویا اس کی معلومات میں اضافہ کررہا تھا، زینب کو اس پل وہ دنیا بھر کا جھوٹا اور فلرٹ بھی لگنے لگا، جبھی تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔
''باہر نکلیں یہاں سے...... جائیں۔'' اسے دروازے کی جانب دھکیلتی وہ غصے سے پاگل ہونے لگی، جہان پہ مجال ہے اثر ہوا ہو، الٹا مزید پیش رفت کرتے اسے بازوؤں کے شکنجے میں کس لیا، زینب پھڑپھڑا سی گئی، اس دیدہ دلیری پہ ششدر ہوتی رہ گئی۔
''اس رات دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا؟ میں جانتا تھا تم سو نہیں رہی تھیں۔'' اس کے چہرے پہ خفیف سی خفگی اور جھنجھلاہٹ اتر رہی تھی۔
''وہ دروازہ اب کبھی نہیں کھلے گا، ہمیشہ کے لئے سن لیں۔'' زینب نے پوری قوت صرف کرکے اس کے بازوؤں سے نکلتے جتلانا ضروری خیال کیا۔
''اف...... صدیوں سے محبت کے لئے ترستے شخص کی شرافت پہ اتنا ظلم...... بیگم صاحبہ رحم۔'' اس کے شوخ لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی، زینب کی آنکھیں ایک دم سے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، کسی بھی مرد کے لئے سب کچھ بھلا کر ہلکے پھلکے ہو جانا کتنا سہل ہوتا ہے، پھر وہ خوش ہوتا بھی کیوں نہیں، جتلاتا بھی تو کیوں نہ...... اپنے اتاؤلے پن کی وجہ سے وہ سوچ چکی تھی نا اپنی کمزوری اسے، اس وقت تو جنید بھائی کی آمد سے جو وہ بھابھی کی تلاش میں آئے تھے اور انہیں یوں ایک دوسرے کے پاس دیکھ کر حیرت پہ قابو پاتے شرارت سے کھنکارتے مصنوعی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے پلٹ گئے تھے، مگر زینب کو جہان کے تسلط سے نجات مل گئی تھی مگر کب تک...... دروازے پہ آہٹ محسوس کرکے وہ جائے نماز تہہ کرتے چونکی، جہان دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا، زینب جہاں کی تہاں رہ گئی، آج وہ جانے کیسے دروازہ لاک کرنا بھول گئی تھی اور اب ہراساں ہو رہی تھی۔
''کیوں آئے ہیں؟'' وہ تڑخی۔
''مجھے تو آنا ہی تھا۔'' وہ نرمی سے مسکرایا، زینب اسی قدر چڑی۔
''چلے جائیں، میں لاک لگانا ہی کیوں بھولی۔'' اس نے غصے میں پیر پٹخا، جہان کی مسکراہٹ بے ساختہ و بے اختیار مچل گئی۔
''آج لگا کر بھی دیکھ لیتیں، میں ڈپلی کیٹ چابی بنوا چکا تھا، بس اک یہی حل تھا میرے پاس۔'' جہان نے کوٹ کی جیب سے واقعی چابی نکال کر دکھا دی، زینب چند ثانیوں کو حرکت نہیں کر سکی بس اسے گھورتی رہی۔
''مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے درشتی سے جتلایا، جہان ہرگز برا نہیں مان سکا۔
''مگر مجھے ضرورت ہے تمہاری۔'' وہ بے حد آہستگی سے بھاری آواز میں بولا، ایسے کہ اس کی آواز کا لہجے کا زیر و بم زینب کے دل کی دنیا اتھل پتھل کرنے لگا، زینب نے نظریں چرالیں۔
''کیوں آئے ہیں؟'' وہ جیسے سسک پڑی۔

''کوئی شوہر اپنی بیوی کے پاس کیوں آتا ہے، اتنا تو تمہیں بھی پتا ہوگا۔'' جہان نے شرارت سے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا تھا، زینب کا چہرہ یکدم دھواں دھواں ہو گیا۔

''ہاں...... پتا ہے مجھے اچھی طرح، آخر دو دو شادیاں کر چکی ہوں، دوسروں کو......'' وہ ہسٹریک ہو کر کہنا شروع ہوئی تھی انتہائی خود اذیتی میں مبتلا ہونے جا رہی تھی کہ جہان نے بہت سرعت سے بہت عاجزی سے بہت لاچار انداز میں اس کے ہونٹوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا، جو کپکپا رہے تھے، آنکھوں میں آنسو لرزتے تھے، چہرہ متغیر تھا، وہ صرف کانپتی تھی۔

''زینب پلیز...... پلیز زینب!'' جہان اس سے بڑھ کر اذیت و کرب کا شکار ہو چکا تھا، اس کی کمر کے گرد بازو پھیلا کر اس نے بہت آہستگی بہت نرمی سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور اس کے ریشمی بالوں پہ ہونٹ رکھ دیئے۔

''ایسے مت کرو زینی! سب کچھ بھول جاؤ۔'' وہ سرگوشی سے مشابہہ آواز میں التجا کر رہا تھا۔

''کیا بھولوں......؟ وہ اذیتیں؟ یا آپ کی بے حسی بھری نظر اندازی؟'' وہ اس کے بازوؤں میں ٹوٹنے بکھرنے لگی، زار و قطار روتے ہوئے جیسے پھر حال سے بے حال تھی۔

''مجھے معاف کر دو زینی! میری کوتاہی سے درگزر کر دو۔'' جہان نے اسے بازوؤں میں بھر کے اٹھایا اور بستر پہ لے آیا تھا، زینب نے مزاحمت نہیں کی، تھکے ماندے انداز میں یوں اس کے ساتھ لگ گئی جیسے طویل سفر سے بے تحاشا تھک گئی ہو اور مزید ہمتیں ناپید ہوں، دونوں کتنی دیر خاموش رہے، جہان اسے اپنی محبتیں سونپ رہا تھا، اسے اعتبار بخش رہا تھا، اسے مان دے رہا تھا، وہ لمحوں میں مالا مال ہوتی جا رہی تھی، خوشحال ہوتی جا رہی تھی۔

''آپ کو یاد ہے جے! میں کس کس انداز میں آپ سے اگلوانے کی کوشش کیا کرتی تھی، آپ نے کبھی کیوں نہیں سوچا، اگر میں کسی بات کے اتنا پیچھے پڑی ہوں تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟'' زینب کی آواز میں ہوک تھی، ناتمام حسرتوں کی تشنگی کا جان لیوا احساس نوحہ کناں تھا۔

''ایم سوری زینی! کہا ناں بھول جاؤ، میری جان آج کو یاد رکھو۔'' جہان نے اس پہ جھک کر مدھم سرگوشی کی اور اس کے آنسوؤں سے تر گال پہ ہونٹ رکھ دیئے۔

''میں سب کچھ ہی بھول جانا چاہتی تھی، جبھی آپ کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کیا تھا، مگر...... مگر آپ نے کہا...... وہ سب پرانی باتیں تھیں، سب بکواس تھا، آپ کے نزدیک وہ سب بکواس تھا؟'' زینب کچھ یاد آنے پہ تڑپ کر اس کے بازوؤں کا حلقہ توڑ کر پیچھے ہوئی، اس کی آہیں پھر کراہوں میں بدلنے لگیں، کتنی اذیت تھی اس کے چہرے پہ، زیاں کے احساس کا کوئی انت نہیں تھا، جہان جیسے سخت آزمائش سے دوچار ہوا۔

''مجھے تم پہ غصہ تھا زینی! میں برداشت نہیں کر سکا کہ تم تیمور سے ملنے جا رہی تھیں، اس غصے میں میرے منہ سے اول فول نکل گیا، میں بہت تکلیف سے دوچار تھا زینی! بہت کرب میں مبتلا تھا۔'' جہان نے خفت کا مظاہرہ کیا، ساتھ ہی اعتراف جرم بھی۔

''میں نے آپ کو سب بتایا تھا، صفائی بھی دی تھی، آپ کو منایا بھی تھا، آپ نہیں مانے۔'' وہ پھر شاکی ہونے لگی، جہان نے گہرا سانس بھرا۔

"لیکن تم نے مجھ سے غلط بیانی بھی کی تھی اور مسلسل کی تھی، میں نے تم سے تمہاری پراہم پوچھیں تم نے اس قابل نہیں سمجھا مجھے، یہ خیال کہ تم مجھ پہ اس گھٹیا انسان کو اب بھی فوقیت دے رہی ہو، مجھے غصے میں پاگل بنا چکا تھا، اسی غصے میں، میں نے تم پہ ہاتھ بھی اٹھایا، تم پہ زینب، جس سے میں اتنی محبت کرتا تھا کہ کبھی ایسی بدسلوکی کا تصور بھی نہیں رکھ سکتا تھا، یہ غصہ ختم نہیں ہوتا تھا۔" وہ بے حد شرمسار سا اپنی کیفیت بتلا رہا تھا، خفت زدہ ملول، زینب اسے دیکھتی رہ گئی، اس کی طویل وضاحت میں ایک لفظ ایک نقطے پہ اٹکی ہوئی، اس کا انداز ایسا غیر معمولی تھا کہ جہان محسوس کیے بغیر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔

"کیا ہوا..... ایسے کیا دیکھ رہی ہو زینی؟"

"آپ نے ابھی کیا کہا، کہ..... کہ آپ محبت کرتے تھے مجھ سے؟" وہ اس ٹرانس میں بولی تھی، اس کے ہونٹ شدت جذب سے کانپنے لگے تھے، جہان پہ سکتہ طاری ہونے لگا، اسے ایک بار پھر احساس ہوا وہ اس لڑکی کا کتنا بڑا نقصان کر چکا ہے، وہ اس کا کتنا بڑا مجرم ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ خود احساس زیاں کے احساس سے دکھ سے لبریز ہوتا گیا۔

"صرف کرتا نہیں تھا زینب، اب بھی کرتا ہوں، پہلے سے زیادہ شدید کرتا ہوں، کرتا رہوں گا، ہمیشہ۔" جہان نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر دل کی تمام تر گہرائیوں سے پوری صداقت کے ساتھ کھل کر اعتراف کیا اور محبت کی مہر اس کی پیشانی پہ ثبت کی، زینب کا پورا وجود کانپنے لگا، آنسوؤں میں روانی آتی گئی۔

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں جے! پھر کہیں۔" وہ جیسے مچلی تھی، اس کے لہجے میں عجیب پیاس تھی بے پناہ تشنگی اور اک مجنونانہ کیفیت کا احساس تھا، جہان کا اپنا دل اس کے دکھ پہ ملال پہ زیاں پہ رو اٹھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں زینی! بے حد بے پناہ بے حساب۔" اس کی آواز بوجھل ہوتی سرگوشی میں ڈھلتی گئی، وہ اس کی بہتی آنکھوں کو بار بار چوم رہا تھا، انداز میں عقیدت بھری ہوئی تھی، زینب نے آنکھیں بند کر لیں، مگر سرسراتی پلکیں ہنوز آنسو لٹا رہی تھیں۔

"پھر کہیں جے..... پھر کہیں۔" وہ تڑپی تھی، وہ سسکی تھی، اس پہ اک وجد اک بے خودی طاری تھی، جہان کے اندر جیسے کوئی گم ہونے لگا، اس نے کچھ اور شدتوں سے زینب کو بھینچ لیا، خود میں سمو لیا، اس رات وہ اپنی زیادتی کا ازالہ کرنے، زینب کی صدیوں کی تشنگی مٹانے کی خاطر بار بار اس کی محبت کا اظہار اور محبت کی شدتیں ظاہر کرتا رہا تھا، پھر بھی پتا نہیں کس حد تک وہ اس تشنگی کو ختم کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

☆☆☆

عشق لیلیٰ نہ شریں نہ فریاد ہے
عشق جلاد ہے جلاد ہے جلاد ہے

معاذ نے شعر سنا کر داد طلب نظروں سے حاضرین کو دیکھا، مگر کسی ایک چہرے پہ بھی ستائش و توصیف کا رنگ نہ پا کر اس کا موڈ آف ہونے لگا تھا، جبھی انہیں باقاعدہ گھورنے لگا۔

"کچھ منہ سے تو پھوٹو یار۔"

"آپ پہ یہ شعر سوٹ نہیں کرتا، اپنے حسب حال پڑھیں۔" زیاد نے منہ سے پھوٹ کر وضاحت کردی تھی، انداز شرارت سے لبریز تھا، جبکہ حوریہ نے ایک دم ہونٹ بھینچ لیے تھے، یہ شعر اور کسی کے حسب حال بے شک نہ ہو، اس پہ ضرور صادق آتا تھا، اس کے باوجود کہ اس نے کتنا دل مار لیا تھا، کتنا سمجھا لیا تھا خود کو، مگر معاذ کا سامنا تمام محنتیں اکارت کر جاتا، ساری ریاضت پہ پانی پھیر جاتا، پتا نہیں یہ عشق اتنا سفاک تھا یا معاذ حسن میں ہی کوئی انوکھی بات تھی، اس کا دل سلگنے تڑخنے لگا، وحشت سے بھرنے لگا۔

حوصلے بھی جواب دینے لگے

اس قدر اس نے آزمایا ہے

زیاد نے اس پہ جھک کر شعر پڑھا تھا، وہ چونک کر بلکہ ہڑبڑا کر اسے خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

بھڑکائیں میری پیاس کو اکثر تیری آنکھیں

صحرا میرا چہرہ ہے سمندر تیری آنکھیں

وہ پھر گنگنایا، نوریہ نے نہ صرف سر جھکایا، بلکہ کرب بھرے انداز میں آنکھیں بھی بند کرلیں، درد حد سے سوا تھا۔

ایسا کرتے ہیں تم پہ مرتے ہیں

ہم نے یوں بھی تو مر ہی جانا ہے

اس نے معاذ کی شوخ کھنکتی آواز سنی تھی، وہ یقیناً پرنیاں کو چھیڑ رہا تھا، پرنیاں کی جھینپی ہنسی اس بات کی گواہ تھی، نوریہ کے اندر سرسراتی وحشت کو بڑھاوا ملنے لگا۔

"زیاد......!" وہ گھبرا کر زور سے پکاری، زیاد جو مسکرا کر معاذ کو دیکھ رہا تھا، چونک کر متوجہ ہوا۔

"جی...... حکم جناب!" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"ابھی ہماری شادی میں کتنے دن ہیں؟" وہ یونہی بند آنکھوں سے سوال کررہی تھی۔

"ایک ہفتہ...... تمہیں بھی یہ دن بہت زیادہ لمبے لگ رہے ہیں ناں؟" وہ مزید شرارت پہ مائل تھا، نوریہ نے جیسے سنا ہی نہیں

"اتنے بہت سارے دن...... آپ آج مجھ سے نکاح نہیں کر سکتے ہیں؟" عجیب سوال تھا، زیاد تو جیسے حیرت سے بے ہوش ہونے کے قریب جا پہنچا۔

"مذاق کررہی ہو نوری؟" اس نے بھنویں ترچھی کر کے پوچھا تھا۔

"نہیں، میں اس قدر زندگی میں کبھی سنجیدہ نہیں ہوئی ہوں جتنا اس وقت ہوں۔" وہ یونہی سرگوشی میں جواب دے رہی تھی۔

(میں نے مما سے سنا ہے، نکاح کے بولوں میں اتنی طاقت پائی جاتی ہے کہ دو اجنبیوں کے درمیان بھی محبت کا احساس جنم لے لیتا ہے، میں یہی چاہتی ہوں، میں شادی سے پہلے پہلے معاذ

حسن کی محبت کے عفریت سے نجات چاہتی ہوں، تاکہ تمہاری حق تلفی نہ ہو سکے، تم سے بد دیانتی نہ ہو سکے، میں اپنے ضمیر اور رب کے سامنے سرخرو رہ سکوں۔)

زیاد کو یقین نہیں مان مل گیا تھا، اس نے نگاہوں کی دلنشین جنبش سے اس کی خواہش کے احترام کی یقین دہانی کرادی تھی اور نوریہ کے اندر عجیب سی تھکن اترتی چلی گئی تھی، اس نے پلکیں اٹھا کہ ہنستے مسکراتے خوش باش معاذ حسن کو دیکھا اور ہونٹ بھینچے سر کو نفی میں جنبش دینے لگی۔

پاگل پن کی ساری لکیریں میرے ہاتھ میں کیوں
اس کو چاہوں میں ہی چاہوں میں ہی چاہوں کیوں

(اب اور نہیں معاذ حسن! مزید نہیں، مجھے تمہارے سحر تمہارے اثر سے نکلنا ہے، اس سحر سے، جس نے مجھ سے میرے ہر رشتے کو دور کر دیا، خدا سے دور کر دیا، یہ دوری گمراہی ہے اور میں گمراہی سے پناہ چاہتی ہوں)۔

☆☆☆

''شاہ! اک بات کہوں آپ سے؟''

آج زیاد کا نوریہ سے نکاح تھا، جہان اسی تقریب کے لحاظ سے تیار ہو رہا تھا، سفید کھدر کا کرتا شلوار اس کے دراز شاندار وجیہہ سراپے پہ بہت جچ رہا تھا، چہرے پہ جو طمانیت و آسودگی تھی وہ سب سے اہم اور خاص چیز تھی، آنکھوں کی چمک اور دلکشی بہت بڑھی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، ڈالے کو وہ پہلی بار مکمل لگا، اس کا دل خوشی کے انوکھے احساس سے لبریز ہوتا چلا گیا تھا، اس کی ذرا سی گنجائش تھوڑا سا ایثار کتنے دلوں کی طمانیت سکون اور آبادی کا باعث بن گئی تھی، نقصان کیا ہوا تھا، وہ تو یکلخت امیر ہو گئی تھی، اتنے دعاؤں کے حصار میں تھی کہ اب مر بھی جاتی تو بخشش کی فکر نہیں تھی، نیکی کا فائدہ بھی تو یہی ہے، صدقہ جاریہ بن جایا کرتی ہے، کبھی اسے لگتا تھا اس سے بڑھ کر مشکل کام دوسرا نہیں ہو سکتا، مگر اب...... سچ ہے بجا ہے اب کے راستوں پہ چلنے کا ارادہ تو کرو، رب خود مددگار بن جایا کرتا ہے، وہ بھی خود پہ رب کی عنایتوں کی برسات ہوتی دیکھ رہی تھی۔

زیاد نے جب اپنا مطالبہ پپا کے سامنے رکھا تھا تو کیسی ہاہو کار مچ گئی تھی ہر سو، معاذ کے ساتھ باقی سب نے مل کر جو اس کا ناک میں دم کیا الامان، مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکا تھا، مما کی خوشی پپا کی دبی ہوئی مسکان بھی اسے حوصلہ دے گئی تھی، اس کے باوجود مجال ہے جو اس نے نوریہ کا نام بھی لیا ہو، یہی چیز نوریہ کے لئے صرف ڈھارس نہیں اعتماد اور سکون کا باعث ثابت ہوئی تھی۔

''ہاں بھی بولو، تمہیں اجازت کی کیا ضرورت ہے بھلا؟'' جہان نے کف لنکس بند کرتے ہوئے اسے محبت آمیز نظروں سے نوازتے پرفیوم کی بوتل اٹھائی جسے ڈالے نے اس کے ہاتھ سے لے کر خود اس پہ خوشبو کی پھوار برسادی تھی، انداز کسی حد تک شرارت بھرا تھا، جہان کے ہونٹوں پہ بہت دل آویز مسکان بکھرتی چلی گئی تھی۔

''سو کیوٹ، کبھی کبھی تم بالکل بچی لگتی ہو مجھے، معصوم اور شریر بھی۔'' جہان نے اس کا گال انگوٹھے اور انگشت شہادت کے درمیان چٹکی کے انداز میں پکڑ کر دبایا، وہ ایک دم کھلکھلادی تھی۔

''اور آپ مجھے ہمیشہ ہی دیومالائی کہانیوں کے سب سے حسین کردار اپالو جیسے ہی لگتے ہیں، باوقار، شاندار، ذی شان، جب تک نہیں ملے تھے مجھے میں اکثر بہت عاجز ہو کر سوچتی تھی، کیوں ہیں شاہ آخر اتنے پیارے کہ میں جتنا مرضی دل کو سمجھاؤں، یہ سمجھتا نہیں۔''

رائیل بیلو بہت اسٹائلش کامدار لانگ شرٹ چوڑی پاجامے میں وہ بلوریں لڑکی میچنگ کے زیورات اور شعاعیں بکھیرتی کلائیوں میں گجرے سجائے کتنی سادگی کس درجہ سجاکی سے پہلی بار اپنی کیفیت بیان کر رہی تھی، جہان کو اتنی اچھی لگی کہ دل چاہا بانہوں میں بھر کے دل میں چھپا لے، مگر وہ اس کی توجہ نہیں بٹانا چاہتا تھا، جبھی خاموش کھڑا محبت آمیز نظروں سے اسے دیکھتا رہا، وہ آج ہمیشہ سے کہیں بڑھ کر حسین اور سحر انگیز لگ رہی تھی، معصوم نوخیز اور دلربا، سب سے حسین اس کی سعادت مندی تھی، جہان کی ہر خواہش پہ بلا جھجک سر جھکانے کی ادا تھی، جس نے جہان کو اپنا اسیر کرنے اس سے محبت وعقیدت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

''اور میں اس دل کا مشکور ہوں، جو سمجھا نہیں، اگر یہ سمجھ جاتا تو آج اتنی حسین پیاری اور فرمانبردار بیوی سے محروم ہوتا میں......'' جہان نے مسکراتے ہوئے کہہ کر اس کے ماتھے پہ اپنی محبت کی مہر ثبت کی، اس کا لہجہ خوشبو بھرا تھا، اس کا انداز بے حد دلنشین تھا، ژالے شرما سی گئی، جہان کا انداز ہی اتنا وارفتہ تھا، اس کا دل مدھر سروں میں دھڑک اٹھا، گلابی چہرہ تمتماہٹ کے ہمراہ سرخ پڑتا چلا گیا۔

''ارے میں وہ اصل بات تو بھول ہی گئی۔'' وہ بولی تو حیا کا طلسم لمس کی کیف آگہیں دہکتی مدہوشی کا تاثر ابھی بھی اس کے لہجے سے ہویدہ تھا، جہان دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے بہت پرسکون انداز میں اس کا یہ روپ نگاہ کے رستے دل میں اتارتا رہا، وہ ہمیشہ اس کی قربتوں میں آ کر یونہی بے اوسان ہونے لگتی تھی، حسن ودلکشی کا شرم وحیا کا ایسا حسین سنگم جہان کو یونہی ہمیشہ مبہوت کر دیا کرتا تھا۔

''جب تک آپ کچھ ارشاد نہیں فرمائیں گی مائی لیڈی ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں، آپ چاہتی کیا ہیں۔'' جہان کا انداز بے حد شریر تھا، وہ گویا اسے اس کی بوکھلاہٹ کو نشانہ بنا رہا تھا، ژالے کچھ اور جھینپ گی، لمبی پلکیں صبیح گالوں پہ حشر سا اٹھانے لگیں۔

''جب سے زینی آپی ریکٹ ہوئی ہیں خیال میرے دل میں پختہ ہو گیا ہے، لیکن اگر آپ میری خواہش کو خوشی سے قبول کریں تو ہی......''

''ایسی کون سی خواہش ہے تمہاری؟'' جہان چونک کر رہ گیا۔

''ممی میری شادی اس لئے بھی جلدی کرنا چاہتی تھیں شاہ! کہ انہیں میرا بچہ چاہیے تھا، وہ بہت اکیلی ہیں، میں چاہتی ہوں وہ مزید اکیلی نہ رہیں، ہمارے پاس تو اولاد کی صورت میں فاطمہ بھی ہے، چند مہینے ہیں بیچ میں پھر زینی آپی کی۔'' جہان کی بھرپور سنجیدگی کی مظہر خاموش نظروں کے تسلسل نے ژالے کو نہ صرف کنفیوژ کیا تھا، بلکہ اس کی زبان بھی لڑکھڑا دی، جبھی اس نے ایکدم ہونٹ بھینچ لئے تھے اور کسی قدر خائف ہو کر جہان کو دیکھا۔

''آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی شاہ تو...... اٹس او کے، میں ممی کو بھی سمجھا دوں گی، لیکن پلیز

آپ خفا......" اسے مضطرب ہوتے گڑبڑاتے پاکر جہان نے اسے نرمی سے تھامتے ہوئے صوفے پہ بٹھا دیا، خود اس کے سامنے زمین پہ ہی پنجوں کے بل ٹک گیا تھا، اس کا گال سہلایا پھر بے حد رسان اور تحمل سے گویا ہوا تھا۔

"مجھے تمہاری بات ہرگز بری نہیں لگی، لیکن اولاد بانٹنے کی چیز بھی نہیں ہوتی ہے ژالے! یہ اگر نیت میں اخلاص اور نیکی کا جذبہ شامل ہو جو کہ تمہارے دل میں الحمدللہ موجود ہے، تو اس میں مضائقہ بھی نہیں، مجھے بھی تمہارے جذبات کی پذیرائی کر کے اچھا لگے گا، لیکن اپنے بڑوں کی رضا مندی کے ساتھ...... مگر بے فکر رہو، یہاں کے کسی بھی فرد کا دل اور ظرف چھوٹا نہیں ہے، وہ لوگ ہمارے فیصلے کا خیر مقدم کریں گے، البتہ اولاد کا والدین اور بزرگوں کو اپنے معاملات سے آگاہ رکھنا اور ان کے مشوروں کی روشنی میں قدم اٹھانا انہیں معتبر کر دیا کرتا ہے، سمجھ رہی ہو ناں؟"

جہان نے جس رسان سے جس محبت سے سمجھایا تھا، ژالے احسان مندی ممنونیت کے احساس سمیت نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی، جہان نے اسے اس کی نظروں میں معتبر کر دیا تھا صحیح معنوں میں گویا، وہ جانتی تھی، وہ اپنے رشتوں کے معاملے میں کتنا پوزیسو ہے، اولاد کا معاملہ تو اور بھی زیادہ جذباتیت والا ہوتا ہے، مگر وہ لمحوں میں اگر یہ فیصلہ کر گیا تھا، تو اس کے پیچھے صرف ژالے کی خواہش ژالے کے جذبات واحساسات کو اہمیت وفوقیت دینا، مقدم رکھنا تھا، ژالے کے دل میں اس کے لئے موجزن محبت واحترام کا احساس مزید بڑھتا چلا گیا، اس نے بہت عقیدت مندانہ انداز میں جہان کے ہاتھوں کو جھک کر چوما تھا۔

"جزاک اللہ شاہ! بلاشک وشبہ آپ میرے لئے رب کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت سب سے عظیم انعام ہیں۔" جذبات کی شدت نے اس کی آواز کو رقت آمیز کر دیا تھا، جہان نے بہت ملائمت سے اسے ساتھ لگا کر تھپکا اور اس کی آنکھوں کے آنسو بہت محبت سے صاف کیے۔

"مجھے تمہاری خوشی بہت عزیز ہے ژالے، لیکن میں چاہتا ہوں تم بہت اچھی طرح سوچ لو، اس میں شک نہیں کہ اپنے وجود کا حصہ الگ کر کے کسی کے حوالے کرنا آسان نہیں، یہ ایک مسلسل ضبط مسلسل آزمائش اور صبر آمیز کام ہے، کر سکو گی؟"

"انشاء اللہ! میں بہت پہلے ہی سوچ چکی تھی شاہ! پھر ہمارے پاس اولاد ہو گی ناں، فاطمہ ہے زینی آپی اور پھر مجھے بھی اللہ کے گھر سے پوری امید ہے۔" وہ بہت سکون سے کہہ کر مسکرائی تھی، جہان کو اس نازک لڑکی کے بلند حوصلوں کا مضبوط نیک ارادوں کا ایک بار پھر صحیح معنوں میں ادراک ہوا تھا، کچھ کہے بغیر اب کے اس نے محض اس کا گال سہلایا، گویا ہر طرح کے حالات میں اپنا ساتھ اپنا یقین سونپا تھا۔

☆☆☆

سونا چاندی کیا کریں گے پیار میں
سونے جیسے گن ہیں میرے یار میں
جنم جنم کے بندھن تجھ سے باندھ لئے ہیں
فیصلے قسمت کے میں نے مان لئے ہیں

کہاں کس کی ہو گی جو تقدیر ہے میری
رانجھے کی اس ہیر سے سندر ہیر ہے میری
رانجھا بول رہا ہے میرے یار میں
سونے جیسے گن ہیں میرے یار میں
ہو ہو سونا چاندی ....

ڈیک فل والیوم میں چل رہا تھا، حماد اور حسان جوش و خروش سے بھنگڑا ڈال رہے تھے، باقی پارٹی تالیاں بجا کر مزید حوصلہ افزائی میں مصروف تھی، آج زیاد کی مایوں کی رسم تھی، تمام تقریبات کا انتظام کمبائن تھا، سامنے اسٹیج پہ شاندار آرائش تھی، سرخ مخملیں صوفے پہ نوریہ زرد لباس زرد ہی کھنکناتی چوڑیوں سے بھی غضب کی دلکشی کے ہمراہ زیاد کے ساتھ بیٹھی تھی، اس کے چہرے پہ جو مسکراہٹ تھی، اس میں بڑے عرصے کے بعد تازگی نکھار اور دلکشی کا خالص رنگ اترا تھا۔

''یار میرا بھی دل کر رہا ہے، بھنگڑا ڈالنے کو، یاد ہے لالے نے بھی اپنی زندگی میں پہلی و آخری بار اپنی شادی کی خوشی میں ہی ڈانس کیا تھا۔'' زیاد کی بات پہ نوریہ کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

''مگر آپ کا ڈانس پہلا تو نہیں ہوگا۔'' اس کے گرفت کرتے انداز میں شرارت کا رنگ اتر آیا، زیاد خفیف سا ہوتا زور سے ہنس پڑا۔

''چلو پہلا نہ سہی آخری ثابت ہو جائے گا۔''

''کیوں......؟ خدانخواستہ اتنی خوفناک ہوگی تمہارے لئے نوریہ؟'' معاذ اسی پل وہاں آیا تھا، زیاد کی آخری بات اچک کر لقمہ دیا، نوریہ کا دل محض ایک لمحے کو ڈگمگایا اگلے پل وہ نارمل تھی۔

''خوفناک کیوں؟ خوش بخت کیوں نہیں؟ جیسے آپ کے لئے پرنیاں، جیسے جہان بھائی کے لئے ژالے اور زینب اور......''

''بس بس جناب! ویسے آج سے قبل میں نے اتنی پر اعتماد دلہن نہیں دیکھی۔'' نوریہ کی آنکھوں میں جھانک کر وہ شرارت آمیز مسکان سے بولا، نوریہ ایک لمحے کو دبک سی گئی تھی۔

''یہ بھی انڈر اسٹینڈنگ کا کمال ہے سارا، زیاد سے شادی لیٹ کرنے کی اصل وجہ ہی یہ تھی، ویسے بھی صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔'' اس کا پر اعتماد انداز خود زیاد کو بھی حیران کر کے رکھ گیا تھا، معاذ باقاعدہ سر دھن رہا تھا، زیاد سے مزید صبر نہ ہو سکا تو جا کر حسان اور حماد کے ساتھ بھنگڑے میں شامل ہو گیا، نوریہ معاذ کو نظر انداز کیے زیاد کو مسکراتی نظروں سے دیکھتی رہی۔

سونا چاندی کیا کریں گے پیار میں
سونے جیسے گن ہیں میرے یار میں
بڑی چمک ہے تیرے اس دیدار میں
سونے جیسے گن ہیں میرے یار میں

وہ خود بھی ساتھ ساتھ گنگنا رہی تھی، جہان اور ژالے بھی اسٹیج پہ معاذ اور نوریہ کے پاس آ گئے، معاذ جہان کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا تھا، جب نوریہ نے جہان کو مخاطب کیا تھا۔

"زینب نظر کیوں نہیں آ رہی ہے بھائی؟" اس نے جھک کر وانے کی گود میں بیٹھی اس کی چوڑیوں سے کھیلتی فاطمہ کو پیار کیا تھا۔

"وہ تو مجھے بھی نظر نہیں آ رہی، پتا نہیں کہاں ہے، ذرا پتا کراؤ۔" جہان نے مسکراہٹ دبا کر شرارت سے کہا، نوریہ کھسیا کر ہنس پڑی تھی، وہ صاف محسوس کرتی تھی، زینب سے منگنی کے بعد جہان کا مزاج اور انداز بدل گئے تھے، وہ سوبر اور باوقار تو اب بھی تھا، مگر پہلے کی طرح روکھا پھیکا اور ریزرو نہیں رہا تھا۔

"تو جائیے نا...... ڈھونڈ کے لائیں اسے اور اپنے دونوں پہلو آباد کر لیں۔" نوریہ نے بھی اس شرارت کے سلسلے کو بڑھاوا دیا جس کا آغاز جہان کی جانب سے ہی ہوا تھا، وانے مسکرائے گئی تھی، جہان واقعی وہاں سے اٹھ گیا تھا، اس کی تلاش میں وہ اندرونی حصے کی جانب آیا تو پہلا سامنا ہی بھابھی سے ہو گیا۔

"زینب کہاں ہے بھابھی؟"

"اپنے کمرے میں ہے، ابھی تیاری مکمل نہیں ہوئی اس کی۔"

آج کے دن بھابھی کی مصروفیات خاص تھیں، جبھی عجلت میں جواب دے کر ایک جانب چلی گئیں، جہان نپے تلے قدم اٹھاتا زینب کے کمرے کی جانب آ گیا، بند دروازے کی ناب گھما کر اس نے اندر قدم رکھا تو پرفیوم، شیمپو اور پھولوں کی دلفریب مہک نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا، زینب زرد کلر کے بہت اسٹائلش فراک میں ملبوس ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے آگے اسٹول پہ بیٹھی تھی، اس کا ملبوس اس کے پیروں کو بھی چھپا رہا تھا، کھلے بال کمر پہ سیدھے گرتے تھے اور صبیح گالوں پہ ریشمی پلکوں کا سایہ مرتعش تھا، سنہری بے حد نازک لین نیم دائرے کی شکل میں گلے پہ لگی ہوئی تھی، یوں لگتا تھا کسی نے اس کی راج ہنس جیسی مرمریں گردن میں سنہرا نفیس ہار ڈال دیا ہو، ہلکا ہلکا میک اپ اس کے ملکوتی نقوش کو مزید ابھار کر اور دلنشین بنا کر واضح کر رہا تھا، ایک ہاتھ سے بالوں کی لٹوں کو پیچھے کرتی دوسرے سے دراز کھولے وہ جیولری کے انتخاب میں مگن تھی، جہان اسے دیکھتا رہ گیا تھا، وہ حسین تھی، حسین تر...... بلاشبہ، مگر اس کی نزاکت اس کی اداؤں میں بہت سحر تھا، بہت کشش تھی، اس بات کا وہ بھی گواہ رہا تھا، کہ اس کی شخصیت کے یہ سارے رنگ جہان کے لئے ہی تھے، جہان پہ ہی عیاں ہوئے تھے، تیمور سے شادی کے بعد وہ اپنی ذات کی پرتوں میں ملفوف ہوئی محدود ہوتی چلی گئی تھی۔

جہان اس کی توجہ کی چاہ میں دانستہ کھنکارا تھا، زینب نے چونکے بنا گردن اٹھا کر آئینے میں ہی اسے دیکھا اور دلکشی سے مسکرا دی۔

"تم ابھی تک بھی تیار نہیں ہوئیں؟" جہان قدم بڑھا کر اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔

"بس ہو گئی ہوں، یہ جھمکے پہن لوں۔" اس نے اپنے فراک کے میچنگ بڑے بڑے جھمکے سامنے کیے اور پوری توجہ اپنے کام پہ مبذول کر دی۔

"یہ روایتی سا جملہ ہو جائے گا زینی! اگر میں یہ کہوں کہ تم پہ ہر شے جچتی ہے، مگر اس میں کوئی شک ہرگز بھی نہیں ہے۔"

وہ اس پہ جھک کر مخمور لہجے میں کہہ رہا تھا، زینب کے چہرے پہ خوشی کا فخر کا محبت کا تاثر سنہرا دلنشین تاثر بن کر جگمگایا، پلکیں جھکا کر ہونٹ کا کونہ دانتوں تلے دبا کر وہ آہستگی سے ہنس دی تھی، جہان قدم بڑھا کر اس طرح اس کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل پہ آ کر ٹکا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے تھے، سجی سنوری بے حد نازک و حسین زینب اور شاندار وجیہہ بے پناہ خوبرو جہان...... آئینے نے گواہی دی تھی کہ دونوں کی جوڑی باکمال ہے۔

''اک بات پوچھوں آپ سے جے!'' زینب نے اس وقت اس کا ہاتھ پکڑ کر لیا تھا، جب جہان نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا دوسرا جھمکا اٹھا کر خود اس کے کان میں ڈال دیا تھا، اک بار پھر آئینے میں اس حسین منظر کو مسکرا کر دیکھا تھا اور خراج پیش کیا تھا اس کی خوب صورتی کو۔

جہان کی نگاہ اس کے کان میں ہلکورے لیتے جھمکے پہ تھی، اس سوال پہ اس نے نگاہ کا زاویہ بدل کر انہی وارفتہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

''کیا بات؟'' اس کی متبسم نگاہ میں محبت کی گہری جھلک تھی، اس کے چہرے پہ اطمینان کا اور کاملیت کا ایسا تاثر ملتا تھا جو اسے مزید خوبرو بنا کر دکھلانے لگا تھا، زینب کو پا کر وہ واقعی مکمل ہو چکا تھا، اب کوئی کمی...... کوئی خلش اس کے ساتھ نہیں تھی۔

''وعدہ کریں سچ بولیں گے مجھ سے۔'' زینب کی ایسی بات پہ جہان نے مصنوعی خفگی سے گھورا تھا اسے۔

''تمہیں کس نے کہا، میں جھوٹ بھی بولتا ہوں؟'' زینب کے اعصاب پہ جواباً نادیدہ سا بوجھ آ پڑا۔

''میرے ساتھ تو زندگی موت کے جیسے اہم معاملے پہ آپ ہمیشہ غلط بیانی ہی کرتے آئے۔'' زینب نے جس طرح آہ بھری، جتنا تاسف و ملال اس کے انداز میں اترا یہ جہان کو مہر بالب کر کے رکھ گیا تھا۔

''تم خود کو یہ سوچ کر ڈھارس دے لو زینب، کہ یہ تقدیر کا لکھا تھا، یہ سب کچھ یونہی ہونا طے تھا۔'' کچھ تاخیر سے خود کو سنبھال کر وہ نرمی و رسان سے بولا، زینب نے سر ہلا کر تائید کر دی اور جیسے کس سوچ کی اتھاہ میں اترنے لگی۔

''تم کچھ کہنا چاہ رہی تھیں زینی!'' جہان نے اسے چونکا دیا تھا، اس نے بے اختیار سرد آہ بھری۔

''پر اس تو کریں نا پہلے۔'' زینب کے انداز میں سراسر شرارت تھی۔

''پر اس ہاتھ میں ہاتھ دے کر کیا جاتا ہے، لاؤ اپنا ہاتھ۔'' اس کی آنکھوں میں جھانک کر وہ ارفتگی سے بولا، چہرے پہ شرارت ٹپک رہی تھی، جہان نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا تھا، زینب نے بلاتردد اپنا نازک گلابی مخمل جیسا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا، جسے جہان نے نرمی سے دبایا تھا، پھر ہونٹوں سے چھوا آنکھوں سے لگا لیا، عہد دینے کا یہ ایسا لوٹ لینے والا، اسیر کر لینے والا انداز تھا، زینب کے معاملے میں وہ محبت کی ایسی ادا اپناتا تھا کہ زینب کو ہر بار نئے سرے سے حیران اور پھر قسمت پہ نازاں کر دیا تھا، مگر اس وقت زینب کی آنکھیں بھیگتی چلی گئی تھیں۔

''آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ یہ سچ ہے! میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا، ژالے نے فورس کیا تھا آپ کو۔''

وہ جانتی تھی جہان اب ہرگز ہرگز اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا، اپنے دل میں پھنسا وہ یہ آخری کانٹا بھی نکال لینا چاہتی تھی، چاہے اس کی کسک کیوں عمر بھر ساتھ نہ رہتی، چاہے اس کا دل کتنا ہی زخمی کیوں نہ ہو جاتا۔

''بولیں نا بے انتہا میں مجھے۔'' اسے خاموش مہر بلب پا کر زینب نے بھیگی آواز میں کہتے اس کا بازو جھنجھوڑ ڈالا تھا، جہان نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کو کھولا اور متاسفانہ سانس بھر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا، اس کی جانب متوجہ ہوا تو اپنی آنکھیں اس کی نازک نظروں میں گاڑھ دی تھیں۔

''ہاں زینب، یہ سچ ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کی وجہ ہرگز وہ نہیں جو تم سمجھتی رہی ہو یا اب بھی سوچ رہی ہو، بلکہ میں ایک عام انسان عام فیلنگز رکھنے والا آدمی تھا اور اپنی اس دیوانگی سے خائف تھا جو تمہاری محبت تمہاری طلب میں، میں نے جھیلی تھی، جس میں اتنے سال گزر جانے کے باوجود کمی نہیں آسکی تھی، مجھے لگا تھا، اگر میں تم سے شادی کرلوں گا، تو لازماً ژالے کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کا مرتکب ہو جاؤں گا، جو کہ میں ہونا نہیں چاہتا تھا، تمہاری محبت میں تمہاری طلب کی مجنونانہ خواہش مجھے بہت دور لے گئی تھی زینب، مجھے لگا تھا تمہارے سامنے تمہاری قربتوں میں ژالے مجھے کبھی نظر نہیں آسکے گی، میں ژالے سے زیادہ اللہ کے ہاں مجرم قرار پانے سے خائف تھا اور بس۔''

وہ خاموش ہوا تو زینب نے مضمحل انداز میں سر جھکا کر ہونٹ باہم بھینچ لئے تھے، جہان اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا، اسے ہرگز بھی زینب کی یاسیت کی وجہ سمجھ نہیں آسکی، اس سے قبل کہ وہ کچھ پوچھتا زینب خود بول پڑی۔

''اور جبکہ اب ایسا نہیں ہوا، آپ نے مجھے حاصل کر کے بھی ژالے کی حق تلفی نہیں کی، اسے فراموش نہیں کیا، تو اس کا مطلب آپ کو مجھ سے محبت نہیں رہی؟''

یہ آخری سوال کرتے اس نے خود کو گویا سولی پہ محسوس کیا تھا، خدشات کی یلغار کے ساتھ اس کی آواز میں لرزش اتر آئی تھی، کتنا ہراس تھا کہ اس قدر خوف اس کی نظروں میں، جہان نے دیکھا تھا، محسوس کیا تھا اور مضطرب ہوا اٹھا تھا، پھر اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے نزدیک آیا، اس کے کپکپاتے وجود کو اپنی مہربان پناہوں میں سمیٹا اور محبت سے تھپتھپایا۔

''پاگل پاگل ہو تم زینی! یہی بات بھلا کیوں سوچی تم نے؟ میں نے اپنا یہ خدشہ یہ خوف پوری دیانتداری کے ساتھ معاذ کے سامنے رکھ دیا تھا اور رب سے اس آزمائش میں سرخروئی کی دعا مانگی تھی، وہ بہت مہربان ہے زینی! جو اس کے راستوں پہ چلنا چاہے، بہت پیارے انداز میں راہنمائی فرماتا ہے، میں تو بس اتنا جانتا ہوں، میں ادھورا تھا، اس نے مجھے مکمل کر دیا، میں بکھرا ہوا تھا، تمہاری صورت اس نے مجھے سمیٹ دیا، مجھے میری خواہش کے مطابق انصاف کی توفیق بخشی، ہاں اگر مجھے محبت تم سے زیادہ ہے بھی تو اس پہ خدا کی جانب سے بھی کوئی باز پرس نہیں ہے یہ اختیاری جذبہ ہے اور رب ہی دلوں میں نازل فرمانے والا ہے۔''

زینب نے بہت دھیان سے اس کا ایک ایک لفظ سنا تھا، دل میں اتارا تھا، کچھ کہے بنا اس نے آنسو بھری آنکھوں سے جہان کو دیکھا، پھر اس کے کشادہ سینے میں منہ چھپالیا۔

(آج صرف آپ ہی نہیں ہے، میں بھی مکمل ہوگئی ہوں، آج سے پہلے تک مجھے یہ ملال یہ رنج گھلاتا تھا کہ اگر اللہ نے آپ کو ہی میرا نصیب بنانا تھا، تو پہلے ہی کیوں نہ مجھے آپ کو سونپ دیا، لیکن آپ میں اس مصلحت کو بھی اس کے فضل سے جان سکی ہوں، کہ اس سے بڑھ کر کوئی انصاف کرنے والا نہیں مردوں کے درجے اور مقام کے لحاظ سے ہی ان کے لئے عورتوں کا انتخاب ہوتا ہے، پاک مردوں کے لئے پاک عورتیں اور پاک عورتوں کے لئے پاک مرد...... میں صبر محبت اور ضبط وتحمل میں آپ کے درجے پہ نہیں تھی، جبھی خدا نے آپ تک پہنچانے سے قبل حالات کی بھٹی میں ڈال کر میرا میل کچیل اتارنے کا اہتمام کیا، اگر آپ مجھے پہلی ہی بار اتنی آسانی سے مل جاتے تو میں اس انداز میں کبھی آپ کی قدر بھی نہ کر سکتی، میری اکڑ میرا نخوت میرا تکبر مجھ سے لازماً آپ کی ناقدری کراتا، جو یقیناً خدا کو منظور نہیں تھی، مجھے آج کوئی شکوہ کوئی ملال نہیں ہے، کہ آپ اتنی تاخیر سے کیوں ملے ہیں مجھے، حالات کے سمندر میں زندگی کے ہر خوبصورت احساس اور سکون سے لبریز جو اک جزیرہ تھا، وہ آپ تھے اور مجھے لامتناہی سفر کی طوالت کے بعد ہی آپ تلک رسائی حاصل ہو چکی تھی، آپ آخری جزیرہ جو تھے۔)

اس کے ہونٹوں کی تراش میں مسکان اترنے لگی تھی، جسے جہان نے دیکھا تو بے اختیار ریلیکس ہونے لگا، پھر اس کے آنسوؤں کو صاف کر کے اس کا سائیڈ پہ پڑا اٹھا کر اسے اوڑھایا اور ہاں پکڑ کر باہر لے آیا، فوٹو سیشن کے دوران جب وہ دونوں رسم کو اکٹھی آئیں تو جہان بھی ساتھ تھا، اس کے دونوں شانوں کے ساتھ ہنستی مسکراتی، لڑکیوں کے چہرے تھے اور جہان کے چہرے پہ اطمینان کے خوشی کے سارے رنگ، کیمرے کی آنکھ نے یہ دلکش منظر بہت خوبی سے محفوظ کرلیا تھا۔

☆☆☆

اس کڑی دھوپ میں جلتے ہوئے پاؤں کی طرح
تو کسی اور کے آنگن میں ہے چھاؤں کی طرح
تو تو واقف ہے میرے جذبوں کی سچائی سے
پھر کیوں خاموش ہے پتھر کے خداؤں کی طرح
میں تو خوشبو کی طرح ساتھ رہا ہوں تیرے
تو بھٹکتا رہا ہے بے چین ہواؤں کی طرح
وہ جو برباد ہوئے تھے وہی بدنام ہوتے ہیں
تم تو معصوم رہے اپنی اداؤں کی طرح
غم تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی خوشی راس نہیں
زندگی کاٹ رہے ہیں ہم سزاؤں کی طرح

وہ بے کل سی تھی، مضطرب اور وحشت زدہ...... کتنے دن بیت گئے تھے اس ایک واقعہ کو، جب زندگی میں پہلی بار ژالے اس کے پاس آئی تھی۔

ڈالے...... اس کی اولاد، اس کی کل کائنات، جسے جنم دینے کے بعد وہ محض چند مرتبہ چھو سکی تھی، پیار کر سکی تھی، کہ اس سے اسے چھین لیا گیا، ماما پہ ایستادہ آ کہ پڑا تھا کہ وہ جینا بھولنے لگی، ایسی وحشت ایسی تڑپ جاگی تھی اندر کہ آنکھوں سے بہتے آنسوؤں پہ بارش کا گمان ہوا کرتا، پھر حالات بد سے بدتر ہوتے گئے، واقعات کی ستم ظریفی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، کیا سے کیا کر دیا اسے، وہ سرتاپا بدل گئی۔

نہیں بدلی، نہیں مٹی، تو ڈالے کے قرب کی خواہش نہیں بجھا تو اس کی محبت میں فروزاں دل میں دیا، اس ناگن جیسی فسادی عورت نے کیسا بغض اور قہر بھر دیا تھا، اس کے خلاف ڈالے کے دل میں کہ اپنی صفائی میں کی گئی ہر کوشش میں ناکامی اس کا نصیب بنتی گئی، مگر اس دن وہ کتنی حیران رہ گئی تھی، پھر اس حیرانی پہ خوشی غالب آنے لگی، وہ خوش تھی۔

ڈالے کو روبرو پا کے، اپنے لئے مہربان محسوس کر کے، وہ پرانی ساری جاں کاہی اور کلفتیں بھول گئی تھی، مگر ڈالے کا مطالبہ حیران کن تھا، دیکھا جاتا تو ڈالے نے اس سے زندگی، زندگی کی امید سب کچھ ہی تو مانگ لیا تھا، معاذ کو مانگ کر، مگر وہ انکار کا حوصلہ کہاں سے لاتی، وہ ایسا کر کے ماما کو مشکوک کیسے کر سکتی تھی، معلوب کیسے کر دیتی، اس نے معاذ حسن کو چھوڑا، گویا خود کو دان کر دیا، اس کے بعد زندگی اور زندگی کی ہر خوشی کا جواز از خود ختم ہو جاتا تھا، گناہ کی زندگی سے تائب ہو کر وہ پھر سے عزت کی زندگی کی متمنی تھی، مگر شاید یہ اس کے نصیب میں لکھا ہی نہ گیا تھا، کتنے دن تو وہ مایوسی والم کی کیفیت میں یہی سوچتی رہی تھی، اسے اب کیا کرنا چاہیے، وہ تو خالی ہاتھ بالکل خالی رہ گئی تھی جیسے۔

بہت دنوں بعد اس نے خود کو جوڑا تھا، سمیٹا تھا اور خود کو پھر سے زندگی میں مصروف کر لینا چاہا، تب اس پہ انکشاف ہوا گناہ کے آلودہ راستوں پہ مزید چلنے کی اس میں تاب نہیں، فگار پاؤں زخمی دل کے ساتھ، وہ بھلا کب تک خود کو گھسیٹے جاتی، پھر اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟ شاید اسے خدا سے معافی مانگنی چاہیے، خدا مہربان ہے اور اپنے بندوں کی توبہ کا منتظر تھی۔

''کیا وہ میرا بھی منتظر ہو گا؟'' اس نے سوچا، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، خوف جھجک اور گریز کے عالم میں اس نے جب رب کی جانب رجوع کیا، تو دل آنسوؤں کے بوجھ سے جھکا جاتا تھا، تاسف بھی تھا ملال بھی، مگر مایوسی نہیں تھی، مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ اتنا تو جانتی تھی کہ اس کا رب توبہ کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

تب اس نے جانا تھا، بلاشبہ اللہ کی یاد میں ہی دلوں کا سکون پوشیدہ ہے، کیسا اطمینان اتر آیا تھا اللہ سے معافی مانگ لینے کے بعد اس کے اندر بھی، اس کے بعد ہر دن اور رات کا انداز تبدیل ہو گیا تھا، وہ ضرورتاً ہی گھر سے نکلتی وہ بھی بڑی چادر میں خود کو مقلوب کر کے، وہ بدل گئی تھی، مگر لوگ بہر حال نہیں بدلے تھے، اللہ جتنی جلدی معاف کر دیا کرتا ہے، بندے اس معاملے میں اتنے ہی کینہ پرور ثابت ہوتے ہیں، وہ قدم قدم پہ ہرٹ ہوتی تھی، اس کا ایک حل حجاب بھی تھا، اس نے حجاب لینا شروع کر دیا تھا، اب اسے پہچان لینا ہرگز آسان نہیں تھا، زندگی آسان ہو گئی تھی، مگر ابھی کچھ جھٹکے اس کے نصیب میں باقی تھے جبھی وہ آخری انکشاف بھی اس پہ ہو گیا تھا، جو شاید نہ ہوتا تو

اچھا ہوتا۔

سودہ سلف کا تھیلا ہاتھ میں سنبھالے وہ سڑک کراس کرنے کی منتظر تھی جب اس کی اٹھی ہوئی نگاہ ساکن ہو کر رہ گئی تھی، گاڑی کے کھلے شیشے کے پار شاید نہیں یقیناً وہ صبح نوخیز جیسی لڑکی ژالے تھی، جو اپنے مقابل بیٹھے خوبرو نوجوان کو دیکھ کر ہنس رہی تھی، اس کے گال میں پڑنے والا ڈمپل بلماتے اتنے فاصلے کے باوجود بھی نثار ہوتی نظروں سے دیکھتی تھی، کتنے دنوں سے ژالے کو پھر سے دیکھنے کی خواہش دل میں ہمک رہی تھی، جو یوں پوری ہوئی تو دل خوشی سے معمور ہونے لگا تھا، گاڑی سگنل ریڈ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی تھی، وہ دونوں پھول بیچنے والے چھوٹے لڑکے سے پھول خرید رہے تھے، ژالے کی کلائی میں جھک کر گجرہ پہناتا ہوا نوجوان اس کا داماد ہی ہو سکتا تھا، ژالے جیسی ریزروڈ لڑکی کسی اور کو ایسی جرأت نہیں بخش سکتی تھی، اس کے اندر اچانک بیٹی کے ساتھ ساتھ داماد کو بھی دیکھنے کی خواہش نے جنم لیا، اسی خواہش کے پیش نظر اس نے خود کو ذرا سا آگے جھکا دیا، ایسے کہ نوجوان کا چہرہ اس کی نظروں کی گرفت میں آ سکے، یہی لمحہ قیامت خیز تھا، آنکھ نے ذہن کو پہچان کا مرحلہ طے کروایا تھا اور ذہن اس حقیقت کی کربنا کی سفاکی اور تلخی کو نہ قبولتے ہوئے شاک میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔

وہ نوجوان کوئی اور نہیں، جہانگیر شاہ تھا، وہی جہانگیر شاہ جسے...... اس کے آگے اس کی سوچ نے اس پہ ملامت کرنی نفرین بھیجنی شروع کی تھی، اسے یاد آیا، ژالے نے معاذ سے اپنا رشتہ ظاہر نہیں کیا تھا، اسے سمجھ آئی اگر ژالے نے ایسا نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ کیا تھی، وہ اپنی ماں کو اسی شرمندگی سے بچانے کی متمنی تھی، مگر وہ اسی شرمندگی سے بالآخر دوچار کر دی گئی تھی، کسی نے اسے آسمان سے زمین پہ دے مارا تھا، اب وہ زمین میں دھنستی جا رہی تھی، اس کی آنکھوں میں ہر لمحے اندھیرے چھاتے گئے، شرمندگی، سبکی، خجالت، ندامت کا انت نہیں تھا، وہ اس پل خود سے بھی نگاہیں ملانے کی تاب نہیں رکھتی تھی، جہانگیر کو وہ کس نگاہ سے دیکھتی رہی تھی، اس کی عمر کے فرق کو بھلا کر، اس مرد کو جو صرف عمر میں ہی اس سے کم نہیں تھا، جس سے اس کی بیٹی بیاہی جا چکی تھی، یعنی ذلت کا ایک نہ ختم ہونے والا باب، شرمندگی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ، وہ نہ روئی، نہ تڑپی، بس اپنے اندر اتر آنے والی بے انت وحشت اور شرمندگی سمیت پتھرا سی گئی۔

☆☆☆

چن کھنا چن کھنا تینوں سانبھ سانبھ کے رکھنا
اساں وسنا اساں وسنا اساں دل دے نیڑے وسنا
تینوں دل چے وساواں تیرے ناویں دل لاواں
کسے دوجے ول نئیں تکنا چن کھنا چن کھنا
تینوں سانبھ سانبھ کے رکھنا
اساں وسنا اساں وسنا اساں دل دے نیڑے وسنا

ڈھولک پہ پڑتی تھاپ پہ سب سے بلند آواز پرنیاں کی تھی، اندر آتے معاذ نے نظم کر گانے کے بولوں پہ غور کیا تھا پھر پرنیاں کی شکل پہ، آنکھوں میں حیرانی تھی، چہرے پہ خوش گوار تاثر، دیکھنے

کا انداز پزل کر دینے کو کافی ثابت ہو سکتا تھا، مگر وہ پزل نہیں ہوئی اور بڑے اعتماد سے گردن اکڑا لی۔

"جناب! یہ تو ہمیشہ سے ہمارا کام ہے، یعنی حال دل کہنے کا، آپ جناب پہ یہ نازک وقت کیسے آ گیا؟" معاذ سب کے درمیان گھس کر پرنیاں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر بیٹھ گیا، ہونٹوں پہ شریر مسکان تھی، لہجے میں خمار آلود بھاری پن۔

"بھابھی لوگوں کو غلط فہمیوں کا شکار ہونے سے بچانا چاہیے، ہم صرف گانا گا رہے ہیں۔" پرنیاں کو بھی جواباً شرارت سوجھ گئی تھی، جبھی اس کے بجائے بھابھی کو سنایا تھا، معاذ سرد آہ بھر کے رہ گیا یعنی کہ۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

وہ جہان کو دیکھ کر گویا احتجاج بلند کرنے لگا، جہان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر خواتین کے بیچ سے اٹھانا چاہا تھا مگر وہ معاذ ہی کیا جو اپنی نہ منوائے اور کسی اور کے ہو لینے دے، بجائے اس کے خود اٹھتا جہان کے اسی ہاتھ پہ دباؤ بڑھا کر جھٹک دیتے ہوئے اسے بھی اپنے پہلو میں گھسیٹ لیا، جہان کہاں ایسی حرکت کے لئے تیار تھا، بامشکل گرتے بچا، وہ بھی زینب نے اسے سہارا دیا تھا۔

"بہت بدتمیز ہو معاذ۔" وہ دانت کچکچانے لگا۔

"اچھا زیادہ شوخیاں نہ مار، اپنی دونوں بیویوں کے بغیر تو تو بھی کملایا ہوا پھر رہا تھا، میں نے تو کورم پورا کیا ہے۔" معاذ نے الٹا اس پہ چڑھائی کر دی، زینب کھلکھلانے لگی تھی، گویا معاذ کی تصدیق مہر ثبت کی، ژالے البتہ محض مسکرا دی تھی۔

باری برسی کھٹن گیا تے کھٹ کے لے آندی لاچی
آ گیا ٹر کے پینڈوں ہائے ہائے آ گیا ٹر کے پینڈوں
میں تاں رہندی شہر کراچی

جہان کچھ کہنے والا تھا مگر بھابھی نے گانے کی تان اڑانی شروع کر دی تھی، وہ اٹھنے لگا مگر ژالے نے اس کے بازو پہ نرمی سے ہاتھ رکھ دیا تھا، جہان نے چونک کر دیکھا، وہ مسکراتی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"بیٹھ جائیں شاہ! اچھا لگ رہا ہے۔" اس کی آواز سرگوشی سے مشابہہ تھی، جہان بے اختیار مسکرا دیا تھا، بھابھی کے گانے پہ جنید بھائی تو پھڑک اٹھے تھے، اس پہ لڑکیوں کی تالیوں کی صورت ہونے والی ہوٹنگ جبھی انہوں نے اپنی پاٹ دار آواز میں سہی مگر جواب دینا ضروری سمجھا۔

باری برسی کھٹن گیا تے کھٹ کے لے آندے تارے
ساڈھے پینڈ آ کڑیے تینوں پل جان شہر نظارے

اپنی کارکردگی پہ وہ خود ہی اتنے خوش ہوتے تھے کہ خود کو داد دینے کے خیال سے جوش میں اٹھ کر ناچنے لگے، معاذ نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے بڑی مشکلوں سے انہیں کھینچ تان کر واپس بٹھایا۔

''آپ نے تو حد ہی کر دی، ہمیں ہرگز اندازہ نہیں تھا، آپ کے اندر ایسا بھڑکیلا فنکار چھپا بیٹھا ہوگا۔'' وہ سراسر ان کا مذاق اڑا رہا تھا، جنید بھائی قدرے کھسیا کر رہ گئے۔

دل میرا تیرا اے دیوانہ سوہنیا
تجھی نہ میتوں بیگانہ سوہنیا
پیار تینوں کرنی آں تیرے اوتے مرنی آں
تینوں دل چے وسانا تیرے ناویں دل لانا
کسے دوجے دل نئیں تکنا
چن کھنا چن کھنا تینوں سانبھ سانبھ کے رکھنا

آج حیران کن دن تھا، وہ لوگ بھی وہ کام کر رہے تھے، جنہوں نے زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا، ژالے کو بھی انہوں نے پہلی بار گاتے سنا تھا، اس کی آواز سریلی تھی اور لے تال بھرپور، سب حیران رہ گئے تھے، جبکہ وہ مگن تھی، مست تھی، اس کی آنکھوں میں پرنیاں کی طرح شرارت نہیں تھی، جذبوں کی صداقت اور لپک تھی، البتہ اس نے اس پل محض حیا بار انداز میں گریزاں جہان کو نہیں دیکھا تھا، اس کے چہرے پہ موجود شرگیں مسکان اس کے چہرے کو مزید حسین بنا رہی تھی، معاذ نے خوشگوار حیرت کے ساتھ پہلے ژالے کو پھر جہان کو دیکھا تھا۔

''تم باکمال ساحر ہو میری جان! ایسا بھرپور اور خوب صورت اعتراف ہماری کنجوس بیوی سے تو ہمارے حصے میں نہیں آیا، اگر دل نے مجبور بھی کیا اسے تو کر کے مکر گئی، اللہ ہی پوچھے گا ایسے لوگوں سے۔'' اس نے صاف صاف پرنیاں کو ہی سنایا تھا، جو سن کر بھی ان سنی کر گئی تھی، معاذ ٹھنڈی آہیں بھرتے پھر جہان کی سمت متوجہ ہو گیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیلا۔

''جا میرا پتر! اب تجھ پہ بھی گانا ضروری ہو گیا ہے۔''

جہان خود بھی کم حیران نہیں تھا، لبوں کی تراش میں شرارت آمیز مسکان تھی، اس نے روشن آنکھوں سمیت ژالے کے حجاب آلود چہرے کو دیکھتے اس کا نازک سا ہاتھ نرمی سے تھام کر آہستگی سے ہونٹوں سے چھوا۔

''تھینکس فار دس آفر، میلی پیالی پیالی شی بیوی۔'' وہ ایک دم کھل اٹھا تھا، ژالے بری طرح شرما گئی، جہان سے بھلا سب کے بیچ اسے ایسی کہاں کوئی توقع تھی، جہان کی نظریں اسے سر تا پا رنگوں کی برسات میں نہلا رہی تھیں، وہ محجوب سی پلکیں جھکائے بیٹھی رہی۔

ہاری بری کٹھن گیا تے کھٹ بے لے آندا پڑا
میرے جیسی ڈھونڈ کے لا میں تو لگدی مونا لیزا

بھابھی نوریہ اور ماریہ وغیرہ کے اکسانے پہ زینب کو بھی گانا پڑا تھا، وہ گاتے ہوئے ترچھی نظروں سے جہان کو ہی دیکھ رہی تھی، سب کی پرجوش زوردار تالیوں نے گویا اسے مزید جوش دلانا چاہا، جبکہ زینب کی نظریں ہنوز جہان پہ تھیں، وہ یقیناً اس کی جانب سے ہی جواب کی منتظر تھی، وہ جانتی تھی یہ گانا جہان کو بھی آتا ہے، پچھلے دنوں یہ گانا اتنے تسلسل سے فل والیوم میں سنا گیا تھا کہ ہر کسی کی زبان پہ آ گیا تھا، اب جبکہ خوشی کا موقع تھا اور سب مستی میں تھے تو باقاعدہ ایک ماحول خود

بخودترتیب پاتا جارہا تھا، جہان بھی خاموش نہیں رہ سکا۔

بازی بری کٹھن گیا تے کھٹ کے لے آندی تیلی
میں مالک لکھاں دا میں مالک لکھاں دا
تینو پا دوں گا نیوی حویلی

جہان گاتے گاتے خود ہی زور سے ہنس دیا، اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا تھا، جس پہ زینب نے بھی ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ مار دیا تھا، البتہ اس کی آنکھوں میں ایک تفاخرانہ احساس تھا، وہ خوش تھی، اس نے بالآخر محبت کو جیت لیا تھا، معاذ جو خاموشی سے یہ سب ملاحظہ کر رہا تھا، شاکی نظروں سے پرنیاں کو دیکھنے لگا۔

''یہ زیادتی ہے یار بیوی! صرف ہم ہی رہ گئے ہیں، وہ بھی تمہاری اکڑ یا پھر نااہلی کی وجہ سے۔'' وہ منہ لٹکا کر بسورا، پرنیاں کی ہنسی چھوٹ گئی تھی، وہ کچھ دیر اسے یونہی دیکھتی رہی پھر آہستگی سے گنگنانے لگی تھی۔

اکھیاں چے وسائی اے تیری تصویر
میں تیری بن گئی آں تیرے اوتے مرگئی آں
تینوں دل چے وسانا تیرے ناویں دل لانا
کے دوجے دل نہیں تکنا جن تکنا جن تکنا
تینوں سانبھ سانبھ کے رکھنا اساں وسنا
اساں وسنا اساں دل دے نیڑے وسنا

''اور اب یہ محض گانا نہیں تھا، یہ واقعی حقیقت ہے۔'' اس نے گنگناہٹ کا سلسلہ روک کر معاذ کی جانب جھکتے سرگوشی کی، معاذ تو اپنی جگہ پہ اچھل پڑا تھا۔

''یعنی تم اعتراف کر رہی ہو میری محبت کا......؟'' وہ ہنوز غیر یقین تھا، پرنیاں جھینپ کر سرخ پڑنے لگی، البتہ جھکی پلکوں کے ساتھ سر کو اثبات میں ضرور ہلا دیا۔

''اتنی خوبصورت بات...... اور اتنے غلط موقع پہ؟'' معاذ نے منہ لٹکایا پرنیاں ٹھٹھک کر رہ گئی۔

''کیا مطلب؟'' اس کی حیرانی بجا تھی۔

''مطلب یہ ہے میری جان عرف دھان پان! کہ یہ بات تم مجھے تنہائی میں بتاتیں، یعنی بیڈ روم میں، اب اتنے لوگوں کی موجودگی میں، میں جواباً محبت کا ثبوت پیش کروں گا تو تمہیں آکورڈ لگے گا۔'' اس کے لہجے میں آنکھوں میں شرارت کا عکس تھا، چہرے پہ سرشاری کی کیفیت، پرنیاں نے جھینپتے ہوئے اس کے کاندھے پہ زوردار گھونسا دے مارا۔

''بہت بدتمیز ہیں آپ، اسی لئے کبھی کچھ نہیں کہتی میں۔'' اس کا چہرہ کچھ غصے کچھ شرم سے سرخ ہوا تھا، معاذ کی آنکھوں سے ہنوز بلا کی شرارت ٹپک رہی تھی، ہنستے ہوئے اس کا برا حال ہو رہا تھا، مگر اس کی جان پھر بھی نہیں چھوڑی۔

''یعنی یہ خوب صورت حادثہ ماضی بعید کا قصہ ہے۔'' اس نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں

پھیلائیں۔

''محبت کے جواب میں محبت ہو جانا کوئی اتنی عجیب بات تو نہیں ہے محترم!'' پرنیاں نے بھی اسے چھیڑنا تنگ کرنا خود پہ لازم کر لیا تھا، معاذ کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔

''حد ہے، یعنی محترمہ ترس کھا رہی ہیں مجھ پہ۔'' پرنیاں نے ہنستے ہوئے اب کے جواب دیئے بنا اسے پیچھے دھکیل دیا تھا، تب ہی زیاد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑے اسٹائلش میں بولا تھا۔

''ناظرین و حاضرین! میری شادی بہت باکمال ثابت ہوئی ہے، وہ لوگ بھی یہاں اظہار و اقرار کر گئے، جو کبھی اس کا تصور بھی نہیں رکھتے تھے، اب میں اپنا آئٹم پیش کرنا چاہتا ہوں، اپنی بیوی نوریہ زیاد کے ساتھ، پلیز ویلکم کیجئے۔'' اس کے مسخرے پن کے جواب میں ہر طرف سے تالیاں بجنے لگیں، حسان تو سیٹیاں بھی بجا رہا تھا، زیاد نے سرِ تسلیم خم کیا اور بہت اسٹائل سے جھک کر نوریہ کو دیکھا۔

باری برسی کھٹن گیا تے کھٹ کے لے آندے لوٹے
میں ڈولی تیری لے جانی پاویں چل جان ڈانگاں سوٹے

ایک اجتماعی قہقہہ بلند ہوا تھا، جس سے چھت اڑنے کا احتمال ہونے لگا، زیاد نے یونہی بھنگڑا ڈالتے ہوئے آگے بڑھ کر نوریہ کا ہاتھ تھام لیا اور اسے پنڈال میں لے آیا، اس نے دیکھا، سب کے ساتھ معاذ بھی اس کی جانب متوجہ تھا، پرنیاں کے ساتھ صوفے پہ ترچھے زاویے سے تقریباً نیم دراز، اس کا سر گویا پرنیاں کے شانوں پہ دھرا ہوا تھا اور سینے پہ گل کوتنا سا عدن پھدکتا پھرتا تھا، اس کی فیملی، اس کی زندگی مکمل تھی بھرپور تھی، نوریہ کی آنکھیں دھندلانے لگیں، اس نے نگاہ کا زاویہ بدل لیا اور اپنا ہاتھ زیاد کے کاندھے پہ رکھ دیا، یوں کہ رخ بدل کر اس کے ساتھ ساتھ جھومنے لگی، گانے لگی۔

باری برسی کھٹن گیا تے کھٹ کے لے آندا بولا
تیرے نال میں جاواں، تیرے نال میں جاواں
تو آ جا بن کے دولہا ....

تالیوں کی گونج بڑھ گئی، اب وہ سب مل کر گا رہے تھے، مگر نوریہ صرف معاذ کو دیکھ رہی تھی، وہ جان سکتی تھی، وہ آج کے بعد اس نظر سے کبھی دوبارہ معاذ کو نہیں دیکھے گی، اسے یقین تھا، خود پہ نہیں اپنے رب پہ اور جو رب پہ یقین قائم کریں، ان کے بھروسے قائم رہا کرتے ہیں۔

☆☆☆

تیرے چہرے پہ نظر تھی نہیں کیا ہم کریں
ہم تو دیوانے ہو گئے ہیں صنم کیا ہم کریں
تیرے چہرے سے نظر تھی نہیں کیا ہم کریں

یہ زیاد کی شادی کی رات تھی، نوریہ رخصت ہو کر گھر آ چکی تھی، رسومات کی ادائیگی کے بعد جب زیاد نے خود معاذ سے گانے کی فرمائش کی تو اس بیچارے پہ گرفت کرتے ہوئے سب نے اس

پہ شوخ فقروں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔
"بڑے صابر بن رہے ہو چھوٹے! کہاں تو شادی کو اتنے اتاؤلے ہوئے جاتے تھے اور اب شب کے قیمتی لمحے یوں ضائع بھی کرنے پہ تل گئے ہو۔" جنید بھائی کے کہنے پہ زیادتی سے سرخ پڑتا سخت جز بز ہونے لگا۔
"میں چھچھورا کبھی بھی نہیں رہا، سمجھے آپ؟" وہ چمک کر بولا تھا، ناک چڑھا کر جتلایا اور جنید بھائی کو آنکھیں دکھائیں، مگر انہوں نے اس پہ اثر نہ ہوتا دیکھ کر تو پوں کا رخ معاذ کی جانب موڑ دیا تھا۔
"ڈاکٹر صاحب یہ چھوٹا دوسرے لفظوں میں تمہیں چھچھورا ثابت کر چکا ہے۔" جہاں معاذ کا پارہ ہائی ہونا شروع ہوا وہاں محفل میں دبی دبی ہنسی بھی پھیلی تھی۔
"رومینٹک اور چھچھورا ہونے میں بہت واضح فرق ہے، میں سمجھتا ہوں، بالکل ویسے جیسے مجھ میں اور آپ میں فرق ہے، یعنی میں رومینس کرتا ہوں اور آپ چھچھورے پن کا مظاہرہ، شادی کے شروع دنوں میں ہمیں یاد ہے، ہماری ٹین ایج کا بھی خیال کیے بغیر آپ ہر وقت بھابھی کے گھٹنے سے لگے بیٹھے رہتے تھے، اب بھی جہاں رومینس کا موقع ملا اور خوب صورت لڑکی بھی، آپ کا ٹھرک فوراً باہر آ جاتا ہے، ابھی بتاؤں بھابھی کو کہ آج بارات کے وقت ہوٹل میں سبز کپڑوں والی پہ آپ کیسے لائنیں مار رہے تھے؟"
معاذ کی رپورٹنگ پوری ہوئی تھی، جنید بھائی کو تو لینے کے دینے پڑ گئے، وہ جتنا بھی گڑبڑائے تھے مگر معاذ کا منہ بند کرنے کو لپک کر اس کی جانب آئے اور باقاعدہ چاپلوسی پہ اترنے لگے، غرض ایسی ہی باتوں اور جھگڑوں کا اختتام معاذ کے گانے پہ ہوا تھا، اس کی آواز آج بھی اتنی ہی حسین تھی، سحر انگیز اور دلنشین، ماحول اور دلوں پہ جادو طاری کر دینے والی، مگر نور یہ آج اس جادو کے اثر سے محفوظ اور مامون رہی تھی۔

تیری آنکھوں کو دیکھ کر دلبر کتنے نغمے لکھے ہیں چاہت کے
اپنے نازک لبوں سے کہہ دو نا تم ہی الفاظ دو محبت کے
دل کی یہ پیاس کبھی بجھتی نہیں کیا ہم کریں
ہم تو دیوانے ہو گئے ہیں صنم کیا ہم کریں
تیرے چہرے سے نظر ہٹتی نہیں کیا ہم کریں

پرنیاں ہاتھ میں فیڈر پکڑے اپنی لانگ فراک سے الجھتی عدن کو مما سے لینے وہاں آئی تھی، معاذ نے اسے آگے نہیں جانے دیا اور ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے برابر بٹھالیا، وہ ذرا سا جھنجھلائی تھی۔
"چھوڑیں نا، عدن کب سے مما کے پاس ہے، تنگ کر رہا ہوگا انہیں۔" وہ صاف کترا رہی تھی، اس کی آنکھوں کے امنڈتے جذبے اسے خائف کرنے کو کافی تھے۔
"میں بھی کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں، احساس ہے تمہیں؟ کتنا اکیلا کتنا بے چین ہو سکتا ہوں؟" اس کے سرگوشیانہ لہجے کے بھاری پن اور معنویت پر پرنیاں کی پلکیں لرز اٹھیں، رنگت میں گلابیاں گھل گئیں۔

"شرم کریں کچھ تو، مما بھی یہیں پہ ہیں۔" حجاب آمیز کوفت میں جتلا وہ سخت جز بز ہوتی اسے پرے دھکیلتی خفگی ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کا گانا ادھورا ہے ابھی۔" جنید بھائی جواثیبی کی طرف متوجہ تھے، خاصے جتلانے والے انداز میں تان لگا کر بولے، محفل میں دبی دبی ہنسی پھیل گئی۔

"انہیں کیا خبر، ہمارا تو رومانس بھی ادھورا ہے ابھی۔" وہ پرنیاں پہ جھک کر آنچ دیتے لہجے میں بولا، محبت بھرے شاکی انداز کے بھاری پن میں کچھ ایسا تھا کہ پرنیاں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں، چہرہ ایکدم بھاپ چھوڑنے لگا۔

وہ بن پیئے بہک رہا تھا، اس کے دھیمے لہجے کی گمبھیرتا پرنیاں کے اوسان خطا کرنے لگی، اس کی ذومعنی نظروں کے جواب میں جز بز ہوتی وہ بے حد خفا خفا سی اٹھ کر وہاں سے مما کے پاس چلی گئی، معاذ کا زوردار قہقہہ اس کے پیچھے آیا تھا۔

☆☆☆

"زینب.....!" جہان نے تنگ آ کر دروازہ دھڑ دھڑا دیا تھا۔

"آخر تم اتنی دیر کیوں لگاتی ہو تیار ہونے میں؟ ہر روز تمہیں نکالنے کو مجھے خود آنا پڑتا ہے۔" وہ جھلا کر بول رہا تھا، جب ایک دم سے دروازہ کھلا اور زینب سیاہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی باہر آ گئی۔

"آ بھی جائیں گے تو کیا حرج ہے اس میں صاحب، مجھے تو اچھا ہی لگتا ہے۔" وہ اس کی ٹائی پکڑ کر ناز سے کھینچتے ہوئے اٹھلائی تھی، جہان تو بس اسے دیکھتا رہ گیا، سیاہ سادہ ساڑھی جس کا بلاؤز فل آستین کا تھا، وہ اتنی نازک اتنی پیاری لگ رہی تھی، گویا لچکتی ہوئی ڈال، لمبے بالوں کو اس نے چوٹی کی شکل دے کر چھوڑ دیا تھا، پرل کے ٹاپس اور گلے میں ایک چھوٹا سا موتی، بس یہ تھی اس کی آرائش مگر اس کی جگمگاہٹ نگاہوں کو خیرہ کرتی جا رہی تھی جیسے۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟" جہان کی بے خود نظریں اس کے چہرے سے لپٹ گئی تھیں، وہ محسوس کرتے ہی جھینپ کر بولی تھی۔

"ابھی میں سوچ رہا تھا کہ تم سے کہوں گا ساڑھی پہنو، میرا دل کر رہا تھا، تمہیں اس لباس میں دیکھنے کو۔" جہان کی پرشوق نگاہوں کا مرکز ہنوز وہی تھا، وہ دھیمے سروں میں ہنس دی۔

"میرا بھی دل کیا تھا، آپ کو ساڑھی پہن کر دکھاؤں، تو بس دکھا دی۔"

"اپنی مرضی سے کیوں نہیں؟ جب میں کہتا تب پہنتی تم۔" وہ نخوت سے کہہ گیا تھا، زینب کا چہرہ یکدم اتر گیا۔

"کیوں؟ آپ کو اچھا نہیں لگا ہے۔" وہ یکدم بجھ کر رہ گئی تھی جیسے۔

"یار یہ لباس تو صرف میرے لئے ہونا چاہیے تھا ناں، اب میرا دل کر رہا ہے تمہارے ساتھ ہوں کہیں بھی نہ جاؤں، جبکہ یہ ممکن تو نہیں ہے ناں، ولیمہ میں شرکت تو لازمی ہے۔" اس کا جذباتی دھیما لہجہ زینب کی دھڑکنوں میں ہلچل مچا کر رکھ گیا، اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا تھا، پھر اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"آپ گاڑی میں جا کر بیٹھیں، آ رہی ہوں میں۔"

"خیریت؟" وہ حیران ہوا۔
"آپ جائیں تو، ژالے کو بلائیں تب تک بس آ رہی ہوں۔" اس نے کچھ مزید سنے بغیر جہان کو باہر دھکیل دیا تھا، محض دس منٹ بعد وہ گاڑی کی جانب آئی تو جہان اسے لباس تبدیل کیے دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔
"کیوں بدل دیئے یار!"
"وہ بس آپ کے لئے ہو، رات کو پہن لوں گی۔" زینب کی پلکیں جھک گئی تھیں وضاحت کرتے جہان آہستگی سے ہنس دیا۔
"یہ فرمانبرداری اور آپ جناب!"
"محبت کا اثر ہے، اگر ژالے ایسا کرسکتی ہے تو مجھ پہ بھی لازم ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بھرپور دفاع کیا، تبھی ژالے آ گئی تھی، زینب کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ دیکھ کر حسب سابق عاجز ہونے لگی۔
"زینی آپی آپ آگے بیٹھے پلیز۔"
وہ زینب کی اس عادت سے مضطرب ہو جاتی تھی، کہ جہاں کہیں بھی انہیں جہان کے ساتھ اکٹھے جانا پڑتا، زینب بھی خود جہان کے برابر نہیں بیٹھا کرتی تھی، اس کے برابر وہ ژالے کو جگہ دیتی تھی، اس وقت بھی اس کے اصرار کے جواب میں اس نے محض اتنا کہا تھا۔
"تم بہت پیاری ہو ژالے اور بہت عظیم حوصلے کی مالک بھی، میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکتی کہ تمہاری ایثار کی عادت نے مجھے دنیا کی سب سے بڑی خوشی سے ہمکنار کیا ہے، سچ کی اصل مالک بھی تم ہو، تمہارا مقام بھی پہلا ہے، یہ جگہ بھی تمہاری ہے، میں تمہاری ہر بات ماننا چاہوں گی، ہر خواہش کا احترام مجھ پہ لازم ہو جاتا ہے، مگر یہ اصرار نہ کیا کرو، ویسے بھی پیاری لڑکی، ساری اچھائیاں سارے احسان خود اپنے لئے تو مخصوص نہ کرو، کچھ تو زینی آپی کے لئے بھی چھوڑ دو، چاہے یہ ادنیٰ سا معمولی سا احسان ہی سہی۔"
سنجیدگی سے بات کرتی وہ آخر میں شرارت پہ اتر آئی تھی، ژالے جو واقعی مزید اصرار کا ارادہ رکھتی تھی اور جہان کی سفارش کا بھی عزم باندھے تھی، بے بس سی ہوتی جہان کے مقابل بیٹھ گئی، جہان کی آنکھوں میں طمانیت تھی اور چہرے پہ آسودگی، واقعی جو کام رب کی خاطر کیے جائیں ان میں رب ہی برکت بھی ڈال دیا کرتا ہے، ان دونوں کی ایسی یگانگت اور محبت کا تو وہ تصور بھی نہیں رکھتا تھا، جو سامنے آ رہی تھی۔
ولیمہ کی تقریب کے دوران جب زینب اور ژالے اک ساتھ کھڑی کچھ بات کر رہی تھیں، جہان کچھ فاصلے پہ کھڑا انہی کو دیکھ رہا تھا، معاذ نے زچ کرنے کے خیال سے اس پہ گرفت کر گیا تھا۔
"وہ دونوں لڑ رہی ہیں اور تم ہنس رہے ہو، شاباش۔" جہان زور سے چونکا پھر اس کے چہرے پہ شرارت کا عکس دیکھ کر اسے گھورا۔
"مجھے پٹیاں پڑھانے کی ضرورت نہیں سمجھے؟"

''ہاں بھئی، پڑھے پڑھاؤں کو کیا پڑھانا۔'' معاذ نے مسکراہٹ ضبط کرتے اس پہ چوٹ کی۔

''اور تم تو بہت سیدھے اور معصوم ہو جیسے۔'' جہان نے چڑ کر جتلایا، معاذ کی ہنسی چھوٹنے لگیں۔

''کوئی شک؟'' اس نے آنکھیں پٹپٹا کر معصومیت کی انتہا کی۔

''میرا منہ نہ کھلواؤ شہزادے، ابھی پریناں کو بلا کر تمہاری شرافت کے سرٹیفکیٹ نہ اکٹھے کر دوں۔'' اس نے جواباً اسے چڑایا اور سلگایا، معاذ بے ساختہ قہقہہ لگانے لگا۔

''یار تمہاری بیویاں تمہیں لفٹ نہیں کرا رہیں تو مجھے کیوں ڈانٹ رہے ہو؟'' جہان اسے کچھ دیر گھورتا رہا پھر خود بھی ہنس دیا تھا۔

''بہت بدتمیز ہو تم۔'' وہ یونہی ہنسی کے دوران بولا، معاذ نے اس پل اس کی روشن جگر جگر چمکتی ہنستی آنکھوں کو بہت دھیان سے اطمینان سے دیکھا تھا۔

''تم واقعی خوش ہو ناں ہے۔'' وہ کتنی بے چینی سے سوال کر رہا تھا، جہان کے متبسم چہرے پہ ایک ٹھہراؤ ایک اطمینان و آسودگی کا گہرا احساس اتر آیا۔

''ہاں، میں بہت خوش ہوں، الحمدللہ، میرے اندر کوئی خلش کوئی کمی نہیں ہے، اللہ نے مجھے ڈالے کے ساتھ ساتھ زینب سے بھی مکمل اطمینان سونپا ہے، میں رب کا بہت شکر گزار ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی مانگا اس سے اس نے اس سے زیادہ اور بہتر عطا فرمایا ہے مجھے۔'' جہان کے لہجے میں آسودگی ہی آسودگی تھی، جسے محسوس کرتے معاذ نے ایکدم اسے گلے لگا لیا تھا۔

''الحمدللہ رب العالمین! میری دعا ہے اللہ تمہیں یونہی شاد و آباد رکھے آمین۔''

''شکران حبیبی، جزاک اللہ۔'' وہ نہال ہوا تھا، پھر کسی خیال کے زیر تحت اسے دیکھنے لگا۔

''اور تم...... تم...... تم خوش ہو ناں۔'' اور معاذ اس سوال پہ کھلکھلا اٹھا تھا۔

''ہم تو کھلی کتاب ہیں جناب! جسے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے، دکھی یا پریشان ہوں تو دنیا میں غدر مچا دیتے ہیں، خوش ہوں تو ہر سو مسکراہٹیں پھیلانے والے، ہماری زوجہ گواہ ہیں اس بات کی، بیشک پوچھ لو۔'' معاذ کی بات سے متفق ہوتے جہان نے سر ہلایا تھا اور اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

☆☆☆

یہ شاہ ہاؤس کا ایک معمول کا مگر پرسکون منظر ہے، ہال کمرا اس وقت تمام نفوس کی موجودگی کے باعث خوش گوار شور سے بوجھل ہے، ابھی کچھ دیر قبل ہی زیاد نے ہنی مون ٹرپ کے دوران خریدے گئے تحائف سے سب کو نوازا ہے، یہ لوگ پورے ایک ہفتے کے بعد لوٹے ہیں، شمالی علاقہ جات جانے سے قبل زیاد نے مروتاً ان لوگوں کو دعوت دی تھی، جس سے کسی نے چھوٹے منہ بھی انکار مناسب نہیں سمجھا، بقول معاذ کے۔

''جے نے شادیاں تو کر لیں، مگر ہنی مون کی ضرورت محسوس نہیں کی، بیچارا حالات میں ہی ایسے میں جکڑا ہوا تھا، اب البتہ دونوں طرف کی فضا سازگار ہے تو حرج نہیں کوئی، جہان تک میری بیچارے کی بات ہے تو شادی جتنی خوشی کی تھی، ہنی مون تک اسی قدر مطلع ابر آلود ہو چکا تھا، پری نے جو سلوک مجھ سے کیا، وہ میں اسی صورت بھول سکتا ہوں اگر ہم اب ہنی مون پہ تمہارے ساتھ چلے

جائیں تو، ہاں جنید بھائی کی بات الگ ہے، وہ اگر نہ بھی جائیں تو فرق نہیں پڑتا، عنقریب ان کے بچوں پہ یہ ٹائم آنے والا ہے، انہیں کچھ لحاظ ضرور کرنا چاہیے۔"
"اور میں بتا رہا ہوں، اگر کوئی میرے بغیر گیا، تو تائیں سلامت نہیں پائے گی، جو مجھے لحاظ سکھلا رہے ہیں، ان کے اور میرے بچوں میں چند سالوں کا ہی فرق ہے۔" معاذ کے لہجے کی شرارت اور شوخی کو محسوس کر لینے کے باوجود بھی جنید بھائی دھمکیوں پہ طعنوں پہ اتر آئے تھے، معاذ کو انہیں چھیڑ کر بڑا مزا آیا کرتا تھا ہمیشہ۔
"ہاں جی..... یہی کوئی دس بارہ سالوں کا، آپ کا ٹیپو بھلا کتنے سال کا ہے؟" وہ پھر انہیں چڑانے سے باز نہیں آیا۔
"افوہ..... جنید بھائی پلیز جھگڑا نہیں کریں، چلے جایئے گا آپ بھی ساتھ۔" جہان نے ہی صلح کی جھنڈی لہرا کر امن کیا تھا، کہ زیاد بول پڑا۔
"دیکھیے، سب اپنے خرچے پہ جائیں گے اور اپنے اپنا ہنی مون سمجھ کر ہی انجوائے کریں گے، ہمیں ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم تو صحیح معنوں میں صلح مار کے ہی پھنس گئے ہیں۔" وہ مصنوعی خفگی سے بڑبڑا رہا تھا، پریناں کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔
"حد ہے بھئی، لوگ اک بیوی کے کیسے کیسے نہیں طوطا چشم ہو گئے، چھوٹے مت بولو، تم سے پہلے سے بیوی والے ہیں ہم، مگر بھی اس طرح اوقات نہیں بھولی۔" معاذ نے جتلایا تھا، زیاد کھسکراہٹ دبائے رہا، ایسی ہی نوک جھونک ان کی سفر کے دوران اور وہاں کے خوبصورت نظاروں میں بھی چلتی رہی تھی۔
"تم گھوڑے پہ بیٹھو گی زینی!" وہاں ایک خوبصورت مقام پہ جہاں گاڑی پہ سفر ممکن نہیں تھا، جہان نے زینب سے سوال کیا تھا اور اس کے انکار پہ وہ کتنا حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔
"تم بھول گئی ہو، تمہیں رائیڈنگ کا کتنا شوق تھا۔" اور زینب کے چہرے پہ الوہی مسکان بکھر گئی تھی۔
"مجھے کچھ بھی نہیں بھولا ہے جے! مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ ساری اوٹ پٹانگ حرکتیں میں تب صرف آپ کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کو کیا کرتی تھی، اس کے علاوہ اور کوئی خواہش یا جذبہ کارفرما نہیں تھا۔" اور جہان زیاں کے احساس میں گھرتا چلا گیا تھا۔
"میں نے بالکل اچھا نہیں کیا ناں زینی! تمہیں یوں اگنور کر کے، اپنی محبت پہ انا کو فوقیت دے کر۔" وہ یکا یک اداس نظر آنے لگا، زینب نے اس اداسی کو محسوس کر لیا تھا، جبھی اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔
"یہ سب یونہی ہونا طے تھا جے! یاد ہے آپ نے خود ہی کہا تھا۔" وہ کھلکھلائی تھی، مقصد اس کی یاسیت کو ختم کرنا تھا اور جہان اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔
"آؤ..... میں تمہیں گھوڑے پہ بٹھاتا ہوں۔" جہان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"آپ ہم دونوں کو ایک ساتھ نہیں بٹھا سکتے ہیں جے، رہنے دیں۔" زینب کے انداز میں اب شرارت رقم تھی، جہان نے کاندھے جھٹک دیئے۔

''میں تم دونوں کو باری باری بٹھاؤں گا، ڈونٹ یو وری۔''

وہاں کتنی خوبصورت یادیں وابستہ ہو گئی تھیں ان کی، جو لاتعداد تصویروں کی صورت ان کے ہمراہ آئی تھیں، زینب نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ تصویر نکال لی جو جہان کے خیال میں سب سے بہترین تھی، اس نے مسکراتے ہوئے تصویر پہ نگاہ جمائی، یہ برف زاروں کا منظر تھا، اونچے پہاڑ برف کی ادا اوڑھے گم صم کھڑے تھے، درخت سبزہ، ہر شے نے برف کا لباس پہن لیا تھا، اسی برف کے درمیان وہ تھی، گلابی لباس میں بلیک اوور کوٹ میں ملبوس، لمبے بال کھلے چھوڑے سر پہ اونی ٹوپی گلے میں مفلر، اس کی پشت پہ جہان کا دراز بے حد شاندار سراپا تھا، زینب نے اپنا سارا بوجھ اسی پہ ڈال رکھا تھا، جیسے کسی مضبوط سایہ دار درخت سے ٹیک لگائے کھڑی ہو، لبوں کی تراش میں دل فریب اور کسی حد تک شرارتی مسکان تھی، یہ تصویر معاذ نے اس وقت بنائی تھی، جب وہ دونوں دنیا مافیا سے بے خبر بس ایک دوسرے میں مگن تھے، کیمرے کی فلش لائٹ اور مخصوص آواز پہ ہی دونوں نہ صرف چونکے بلکہ خفیف بھی ہو گئے تھے۔

''جاسوس، تم کہاں سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہو؟'' جہان جھینپ گیا تھا، زینب بھی سنبھل کر تیزی سے اس سے فاصلے پہ ہوئی تھی، اس کے دلکش چہرے پہ خفت آمیز احساس مزید اسے خوب صورت بنا کر دکھلانے لگا تھا۔

''قسم لے لو جو میں تمہاری جاسوسی کو نکلا ہوں، میں تو قدرت کے حسن سے فیض یاب ہونا چاہ رہا تھا۔'' وہ سر کھجا رہا تھا، پھر جیسے اپنا کارنامہ اسے دکھلا کر داد پانے کو گویا ہوا۔

''یہ دیکھو، کیا غضب کی پکچر ہے تمہارا ایڈ روم اس شاہکار سے سج جائے گا، ریئلی۔'' وہ مسکرا کر تائیدی نظروں سے اسے دیکھنے لگا، واپس آنے کے بعد معاذ نے ایسے تحفے صرف جہان زینب اور ژالے کو ہی نہیں دیئے تھے، جنید بھائی اور زیاد کو بھی پیش کیے تھے، تب وہ صرف حیران نہیں ہوئے خجل ہوتے چیخنے بھی لگے تھے۔

''یہ تو سراسر دھاندلی ہے، اس کا مطلب آپ ہماری ٹوہ میں ہی لگے رہے تھے۔'' زیاد کو غصے سے زیادہ ہنسی آ رہی تھی۔

''یہ تو مکافات عمل ہے جناب! کبھی وہ وقت بھی تھا جب تم سب میری ٹوہ میں لگے رہتے تھے، میں نے تو بس یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایسا نازک اور رنگین مزاجی کا وقت ہر کسی پہ آتا ہے، جب اپنی جورو کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا اور پھر کوئی اور دیکھے نہ دیکھے معاذ تو دیکھے گا۔'' کالر کھڑا کرتے ہوئے اس نے دانتوں کی نمائش کی تھی اور محظوظ نظروں سے ان کی خفت زدہ چہرے دیکھتا کھلکھلاتا رہا تھا، جبکہ ان سب کی شکلیں دیکھنے والی ہوئی تھیں، زینب ایک ایک لمحے کو انجوائے کرتی رہی تھی، پھر کسی خیال کے تحت اٹھ کر جہان کے کمرے کی جانب آ گئی، دروازے پہ رک کر اس نے دستک دی تھی، جہان کی اجازت پا کر اس نے اندر قدم رکھا، جہان ژالے کے ساتھ بستر پہ نیم دراز تھا، دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے اور ایک ساتھ جہان کے ہاتھ میں موجود ٹیبلٹ پہ جھکے ہوئے شادی اور ہنی مون کی تصویریں دیکھ رہے تھے۔

''میں نے تو تصویر سلیکٹ بھی کر لی، کون سی انلارج کروانی چاہیے، ژالے تم سے ابھی تک

ڈی سائیڈ نہیں ہوا؟" وہ مسکرائی تھی، جہان نے اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔

"آجاؤ زینی! تمہیں دستک کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیے۔"

"کون سی سلیکٹ کی آپ نے زینی آپی! معاذ بھائی والی؟" ژالے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی، زینب نے وہیں کھڑے کھڑے وہی تصویر نکال کر لہرائی، اس کے انداز میں اک فخر کا سا احساس تھا۔

"یہ تو معاذ بھائی کا اعلیٰ ترین شاہکار ہے۔" ژالے نے بے اختیار داد دی، پھر اسے منہ لٹکا کر دیکھا۔

"مجھے ہرگز سمجھ نہیں آ رہی، آپ ذرا ہیلپ تو کریں۔"

"ادھر آ جاؤ، میرے پاس۔" زینب کو ژالے کی سائیڈ پہ بیٹھتے دیکھ کر جہان نے اپنا بازو پھیلایا، زینب نے تھم کر حیرانی سے اسے دیکھا تھا، جہان سنجیدہ تھا مگر آنکھوں میں بہت خوب صورت تبسم تھا، وہ قدرے جھینپ سی گئی۔

"کچھ شرم کریں بے!" وہ گلابی پڑنے لگی تھی جہان کو ہنوز اپنے تقاضے پہ اڑے پا کر، ژالے مچلتی مسکان سمیت دونوں کو دیکھ رہی تھی، خود وہ ابھی تلک یونہی جہان کے پہلو میں اس کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔

"کم آن یار آ جاؤ۔" جہان نے اب کے شریر انداز میں کہتے اسے آنکھ ماری تھی، وہ اور بلش ہوئی تھی، جہان نے ذرا سا جھک کر اسے بازو کے حلقے میں لے کر خود سے نزدیک کر لیا۔

"تم دونوں کو آپس میں یگانگت کا مظاہرہ تو میں اکثر دیکھتا رہتا ہوں، آج اپنے لئے بھی یہ تجربہ کرنا چاہ رہا تھا۔" وہ ہنستا ہوا وضاحت پیش کر رہا تھا، ژالے کی جھینپی ہوئی ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی تھی، زینب کی نگاہ نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں واضح نظر آتے اسے منظر کو دیکھا اور اسے گھورنے لگی۔

"بہت اچھے لگ رہے ہیں، انڈین موویز کے تھرڈ کلاس سے ہیروز کی طرح دونوں سائیڈوں پہ لڑکیاں چپکائے۔" اس نے نخوت سے ناک چڑھائی تھی، جہان کا قہقہہ مزید بلند ہو گیا تھا اس تشبیہ پہ۔

"ہاں بہت اچھا لگ رہا ہوں، اب تو میں مکمل ہی ایسے ہوتا ہوں، اس میں کیا شک ہے بھلا؟" وہ ہشاش بشاش خوش و مطمئن نظر آ رہا تھا، زینب کچھ دیر محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی، پھر مسکرا کر اس کے کاندھے سے سر ٹیک دیا تھا اور ٹیبلٹ کی اسکرین پہ چلتی تصاویر کو دیکھنے لگی، پھر اس نے ایک تصویر انلارج کروانے کے لئے سلیکٹ کی تھی، جس میں جہان ژالے کو ہاتھ پکڑ کر بوٹ میں سوار ہونے میں مدد دے رہا تھا، ڈوبتا سورج اپنا سارا سونا جھیل کے پانیوں اور ژالے کے چہرے کو سونپ چکا تھا، جبھی وہ اتنا سنہرا ہو رہا تھا، یہ بھی بہت خوبصورت تصویر تھی، جو چند دنوں میں جہان کے کمرے کی زینت بنی ماحول کو مزید خوب صورت بنا چکی تھی۔

☆☆☆

ٹھیک ایک ہفتے بعد کی بات تھی، جب جہان آفس آورز میں چہرے پہ مضطربانہ تاثرات کے

ساتھ گھر آیا تھا، پہلا سامنا ہی زینب سے ہوا، اس کے چہرے کا تاثر ہی زینب کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس تک آنے پہ مجبور کر گیا تھا۔
"جے......! سب خیریت ہے ناں؟" جہان کے قدم اس کی آواز پہ تھمے تھے، وہ رکا اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگا اور گویا تھمے کا شکار ہو گیا، جبکہ زینب کی سوالیہ نگاہیں ہنوز اسی پہ جمی ہوئی تھیں۔
"آپ بتا کیوں نہیں دیتے ہیں شاہ! ہم جا کہاں رہے ہیں آخر؟ سب ٹھیک تو ہے ناں، پلیز زیبی آپی آپ بتا دیں ناں مجھے، بہت دل گھبرا رہا ہے میرا۔" گاڑی معاذ ڈرائیو کر رہا تھا، ژالے پچھلی سیٹ پہ زینب اور جہان کے درمیان بیٹھی تھی، ان تینوں کی سنجیدگی اور خاموشی کے آگے خاصی ہراساں نظر آ رہی تھی گویا، جہان نے اک نظر اسے دیکھا ضرور، البتہ کچھ کہنے کا حوصلہ خود میں نہیں کر پایا تھا، زینب اسی خاموشی و فکر مندی سے اس کے سرد ہوتے ہاتھ سہلانے میں مصروف رہی تھی۔
جہان نے ہونٹ بھینچے رکھے، کچھ دیر قبل وہ خود بھی انکشافات کی زد پہ تھا تو ژالے سے مختلف حالت نہیں تھی اس کی بھی، آفس پہنچے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اسے جب اس کے سیل فون پہ معاذ کی کال آنے لگی تھی، جہان جانتا تھا، ورکنگ آورز میں معاذ بنا اہم اور ضروری بات کے کبھی کال نہیں کرتا تھا، جبھی اس نے فائل کا فیتا کھولتے اس کی کال ریسیو کر لی تھی۔
"ہاں بولو معاذ۔" سلام کے بعد اس نے استفسار کیا تھا۔
"جے...... نیلما کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" معاذ کے لہجے میں واضح تاسف تھا، جس نے جہان کو متحیر کر ڈالا تھا۔
"نیلما...... وہ فلم اسٹار...... اسٹیج فنکارہ؟" جہان کے استفسار پہ معاذ نے سرد آہ بھری۔
"ہاں وہی، بہت المناک موت ہوئی ہے بیچاری کی اور وہ صرف یہی اک حوالہ نہیں رکھتی تھیں جے، ژالے بھابھی سے ان کا اک اور بھی بہت قریبی تعلق ہے۔" متاسفانہ انداز میں کہتا وہ اسے اپنے اغواء سے لے کر بعد تک کی بھی ساری روداد سناتا چلا گیا تھا، جہان کے تو سر پہ جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔
"کیا ہوا؟ تم خاموش کیوں ہو گئے جے!۔" اس کی طویل خاموشی نے معاذ کو فکر مند کیا تھا جبھی پکار کر بولا تھا۔
"تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، جبکہ میں نے پوچھا بھی تھا۔" جہان بولا تو اس کے لہجے میں واضح جھنجلاہٹ تھی۔
"ژالے بھابھی ایسا نہیں چاہتی تھیں جے، میں یقیناً اب بھی تمہیں یہ سب نہ بتاتا مگر اب ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا، تم بھابھی کو لے کر جاؤ وہاں، اپنی ماں کا آخری دیدار ان کا حق ہے جے۔" اور جہان کچھ کہنے کی بجائے جانے کس سوچ میں ڈوب گیا تھا، جس سے تشویش و تفکر میں گھرا معاذ مزید پریشان ہو گیا تھا۔
"کیا ہوا؟ تم چپ کیوں ہو گئے، ہو اس طرح سے جے، کہیں تم بھی ٹیپیکل پاکستانی مرد کی طرح......"

''فار گاڈ سیک معاذ! میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں اس خبر کے بعد ژالے کا ری ایکشن کتنا شدید ہو سکتا ہے۔'' جہان مضطرب سا بولا تو معاذ نے ہنکارا ابھرا۔

''آف کورس وہ ڈپریشن کا شکار ہوں گی، مگر تم سنبھال سکتے ہو انہیں۔''

وہ گھر آیا تو زینب کو بھی اس راز میں شریک کرنا پڑا تھا، اسے زینب پر ہر لحاظ سے اعتماد اور بھروسہ تھا، جانتا تھا وہ اس بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دے گی، زینب کے مشورے پہ ہی جہان ژالے کو بنا بتائے اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا، معاذ بھی گاڑی لئے منتظر تھا کہ نیلما کی رہائش گاہ سے وہی واقف تھا۔

''اس دنیا میں ہر جاندار کو موت آنی ہے، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا ایمان پختہ ہے نا اس بات پہ ژالے، ہم سب کو ایک مقررہ وقت پہ اپنے پیدا کرنے والے پروردگار کی جانب لوٹ کر جانا ہے۔'' جہان بہت رسان سے کہہ رہا تھا، وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھاتا ہوا صورت حال سے قریب کر رہا تھا، کچھ اس انداز میں کہ اسے اچانک ذہنی دھچکا نہ سہنا پڑے، ژالے کی آنکھوں میں ہراسگی اور دہشت سی اتر آئی، اس نے خوف زدہ نم آنکھوں سے جہان کو دیکھا، اس کے چہرے پہ سہم اتر رہا تھا۔

''ک...... کیا مطلب؟...... ک...... کون...... کس کی بات...... کر رہے ہیں آپ شاہ!'' اپنے نقصان کو نوعیت کو فوری سمجھنا اس کے لئے ہرگز آسان نہیں تھا کہ دہشت زدگی کا عالم ہی انوکھا تھا، جہان نے اس کے شانے پہ بازو پھیلا کر اسے خود سے نزدیک کیا تب بھی وہ خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپتی رہی۔

''تمہاری ممی......!''

''ممی!'' ژالے نے صدمے سے گنگ ہوتے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔

''نہیں...... ابھی صبح ہی تو میری بات ہوئی ہے ان سے شاہ، وہ بالکل ٹھیک تھیں۔'' وہ بے ساختہ رو دی۔

''میں مسز آفریدی کی بات نہیں کر رہا ہوں ژالے۔'' جہان نے آہستگی سے تردید کرتے نظریں چرائیں۔

''پھر......'' اس کی آنکھوں میں خوف کا غلبہ چھانے لگا، تب ہی گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی، جہان نے سنبھل کر اپنی جانب کا دروازہ کھولا اور ژالے کو سہارا دے کر نیچے اتارا، دوسری جانب سے زینب نے اتر کر ژالے کو پکڑ کر بازو کے حصار میں لے لیا، ژالے خوف سے پھٹی نظروں سے ٹکر ٹکر ہر سو دیکھنے لگی، آنسو اس کی شفاف آنکھوں میں امنڈے چلے آ رہے تھے، سامنے ایک بلند اور خوبصورت عمارت تھی، وہ کیسے نہ پہچانتی، وہ یہاں آ چکی تھی، شب خون مارنے، سب کچھ لوٹنے، برباد کرنے۔

وہاں ایک افراتفری دیکھنے میں آتی تھی، چند قریبی لوگ تھے، جو نیلما کے آخری سفر کی تیاریوں میں خاموشی سے مشغول تھے، میڈیا سے بالخصوص یہ خبر چھپائی گئی تھی، نیلما پچھلے کچھ عرصے سے گمنامی کی زندگی گزار رہی تھی، جس وقت جہان اور زیب ژالے کو سہارا دیئے کمرے میں لائے

ژالے کے جسم پہ غم سکتہ طاری کرتا جا رہا تھا، اس کی رنگت اس انکشاف نے لمحوں میں نچوڑ ڈالی تھی، اسے سب کچھ بھول گیا، یہ تک بھی کہ اگر جہان اس راز سے ناواقف تھا تو پھر اسے یہاں تک کیوں لے آیا تھا، وہ نیلما کے سرہانے کی سمت آ کر یوں گھٹنوں کے بل زمین پہ گری گویا مزید کھڑے رہنے کی تاب باقی نہ رہی ہو، آنسو بے آواز اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے، نیلما کے حوالے سے وہ سارے لمحے نگاہوں میں روشن ہو گئے تھے، جب جب اس سے اس کا سامنا ہوا تھا، وہ والہانہ پن، وہ بے تابی، وہ محبت، وہ بے بسی، نیلما کی آواز تمام تر حسرت زدگی کے ساتھ اس کی سماعتوں میں بین کرنے لگی۔

یہ ہجر کیا ہے وصال کیا ہے
یہ گردشیں ماہ و سال کیا ہے
جملہ رہی سہی مگر تم
کبھی تو پوچھو کہ حال کیا ہے

کیسا کرب بھرا تھا یہ شکوہ، مگر تب وہ پتھر تھی، ایسا پتھر جس پہ نیلما کا ہر خالص جذبہ بھی بے اثر ثابت ہوتا رہا تھا، مگر اب وہی پتھر پگھل رہا تھا، ملال اور زیاں کا دائمی احساس اس کے وجود میں طوفان برپا کر چکا تھا، وہ روتے ہوئے پاگل ہوئے گئی، وہ جو ہمیشہ اس کی طرف دیکھتی تھی، اسے نیلما کی وہ آخری نظریں یاد آتیں، جب اس نے معاذ کی واپسی کا تقاضا کیا تھا، دکھ کی شدت نے اسے منجمد کر کے رکھ دیا تھا، شاید وہ آخری امید بھی چھین لائی تو اس کے پاس جینے کی کوئی خواہش باقی نہیں بچی، ژالے بے بسی لاچاری کی آخری حد پہ جا کر بلک اٹھی، صبر تمام ہوتا جا رہا تھا، ضبط بری طرح سے بکھر چکا تھا، اسے نیلما کا پہلا اور آخری شکوہ یاد آیا، جو جانے دکھ کی کس انتہا کو چھو کر کیا تھا اس نے۔

''کبھی تو غور کرو بچی، میری چاہت و محبت کے جواب میں تمہارا رویہ کس درجہ دل شکن ہوتا ہے، کبھی سوچو بھی تو فیصلہ کرنا، کہ تم اس میں حق بجانب ہو؟'' وہ کتنے لاچار اور بے بس انداز میں کہہ رہی تھی، جبکہ ژالے اس قدر تنفر سے بھر گئی تھی۔

''یہ بات مجھے نہیں تمہیں سوچنی چاہیے، تم غور کرو تم جیسی عورت کیا اسی سلوک کی مستحق نہیں ہے؟'' جواب میں وہ پھنکارنے لگی تھی اور دوسری جانب یکلخت گمبھیر سناٹا پھیل گیا تھا، نیلما کس کرب سے گزری ہو گی وہ کیا جانے، وہ کتنی تاخیر سے کچھ بولنے کے قابل ہو سکی، وہ تو یہ بھی نہیں جان سکی تھی۔

''میں ماں ہوں تمہاری ژالے، اور جب قرآن مجید میں اللہ نے اولاد کو والدین کے سامنے اف تک نہ کرنے کا حکم دیا تو ساتھ یہ شرط نہیں لگائی تھی کہ اگر ماں نیکوکار پرہیزگار ہو گی تو تم اس کی فرمانبردار ہو گے، ماں کے اعمال کا جواب وہ خود سے ہوتا ہے، اولاد کے ذمہ تو حکم کی تعمیل لازم و ملزوم ٹھہری ہے، میں جیسی ہوں...... اور کیوں ہوں، اس پہ تو ہماری بہت تفصیلی بات بھی ہو چکی میں میں یہاں بھی یہ سب واضح کر کے تمہیں جتلا نہیں رہی، نہ طعنہ دے رہی ہوں، میرے پیش نظر تو اپنی نیک سیرت مذہبی بیٹی کی اصلاح مقصود ہے، میں بس یہ نہیں چاہتی کہ تمہارے اعمال میں کوئی

بھی رہ جائے، روز قیامت اس ایک عمل کے لئے تمہیں رب کے سامنے شرمسار ہونا پڑے۔"
وہ ماں تھی، ماں بن کر دکھاتی رہی، ماں جیسا وسیع ظرف ظاہر کرتی رہی اور وہ بیٹی تھی، عام کم ظرف بیٹی، خدا کے حصے کا کام خود اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی زندگی اس کی سزا کا فیصلہ کرنے والی بیٹی، وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی نیلما کے چہرے پہ جھک گئی، جس سے کس نے اسی کی خاطر کپڑا اٹھا دیا تھا۔
"مجھے اعتراف ہے امی، میں بہت بری ہوں، آپ کو سمجھنے سے قاصر رہی، میں کیسے معافی مانگوں آپ سے؟ آپ اس طرح چپ چاپ کیوں چلی گئیں؟" وہ بلکنے لگی تھی، تڑپ رہی تھی، جب زینب معاذ کے پاس سے ہٹ کر اس کے قریب آئی۔
"ژالے کو چپ کروائیں بے پلیز۔" اس کا اپنا چہرہ بھی غم و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا، ژالے کا دکھ وہ اپنے سینے میں شگاف ڈالتا محسوس کر رہی تھی۔
"اب ہمیں یہاں سے چلنا ہوگا بے، میڈیا کو خبر ہو چکی ہے تمام تر احتیاط کے باوجود، اب یہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں۔" جس پل جہان روتی بلکتی ژالے کو زبردستی تھام کر لایا، سنجیدہ سا معاذ بھی نزدیک آ گیا تھا، جہان نے محض سر ہلا دیا، زینب نے سرعت سے بڑھ کر جہان کے دوسری جانب آتے ژالے کو سہارا دیا، وہ چل کہیں رہی تھی، گویا گھسیٹ رہی تھی اور بار بار مڑ کر حسرت بھری نگاہوں سے نیلما کا چہرہ دیکھتی تھی، آنسو بارش وار برستے تھے۔

لاؤں گا اب کہاں سے جدائی کا حوصلہ
کیوں اس قدر قریب میرے آ گئے تھے تم

معاً وہ روتے ہوئے یکدم دوہری ہوتی بری طرح چیخی، زینب اور جہان کے سنبھالنے کے باوجود بانہوں میں بکھرتی چلی گئی، اس کی چیخیں تدریج کربناک ہو رہی تھیں اور رنگت ہر لمحہ زرد پڑنے لگی، جہان اور زینب اسے سنبھالتے شدید ترین گھبراہٹ کا شکار ہونے لگے۔
"ژالے...... کیا ہو رہا ہے تمہیں؟" جہان کی حالت دیکھنے والی تھی، ژالے کی بدلتی کیفیت پہ اس کا رنگ اڑ چکا تھا، زینب بھی حواس باختہ ہو چکی تھی۔
"ہاسپٹل...... بے تمہیں بھابھی کو فی الفور ہاسپٹل لے کر جانا ہوگا، کوئیک پلیز۔"
معاذ صورت حال کو سمجھ کر ہی افراتفری میں گاڑی کی جانب بھاگا اور پچھلا دروازہ کھول دیا، جہان جو بھربھری ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسلتی ژالے کو بانہوں میں اٹھا چکا تھا، سراسیمہ سا اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ لٹا رہا تھا، زینب اور جہان کے بیٹھتے ہی معاذ نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی تھی۔
"امی چلی گئیں شاہ!" ژالے پھر تڑپی، جہان نے اس کی سرد پڑتی پیشانی چومی۔
"صبر میری جان! اللہ مغفرت فرمائے ان کی۔"
"میں...... میں بھی مر رہی ہوں شاہ!" اس کی آواز گھٹنے لگی، اس پہ غشی طاری ہو رہی تھی جیسے، زینب فق چہرے کے ساتھ اس کے یخ بستہ ہاتھ سہلا رہی تھی، آیات پڑھ پڑھ کر اس پہ دم کر رہی تھی۔

''اسے کیا ہو رہا ہے جے!'' وہ جیسے رو دی تھی۔

''ٹھیک ہو جائے گی انشاء اللہ۔'' جہان خود بولایا ہوا تھا، بھیگتی آواز میں بولا، گاڑی ہوا سے باتیں کرتی ڈاکٹر ناہید کے کلینک کے سامنے پارکنگ میں رک گئی، معاذ عجلت میں باہر آیا تھا۔

''تم بھابھی کو لے کر آؤ جے، میں ڈاکٹرز کو مطلع کرتا ہوں ہری اپ۔'' معاذ پلٹ کر اس کی جانب دیکھے بغیر تاکید کرتا دوڑتے قدموں سے ہاسپٹل میں داخل ہو گیا تھا، جس پل جہان نے ژالے کو پھر سے بازوؤں میں سنبھالا، تکلیف کی شدتیں اس کے حواس چھین کر لے گئی تھیں۔

''یہ...... یہ ایسے کیوں ہو گئی ہے جے، کچھ بھی بول کیوں نہیں رہی؟'' زینب جہان کے تیز قدموں کا ساتھ دیتے تقریباً بھاگ رہی تھی، ژالے کی حالت برداشت نہ کر سکی تو بے اختیار سسکی، کلینک کے مرکزی دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی معاذ کی اطلاع کے باعث اسٹیچر تیار تھا، جہان نے جیسے ہی ژالے کو اسٹیچر پہ لٹایا، میل نرسوں نے اسے اپنی تحویل میں لیا، زینب معاذ اور زینب آپریشن تھیٹر کے باہر مضطرب بے کل کھڑے رہ گئے تھے۔

''وہ ٹھیک تو ہو جائے گی ناں؟'' زینب باقاعدہ آنسو بہا رہی تھی۔

''انشاء اللہ! اسے ہماری دعائیں کچھ نہیں ہونے دیں گی۔'' جہان کے لہجے میں یقین کامل تھا، معاذ کچھ فاصلے پہ کھڑا ژالے کی دو ماہ قبل ہونے والی کرٹیکل ڈلیوری کے متعلق گھر فون پہ اطلاع دیتا دعا کی درخواست کے ساتھ صدقہ کرنے کی تاکید کر رہا تھا، پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ہاسپٹل میں شاہ ہاؤس کے مکین جمع ہوتے گئے اور اندر زندگی کی کشمکش میں مبتلا ژالے ہر آن موت کو شکست دیتی بالآخر اس اذیت سے نجات حاصل کر گئی تھی۔

☆☆☆

''چھوٹے شاہ آ گئے ہیں شاہ!'' جہان کمرے میں قدم رکھا تو ژالے کی نقاہت اور تکلیف کے احساس سے بوجھل سرخ آنکھیں لحہ بھر کو مسکرائی تھیں، جہان نے اس کے بستر کے کنارے ٹک کر اس کے ہاتھ کو بہت ملائمت سے پکڑا اور بوسہ ثبت کیا تھا۔

''ہاں الحمدللہ، اور دیکھ لو، تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہو۔'' وہ کتنا مطمئن لگ رہا تھا، ژالے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''مجھے ایسا ہی لگا تھا، جیسے اب نہیں دیکھ سکوں گی آپ کو۔'' اس کی آواز پہ نقاہت کا غلبہ تھا، جہان کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔

''بہادر بنو لڑکی، ابھی تمہیں ایسے بہت سے چھوٹے شاہوں کی ماں بننا ہے۔'' شریر انداز میں کہتا وہ اس کا ناک دبا کر ہنسا، ژالے ایک دم سرخ پڑنے لگی۔

''اووف...... اتنے خوفناک ارادے ہیں آپ کے؟'' وہ مصنوعی خوف سے کہہ رہی تھی۔

''خوف ناک نہیں، نیک کہو، دو شادیوں کا فائدہ بھی تو ہونا چاہیے کوئی، شاہ ہاؤس جہان کے بچوں سے بھر جانا چاہیے اور زینب تو خود کہتی ہے شاہ میں آپ کے بہت سارے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔'' جہان زینب کے لہجے کی نقل اتار کر ہنسنے لگا، ژالے جھینپ گئی تھی، تب ہی زینب گلابی کمبل میں لپٹے بچے کے ہمراہ چلی آئی، اس کے چہرے پہ تمتماہٹ سی تھی، جہان کی آخری

بات سن چکی تھی وہ۔
"زیادہ بچوں کی ماں کو جنتی ہونے کی بشارت ہے، میری اس خواہش کے پیچھے لالچ تو بس جنت کا ہوا، آپ کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہوں تو اچھا ہے۔" وہ نخوت سے کہہ رہی تھی، جہان نے زوردار قہقہہ لگایا تھا، پھر شرارتی نظروں سے اسے دیکھا۔
"مجھے ایسی بیویاں زیادہ اچھی لگتی ہیں جو محبت کا اظہار کر کے پھر مکر جائیں۔" وہ سراسر اسے ہی چھیڑ رہا تھا، اب کے زینب نے اسے براہ راست گھورا تھا۔
"بے، اب اگر کوئی فضول بات کی آپ نے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" دھمکی دیتے ہوئے اس نے بچہ ژالے کے پہلو میں لٹا دیا، پھر ژالے کا ماتھا چوما تھا۔
"دیکھو ذرا اپنے چھوٹے شاہ کو، کیسے پیارے ہیں ماشاء اللہ۔" زینب کی نظریں بچے کے چہرے پہ نثار ہو رہی تھیں، ژالے بے اختیار گردن نیچی کر کے بچے کو دیکھنے لگی اور بے اختیار مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔
"شاہ یہ تو ہو بہو آپ کی تصویر ہے جبھی اتنا پیارا ہے۔" وہ بے خودی کہہ رہی تھی، جہان بے ساختہ و بے اختیار قہقہہ لگا بیٹھا، ژالے کو اپنی بے ساختگی کا احساس جبھی ہوا تھا، جبھی خجل ہوتی چلی گئی۔
"زینب بھی یہی کہہ رہی تھی، اس کا مطلب میری بیویاں باجماعت دیوانی ہیں میری۔" اس کا لہجہ شوخ و شنگ تھا، متبسم تھا، زینب نے گہرا سانس بھر لیا۔
"چلیں جی انہیں پھر خود پہ فخر کرنے کا موقع مل گیا۔" وہ مصنوعی انداز میں چڑی۔
"یہ فخر کچھ اتنا بے جا بھی نہیں ہے، ہاں...... مجھے تو جے پہ رشک آ رہا ہے، کاش پری بھی مجھے دوسری شادی کی اجازت دے دیتی، اتنے مزے میرے بھی ہو جاتے، خدمت اطاعت محبت واہ۔"
معاذ مسز آفریدی کے ہمراہ آیا تھا، پرنیاں ساتھ تھی، اس کا انداز مخصوص تھا بات کرنے کا، زینب کی ہنسی چھوٹنے لگی، وہ اٹھ کر مودب انداز میں مسز آفریدی سے ملی تھی، انہوں نے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔
"یہ آپ کا نواسہ۔" زینب نے بچہ ان کی گود میں دیا، مسز آفریدی خوشی و تشکر کے حساس سمیت آبدیدہ ہو کر رہ گئیں، ان کی جھولی میں رب نے انمول خزانہ دیا تھا۔
"یہ آپ کے ساتھ جائے گا ممی، اس کا بیگ تیار کر چکی ہوں میں۔" ژالے مدھم آواز میں کہہ رہی تھی، مسز آفریدی بے اختیار آنسو بہانے لگیں اور جو انہوں نے گفتگو کی تھی، اس کا لب لباب یہ تھا، کہ بچہ ان کے ساتھ نہیں جائے گا، ژالے کی گود بھری انہیں اچھی لگتی ہے، انہوں نے ژالے سے نیلما کی موت کا افسوس کرتے ہوئے اپنے سابقہ اعمال کی معافی بھی طلب کی تھی اور نیلما کے لئے دعا مغفرت بھی، ژالے خاموش آنسو بہاتی رہی۔
"میں عمر کے جس حصے میں ہوں بٹی، وہاں بچے کو سنبھالنا پرورش کرنا ناممکن ہے، یہ تمہاری اولاد ہے اب تمہیں اس کی خوشیاں نصیب کرے۔" وہ رخصت ہوتے سب کی ممنون تھیں، مما ماما

جان سے بالخصوص اپنے ناروا سلوک کی معافی مانگی تھی۔
"کچھ کھاؤ گی ژالے!" جہان اسے لٹاتے ہوئے نرمی سے استفسار کر رہا تھا، اس نے تھکے ہوئے انداز میں سر کو نفی میں ہلا دیا۔
"نہیں شاہ! بس آرام کرنا چاہتی ہوں، بہت تنگ کیا ہے آپ کے بیٹے نے دنیا میں آتے ہوئے، حد سے سوا ہے تھکن۔" اس کے چہرے پہ مان بھری، مامتا سے لبریز مسکان اتر آئی تھی، جہان کھل کر مسکرایا، پھر جھک کر اس کی پیشانی چوم کر کمبل اس پر برابر کر دیا۔
"ہاں، سو جاؤ، آرام ضروری ہے، اٹھو گی تو انشاء اللہ فریش ہو گی تم بالکل۔" ژالے نے مسکرا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

☆☆☆

پھر بہت سارے دن بہت خاموشی سے بیتتے چلے گئے، ژالے بتدریج صحت مند ہو رہی تھی، زینب اس کا پل پل خیال رکھتی کسی ماں کی طرح، گویا وہ چھوٹی بچی ہو اور جس دن زینب نے قرآن پاک مکمل پڑھ کر نیلما کو ایصال ثواب کیا، ژالے ممنونیت و تشکر کے اظہار کے طور پہ اس کے ہاتھوں پہ چہرہ جھکا کر روتی رہی تھی، جب بچے کے نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو سب نے یہ حق ژالے کو سونپا تھا، مگر ژالے نے یہ مان زینب کو بخش دیا تھا۔
"یہ زینی آپی کا بیٹا ہے، اس کا نام بھی آپ ہی رکھیں گی زینی آپی!" زینب اس مان اس محبت پہ فخر کے احساس سے لبریز نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی، اگر وہ ژالے کی اس کے بچے کی خدمت کر رہی تھی تو کیسے ممکن تھا ژالے اس کا بدل اسے نہ لوٹاتی، وہ ژالے تھی، دیا لو دل کی مالک، فیاضی میں زینب کو ہر بار پیچھے چھوڑ جانے والی۔
"ہاں...... یہ میرا بیٹا ہے، میں اس کا نام ایزد رکھوں گی، ایزد جہان۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر تائیدی نظروں سے سب کو دیکھنے لگی تھی اور ژالے نے اس نام پہ تصدیق کی مہر ثبت کر دی تھی۔
گزرتے وقت نے ژالے کو نیلما کے غم سے نکلنے میں مدد دی تھی، خدا کا وعدہ ہے وہ جو زخم لگاتا ہے انہیں خود ہی مندمل بھی کیا کرتا ہے، ژالے جہان کے علاوہ معاذ اور زینب کے بھی بڑے پن اور اعلیٰ ظرفی کی قائل ہو گئی تھی، یہ لوگ واقعی اس مفاد پرست دنیا میں فرشتوں کی طرح بے غرض بے ریا تھے۔
"ژالے دودھ کا گلاس ابھی تک ویسے ہی کیوں پڑا ہوا ہے؟" زینب کی خفا خفا آواز پہ وہ اداسی کے گھیرے سے نکل کر اسے دیکھنے لگی، جس کی نگاہ میں خود سے برتی جانے والی لاپرواہی پہ شکوہ تھا، آدھا گھنٹہ قبل وہ اسے دودھ دے کر گئی تھی، جو یونہی رکھا تھا۔
"زینی آپی پلیز خود کو اتنا نہ تھکایا کریں، آپ کو ان دنوں آرام کی بھی ضرورت ہے۔" اسے اپنے سوا سب کی فکر رہتی تھی، زینب کی خاص کر، جو اس پہ دل و جان لٹانے کے درپے رہا کرتی تھی۔
"آپریشن کے بعد سب سے اہم احتیاط اور خوراک ہی ہوا کرتی ہے پھر میرا خیال تو ہمارے صاحب بہادر بھی رکھ لیتے ہیں، البتہ تمہاری حد سے زیادہ نرمی کی وجہ سے میں ان سے ذرا مشکوک

ہی رہتی ہوں۔'' زینب نے اسی پل ہاتھ لے کر باہر آتے جہان کو دیکھ کر آخری فقرہ دانستہ چھیڑنے کو کہا تھا، جہان مصنوعی خفگی سے اسے دیکھتا قریب آ گیا۔

''کیوں میری معصوم بھولی بیوی کو میرے خلاف ورغلا رہی ہو چالاک لڑکی۔'' زینب نے برا سا منہ بنالیا۔

''وہ کہاں بدگمان ہوتی ہے میری کوشش کے باوجود بھی، آپ نے بوٹی ہی ایسی سنگھائی ہوئی ہے۔'' پھر صرف زینب نہیں ہنسی تھی، جہان اور ژالے بھی اس ہنسی میں شامل تھے، اس سے ٹھیک ایک ہفتے بعد جب شام کو زینب جہان کے ہمراہ منتقلی چیک اپ کو جارہی تھی، تو ژالے نے خود اس کی شال پریس کر کے دی تھی کہ نیچے جہان نے عجلت مچا رکھی تھی، وہ آفس چھوڑ کر آیا تھا، بھابھی اسے بلانے آئی تو اس یگانگت پہ مسکرادی تھیں اور بے ساختہ دعا سے نوازا تھا۔

''خدا تم دونوں کا یہ رتحاد و اتفاق یونہی قائم دائم رکھے آمین۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔'' زینب کھلکھلائی تھی، جبکہ ژالے نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ''آمین'' کہا تھا۔

زینب بھاگم بھاگ آ کر گاڑی میں بیٹھی تو مما نے آیت الکرسی پڑھ کر دونوں پہ دم کیا تھا، موسم سرد تو تھا ہی بادلوں کے باعث یہ سردی تکلیف دہ حد تک بڑھ گئی تھی، زینب نے ہیٹر کی رفتار تیز کی تھی، گول گپوں کے اسٹال پہ آ کر جہان نے بے اختیار بریک لگادی اور شریر نظروں سے زینب کا گلابی ہوتا چہرہ جھانچا۔

''اگر میں وہی جسارت کروں تو تم سابقہ گستاخی تو نہیں دہراؤ گی؟'' اور زینب اتنا جھینپی تھی کہ اس کے کاندھے پہ مکا دے مارا تھا۔

''یار آپس کی بات ہے، اب تمہارا کچھ کھانے کو دل کیوں نہیں کرتا؟'' اس کے کسی قدر جھنجھلا کر کیے سوال پہ زینب کی کھنک دار ہنسی گاڑی کی فضا میں بکھر گئی تھی۔

''وہ ساری بے تکی حرکتیں کسی روڈ بے نیاز اور لاتعلق بندے کو کس طرح سہی مگر اپنی خاموشی توڑنے کو اکسانے کے حربے تھے اینڈ دیٹس آل، اب کوئی خواہش کیسے اٹھے ہے، وجود میں روح میں نعمتوں کی فراوانی ہے، شکر کا شانتی کا احساس گہرا ہے۔'' وہ مسکرا رہی تھی اور جہان خاموش اسے دیکھتا رہ گیا تھا، مگر کلینک سے واپسی پہ جب اچانک غیر متوقع طور پہ اپنی گاڑی کی جانب آتے زینب کی نگاہ کچھ فاصلے پہ موجود تیمور پہ جا پڑی تھی، جو اسی پہ نظریں گاڑھے کھڑا تھا تو اس کا سارا اطمینان گھبراہٹ میں بدل گیا تھا، اس کی شدید پریشانی اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے آشکار ہوگئی تھی، پہلی نگاہ میں تو وہ اسے پہچان بھی نہ سکی تھی، یہ وہ سابقہ اکھڑ مغرور شاہانہ مزاج تیمور خان تو نہیں تھا، یہ تو کوئی جوگی تھا، یا پھر کوئی سوالی، جو کاسہ پھیلائے آس بھری درد بھری نظروں سے اسے دیکھتا تھا، اس کی حالت صحیح معنوں میں کسی جواری کے جیسی تھی، جو اپنی کل متاع گنوا بیٹھا ہو، اس کے باوجود زینب اس سے خائف ہوگئی تھی تو وجہ اس کا سابقہ وحشیانہ سلوک ہی تھا، اس کی نگاہ کی لپک سے بچنے کی غرض سے ہی وہ بے اختیار جہان کے وجود میں پناہ لینا چاہتی تھی، جہان جو اس ساری صورتحال سے یکسر بے خبر اپنے دھیان میں تھا، بے ساختہ چونک کر متوجہ ہوا، زینب کی

نظروں کے متوحش تھا تب ہی تیمور کو دیکھتے اس کے چہرے پہ آن کی آن میں بڑھی خشونت اور کرختگی کے ساتھ قہر کے تاثرات سمٹ آئے، اس نے اپنا بازو زینب کے وجود کے گرد پھیلایا تھا اور اسے یونہی استحقاق آمیز انداز میں تھامے مضبوط قدموں سے چلتا ہوا گاڑی کی جانب بڑھ گیا، تیمور کے چہرے پہ پھیلنے والا بے مائیگی اور نارسائی کا کرب کون دیکھ سکتا تھا، اس نے جانا تھا، اسی پل تو جانا تھا آگہی کے لمحے میں کہ پہلے بھی اللہ کی رضا کے بعد، اگر جہان کی مرضی ہوئی تو ہی زینب اسے مل سکتی تھی، کہ پہلے بھی اللہ کی رضا کے بعد جہان کے چاہنے پہ ہی وہ زینب کو پا سکا تھا، پھر...... اب...... اب اسے لگا تھا، جیسے اللہ کی مرضی تھی نہ جہان کی، حالانکہ اس نے تو اپنے تئیں بہت جال پھینکے تھے، مگر جب رب اپنے بندوں سے راضی ہو جاتا ہے، تو ان کی مرضی کی پسند کے مطابق فیصلے کر کے انہیں نوازتا ہے، ہی زینب و جہان کا ملاپ بھی رب کی رضا کا مرضی کا واضح اشارہ تھا، بارش بے آواز آسمان سے اترتی تھی اور وہ بھیگتا جا رہا تھا، زیاں کے احساس کے ساتھ گھلتا جا رہا تھا، ختم ہوتا جا رہا تھا۔

مگر بھیگنے بھیگنے میں بھی فرق تھا، بھیگے تو زینب اور جہان بھی تھے، مگر وہ رب کی خاطر من کو مارنے والے تھے، اس کے راستوں پہ چلنے کا عہد رکھنے والے تھے، یہ بھیگنا رحمت کا بھیگنا تھا، بارش نے رحمت بن کر انہیں سیراب کیا تھا، جبھی دونوں سرشار تھے، جہان کا لمس اس کا استحقاق، زینب کو خدا کی طرف سے ملنے والا تحفظ لگتا تھا، وہ پھر سے نارمل تھی، پھر سے مضبوط۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد جہان نے دروازہ بند کیا تھا، پھر اپنی جیکٹ اتار کر اسے پہنا دی اور یہیں پہ اکتفا نہیں کیا تھا، جیکٹ کا زپ بھی اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا تو ماضی کی برسات کی ایسی یاد میں سنگ اٹھنے والا زینب کا دل ہر تشنگی ہر خلش مٹا گیا، طے ہوا تھا اس پہ رب کا احسان بھرپور تھا،

اگر وہ نہیں بھولی تھی کچھ بھی تو جہان بھی لمحہ لمحہ سنبھالے ہوئے تھا، قیمتی متاع کی مانند، خوشگوار دھڑکنوں سے لبریز احساسات کے ہمراہ اس نے کچھ کہے بغیر اپنے دونوں یخ بستہ ہاتھوں میں جہان کا چہرہ تھام لیا، پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر شرارتی تبسم سمیت بولی تھی۔

''بھلا لگا، میں کتنی سرد ہو رہی ہوں۔'' وہ کھلکھلائی تھی۔

''بالکل اس دن جتنی۔'' جہان جواباً بے ساختہ بولا تھا، پھر دونوں ہنسنے لگے۔

تم اپنے سرد ہاتھوں سے میرے گال چھوتی تھیں
دسمبر میں مجھے تیری شرارت یاد آتی تھی

وہ گنگنایا تو زینب نے سرشار ہوتے ہوئے اس کے گلے میں بازو حمائل کر دیا تھا اور سر اس کے کاندھے سے ٹیک دیا، سکون کا طمانیت کا محبت کا یہ انداز بہت دل پذیر تھا، مگر وہ زیادہ دیر اس سے لطف نہیں اٹھا سکے تھے، بائیک پہ سوار دو نوجوان بہت دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، برق رفتاری سے پاس سے گزرتے انہوں نے شوخ سیٹی بجائی تھی، زینب ایکدم کھسیا کر جھٹکے سے سیدھی ہوئی، جہان اس کی خفت وخجالت سے سرخ پڑتی رنگت کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بے حال ہونے لگا۔

''کم آن یار! وہ جا چکے ہیں۔'' جہان نے گویا اسے شرمندگی سے نکالنا چاہا، مگر وہ الٹا اسے گھورنے لگی تھی۔

''آپ مجھے بتا سکتے تھے، آج ہماری گاڑی کے گلاسز ڈارک نہیں ہیں۔'' وہ خفت مٹانے کو اس پہ چڑھائی کر چکی تھی، جہان کی ہنسی میں مزید اضافہ ہونے لگا۔

''یار مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا واپسی تک تمہارا موڈ ایسا رومینٹک بھی ہو سکتا ہے ورنہ لازماً ایسا اہتمام رکھتا۔'' اس کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی، زینب اتنا جھینپی کہ حد نہیں، ایک بار پھر اسے گھونسے مار کر خفت مٹانے کی سعی کرتی رہی۔

''او...... ہیلو مسٹر...... رومینس کا آغاز کس نے کیا تھا؟'' وہ روہانسی ہو رہی تھی، جہان نے مسکراہٹ ضبط کی اور اس کے کاندھے پہ اپنا بازو پھیلا لیا۔

''آف کورس میں نے اور میں وہیں سے کنٹی نیو کر رہا ہوں۔'' اس کا بھاری لہجہ جذبات سے بوجھل ہونے لگا، آواز میں مدھ بھری ہوئی تھی، زینب گڑبڑا گئی، سرعت سے اس کا بازو ہٹایا۔

''شرافت سے ڈرائیو کریں، بارش تیز ہو رہی ہے۔'' زینب نے اس کی توجہ خراب تر ہوتے موسم پہ دلائی تھی، جہان سرد آہ بھرتا سیدھا ہو گیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

''گھر چل کر بات کرتے ہیں۔'' اس نے اپنے تئیں زینب کو دھمکی دی تھی، مگر وہ ہرگز خائف نہیں لگ رہی تھی، محبت پاش نظروں سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، پھر سر سیٹ سے ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں، زندگی خوب صورت تھی اور مکمل بھی اور وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی، بے حد بے پناہ، بلاشبہ یہ اسی کی کرم نوازی تھی، کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل تھی، آسودہ تھی۔

رب کی ایک رحمت باہر برس رہی تھی، ایک اس کے پاس تھی، اس کے جہان کی صورت اس کے مکمل سکون اور آسودگی کا باعث، اب واقعی اس کی زندگی اس کا جہان مکمل تھا۔

☆☆☆

ام مریم

ڈیئر قارئین، فوزیہ آپی، اللہ سے دعا ہے، اللہ پاک ہمیشہ آپ پہ مہربان ہو۔
تم آخری جزیرہ ہو، بالآخر اپنے اختتام کو پہنچا، میں سب سے زیادہ اپنے رب رحمٰن کی شکر گزار ہوں، میرے مالک کا الحمدللہ مجھ پہ خاص کرم رہا اور پھر فوزیہ آپی کی بھی کہ ان کا تعاون میرے ساتھ رہا، جزاک اللہ آپی جی۔
قارئین کرام! آپ کو یاد ہوگا، اس ناول کے آغاز پہ بھی میں آپ سے مخاطب ہوئی تھی اور کچھ باتیں بھی کی تھیں، جنہیں کچھ مہربانوں نے غلط پیرائے میں لے لیا تھا، حالانکہ مجھے جیسی خاکسار گنہ گار پہ اللہ کا خصوصی کرم رہا کہ کبھی دعویٰ کیا نہ تکبر، اللہ کا احسان ہے کہ مجھے ان دونوں کاموں سے بچائے رکھا آگے بھی اللہ ہمیشہ محفوظ رکھے آمین۔
اک بات کہی تھی تب میں نے کہ یہ ناول ''میرے ساحر سے کہو'' سے کہیں زیادہ اچھا ہے، یہ ایک رائے تھی، ایک خیال تھا، اور بس جس کا میں سمجھتی ہوں مجھے اس کی خالق ہونے کے ناطے پورا حق حاصل تھا، دعویٰ تھا نہ متکبرانہ کلمہ، اللہ شاہد ہے اس بات کا، لیکن برا مان لیا گیا، غلط سمجھ لیا گیا، اب میں اس بات کے حوالے سے صرف اتنا کہوں گی، کہ تب اللہ نے اگر میرے منہ سے یہ بات نکالی تھی، تو اللہ نے ہی اس بات کو ثابت بھی کر کے دکھا دیا، یہ ناول ''میرے ساحر سے کہو'' سے ہر لحاظ سے اچھا، بہترین اور شاندار ثابت ہو چکا، الحمدللہ۔
اس بات کی گواہی آپ سب کی اس میں انوالومنٹ آپ کی حد سے زیادہ جذباتی وابستگی خود واضح کر چکی، میں ان اپنے پیارے قارئین کی مشکور ہوں جنہوں نے اسے پڑھا پسند کیا اور سراہا اور اپنی سوچ مسلط نہیں کی، اس خیال سے پڑھا کہ میں نے اگر مختلف موڑ دیئے کہانی کو تو اس کی وجہ بھی ضروری اہم اور خاص ٹھہری ہوگی۔
یہاں مجھے بات ان قارئین سے کرنی ہے، جو اس ناول میں اس حد تک انوالو ہو گئے تھے اور ژالے سے اتنی محبت کرنے لگ گئے تھے کہ انہیں اسی باعث زینب سے نفرت ہو گئی تھی، اتنی نفرت...... الاماں الاماں۔
ایک وقت ایسا آیا تھا، ان کی آہ و بکا اور اشتعال کو دیکھتے کہ میں بھی گھبرا گئی تھی، پریشان ہو گئی تھی، کہ میرے قلم نے اتنے دل دکھا دیے، اتنا تکلیف میں مبتلا کر دیا لوگوں کو۔
پیارے قارئین! مجھے کبھی آپ کی شدت پسندی پہ انتہا پسندی پہ غصہ نہیں آیا، اس کے باوجود کہ آپ ژالے کی محبت میں زینب کو رگیدتے رگیدتے مجھے بھی لپیٹ میں لے جاتے تھے، میں سمجھ سکتی تھی، یہ بھی آپ کی محبت ہے، محبت تو ویسے بھی اندھی ہوتی ہے، کچھ دکھائی نہیں دینے دیتی، جب اختیار نہیں تو ملامت کیسی، ملامت تو اختیاری فعل پہ لازم ہے ناں، ہاں مجھے افسوس ہوتا رہا، ملال ہوتا رہا، رنج ہوتا رہا۔

شب کی گود میں اس کے کالے گھنے گیسوؤں تلے سر رکھے اجلا خوبصورت دن میٹھی نیند سو رہا تھا جب دن کے جاگنے کا وقت ہوا تو شب نے اپنے گیسو سمیٹ لئے اور شاہ خاور نے ایک دلکش مسکراہٹ کی کرن سے اسے الوداع کہا تو دن بھی انگڑائی لیتا ہوا جاگ گیا اس کے ساتھ ہی جنگل کے تمام پھول کلیاں چرند پرند جاگ گئے نیلی کالی سفید چڑیاں چہچہا کر دن کا استقبال کرنے لگیں اور نرم ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پھولوں کے ساتھ مل کر تالیاں بجانے لگے، ایسے میں وہ بھی اٹھا اور ندی کی طرف پانی لینے کے واسطے گیا وہاں منظر متحیر کرنے کو کافی تھا ایک خوبصورت دوشیزہ ندی کے کنارے ہوش و خرد سے بیگانہ پڑی تھی اس کی لمبی کالی زلفیں اس کے دلکش چہرے پر بکھری ہوئی تھیں ایک بازو سینے پر اور دوسرا سر کے پیچھے کی طرف تھا شاہ خاور کی کرنیں اس کے رخ انور سے کھیل رہی تھیں اس کے چہرے کی چمک دیکھ کر اسے شہزادی کا گماں ہوا جیسے وہ راستہ بھٹک کر ادھر آ گئی ہو وہ جلدی سے قریب گیا۔

نا آشنا سا جواں سال دوشیزہ، وہ سانس لے رہی تھی اس نے جلدی جلدی ہاتھوں کی اوک میں پانی بھرا اور اس کے چہرے پر چھینٹے مارے۔

''اٹھو اٹھو۔'' اس نے بے تابانہ پکارا، دوشیزہ نے آنکھیں کھول دیں تاثرات سے عاری چند لمحے وہ اسے دیکھتی رہی پھر ناشناسائی کی ایک لہر ابھر کر خوف کے سمندر میں ڈوب گئی، نیلی کانچ جیسی آنکھوں کے کونے پر خوف کے گدھ نے پنجے گاڑے تو رنگ ایکدم سفید پڑ گیا۔

''ڈرو نہیں...... مجھے اپنا دوست سمجھو، میں یہیں رہتا ہوں، تنہا اکیلا اور تم شہزادی ہو نہ وہی شہزادی جس کی کہانی میری ماں مجھے بچپن میں سنایا کرتی تھی ماں تو کھو گئی یا شاید میں کھو گیا (مگر مجھے آج بھی شہزادی کا انتظار تھا)۔'' اس نے چند لفظوں میں اپنی داستان سنانا چاہی اور آخری فقرہ صرف سوچ کی دیواروں تک ہی پہنچ سکا، پاؤں پر چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ چل نہیں سکتی تھی، اس نے اس دوشیزہ کو کسی نرم پھول کی طرح اپنے بازوؤں پر اٹھالیا اور جھونپڑی میں لے گیا کہنے کو تو وہ جھونپڑی تھی مگر چاروں طرف سے پھولوں کی بیلوں نے اپنی ہوئی رنگوں سے جگر جگر کرتی وہ پھولوں کی پالکی لگی اسے وہاں بٹھا کر وہ اس کے کھانے کے لئے کچھ لینے چلا گیا اور وہ اپنے ماضی کے بارے میں سوچنے لگی۔

اس کے اپنے ہی اسے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں سنگسار کرنا چاہتے تھے اس جواں سال بیوہ کو جیتے جی کفن پہنا دیا گیا تھا تو اس کی گلی کے ایک لڑکے اجیت نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر کر دی کیونکہ وہ اس کے بچپن کا دوست تھا اکٹھے کھیل کود کر جوان ہوئے تھے، وہ ان فضول رسموں کے عوض اسے کھونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ اپنی بچپن کی دوست کو دو دو دن فاقے کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا کمانے والا تو کوئی تھا نہیں، سہاگ اچانک ہی اجڑ گیا تھا اس دکھ سے پتا جی کو فالج ہو گیا اور وہ چند دنوں میں ہی پاپی دنیا سے چل بسے ماں تو اس کے بچپن میں ہی گزر گئی تھی وہ بھی ان نام نہاد رسموں سے تنگ آ چکی تھی اس نے اجیت کو شادی کے لئے ہاں کر دی محلے برادری والوں کو یہ بات ناگوار گزری کہ آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی رسموں کو اپنانے سے انکار کر رہی تھی۔

''انسان صدا سے تبدیلی کا خواہاں ارتقائی مراحل سے گزرتا ہوا مگر آباؤ اجداد کی بنائی فضول رسموں کے سامنے بے بس۔''

اجیت کو تو سنگسار کر دیا گیا تھا مگر وہ اپنی جان بچائی وہاں سے نکل آئی بے برگ و ساماں بے سنگ و میل یہاں آ پہنچی تھی۔

اور سامنے کی دیوار پر لکھا ہوا لفظ اللہ اسے متحیر کرنے کو کافی تھا، مگر شاید وہ سرحد پار چلی آئی تھی یہ جنگل دو ملکوں کے درمیان ہی نہیں، دو تہذیبوں کے درمیان تھا دو مذہبوں کے درمیاں تھا وہ یہ کس کی پناہ میں چلی آئی تھی وہ جیسے کسی خوفناک خواب میں سانس لینے لگی اتنے میں وہ پھل توڑ کر لے آیا اور دوشیزہ کے آگے رکھ دیئے وہ خوفزدہ ہرنی کی مانند ڈری ڈری انگور کھانے لگی۔

''اپنا پاؤں ادھر لاؤ مرہم پٹی کر دیتا ہوں۔''

''نہیں نہیں رہنے دو۔'' وہ کسمسائی لیکن اس نے دوشیزہ کے زخمی مرمریں پاؤں کی پٹی شروع کر دی عورت کے دل میں چھپا نرمی کا ازلی جذبہ چہرے کی درازوں میں اٹ گیا اس لمحے حیا کے سارے درد جاگ اٹھے اسے احساس ہوا وہ زخمی ہے، شدید زخمی دکھی ہے رونا چاہتی ہے اور پھر اس نے مرد کے کندھے پر سر رکھ کر سارے درد جیسے آنسوؤں میں بہا دیئے اور وہ اپنے خیالوں میں گم حسین لمحوں میں سانس لے رہا تھا اس پھٹے دوپٹے کو دیکھ کر اس نے اپنی ماں کی گلابی اوڑھنی اسے دے دی اسے اچھی طرح یاد تھا وہ اور بابا اپنے گاؤں کے قریب لگنے والے میلے میں سے وہ اوڑھنی لائے تھے جدا ہوتے وقت ماں نے اسے اپنی یہ اوڑھنی اپنے سر سے اتار کر دی تھی۔

''جب تمہیں میری یاد آئے تو اس اوڑھنی کو اپنے سینے سے لگا دینا اپنے بازوؤں میں بھر لینا اس میں میری خوشبو بسی ہے میرے چاند اب بھاگ جا۔'' اور پھر کتنے ہی دن بیت گئے وہ دونوں ایک دوسرے کے نام نسل سے نا واقف ایک ہی چھت تلے اعتماد کے سہارے رہ رہے تھے ایک دن جب اس کا زخمی پاؤں ٹھیک ہو گیا تو مرد کے دل نے نگاہوں سے آگے کی پہچان کھوجنا چاہی۔

''تم کون ہو؟'' دوشیزہ سے پوچھا۔

''پہلے تم بتاؤ تم کون ہو؟'' شاید وہ گزرے لمحوں کی پہچان سے جاننا چاہتی تھی۔

''میرا نام غلام اللہ ہے ایک رات ہماری حویلی پہ میرے چاچا نے حملہ کر دیا سب کچھ ختم ہو گیا اور میری ماں نے میرے ہاتھوں میں اپنی یہ گلابی اوڑھنی تھما کر مجھے وہاں سے بھگا دیا، پتہ نہیں کتنے دن کتنی راتیں میں بھاگتا رہا، کتنے موسم گزر گئے کہ میں اس جنگل میں آ پہنچا یہاں آ کر مجھے لگا میں تو جانے کب سے زخمی تھا اور زخمی وجود لئے دوڑتا رہا، ٹھیک ہوتے ہوتے میں جنگل اور اس کے مکینوں سے مانوس ہو گیا یہاں کے سبھی مکیں درخت پھول جانور پرندے میرے دوست بن گئے۔''

''اب تم بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟'' لہجے میں حد درجہ مٹھاس تھی۔

''میرا نام شکنتلا دیوی ہے۔'' نام سنتے ہی اسے لگا اس کے شہر دل پہ حملہ ہوا ہے اسے آج پھر بھاگنا پڑے گا۔

''کیا ہوا تم خاموش کیوں ہو گئے۔'' شہد آگیں آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ چونکا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گیا پتہ نہیں وہ اپنے آپ سے بھاگ رہا تھا، برسوں پہلے دیکھے گئے خواب کی تعبیر کے ٹوٹنے سے درد رگ و پے میں سرائیت کر چکا تھا وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا مگر نگاہ نیچی رکھتا تو اس کی پیاس

شام ڈھلنے کے سایے آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لے چکے تھے، شہر کی پر رونق سڑک مختلف آوازوں سے گونج رہی تھی، ٹریفک کے شور اور لوگوں کی ملی جلی آوازیں عجیب ماحول برپا کیے ہوئے تھیں، پر رونق سڑک پر کتنے ہی چہرے تھے، اداس، مسکراتے ہوئے، حسین تو کچھ واجبی سے انہی چہروں میں سے ایک ملول چہرہ احتشام کا بھی تھا، اس کا چہرہ عام سا تھا، قد لمبا اور جسم مضبوط و جواں، عام سی شکل ہونے کے باوجود مجموعی طور پر اس کی شخصیت پرکشش تھی، خاص طور پر اس کی سیاہ چمکتی آنکھوں سے ذہانت عیاں تھی، اس نے گہری نیلی جینز اور سفید قمیض پہنی ہوئی تھی، اس کے بال ہوا سے پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے، وہ دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں ڈالے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا چہل قدمی کے انداز میں چل رہا تھا، اس کی نگاہیں ہر آتے جاتے شخص کا اس طرح جائزہ لیتی تھیں جیسے اسے کسی خاص شخص کی تلاش ہو۔

یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ جب بھی اسے فرصت ملتی تو وہ گھنٹوں یوں بے مقصد سڑکوں پر پھرا کرتا تھا اور اکثر اوقات لوگوں کے ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتا تھا، اسے یوں لگتا تھا کہ اتنے سارے لوگ ہونے کے باوجود کسی کی کمی سی تھی، کوئی ایسا شناسا چہرہ جو اسے سمجھ سکتا ہو، وہ کہیں نہیں تھا، وہ چلتا رہا اور کئی مناظر پیچھے چھوڑتا گیا، بلند بانگ عمارتیں، شاپنگ سینٹرز، دکانیں، گھر...... اچانک وہ چلتے چلتے ایک میوزک سینٹر کے آگے سے گزرا تو ایکو ساؤنڈ میں ایک اداس صدا سن کر اس کے قدم جیسے جم گئے، ڈوبتا سر کی پرتاثیر آواز میں گیت کے بول اس کے کانوں سے ٹکرائے۔

"Still i am sad"۔

ان الفاظ نے جیسے اسے جکڑ لیا، وہ اور اداس ہو گیا اور اس کی سوچیں گیت کے بولوں کے ساتھ بھٹکنے لگیں اور پھر وہ خیالوں کے جال سے خود کو آزاد کراتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتا آگے چلنے لگا، وہ کتنی دور نکل آیا اسے یہ احساس ہی نہیں رہا یہاں تک کہ وہ کمرشل ایریا سے نکل کر رہائشی علاقے میں آپہنچا، یہ علاقہ صاف ستھرا اور پرسکون تھا، صاف ستھری سڑک کے دونوں طرف خوبصورت بنگلے تھے، جن کی دیواروں سے لپٹی پھول دار بیلوں اور آس پاس کے سبزے اور درختوں سے ماحول بے حد خوبصورت لگ رہا تھا، آگے ایک پارک تھا جس کے اطراف گھنے درخت تھے اور پارک پھولوں سے لدے پودوں اور سبز گھاس سے خوبصورت لگ رہا تھا، پارک میں کچھ بینچ بھی تھیں، احتشام پارک میں داخل ہوا اور ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا، ساتھ والی بینچ پر ایک بوڑھا شخص کتاب کے مطالعے میں غرق تھا جبکہ کئی بچے پارک میں فٹ بال اور دوسرے کھیلوں میں مصروف تھے، مغرب میں درختوں کے پیچھے ڈوبتا سورج سرخ چہرہ لئے جھانک رہا تھا اور آسمان پر بکھرتے شفق کے سائے ماحول کو سہانا بنائے ہوئے تھے، احتشام ہر طرف بکھرے فطرت کے ان رنگوں کو دیکھنے میں مگن تھا مگر من کی اداسی گھٹنے کے بجائے بڑھتی رہی، اس کا ذہن پھر اس کی یادوں میں بھٹکنے لگا اور...... پھر وہ...... ان یادوں میں ڈوب گیا۔

کتنا پیارا تھا وہ وقت جب وہ سب گاؤں میں رہتے تھے، ان کا گھرانہ معاشی طور پر خوشحال تھا مگر گھر کسی دوزخ سے کم نہیں تھا کیونکہ اس کی ماں اور باپ کے درمیان کبھی بھی ذہنی ہم آہنگی نہ ہو سکی، اس کا باپ بی اے پاس تھا اور ماں ان

پڑھ، اس کا باپ اس شادی پر راضی نہیں تھا مگر احتشام کے دادا کے مجبور کرنے پر اس نے یہ شادی کر تو لی تھی مگر اپنی بیوی سے جھگڑنا اس کا روز کا معمول تھا، احتشام سے دو بہنیں اور ایک بھائی بڑا تھا، بیچارے سارے بچے ماں باپ کے جھگڑوں کی وجہ سے مناسب توجہ اور پیار حاصل نہیں کر پائے تھے، جب تک احتشام کا دادا زندہ تھا اس کے باپ نے جیسے تیسے نباہ کیا کیونکہ تمام جائیداد اور اخراجات کے اختیارات اسی کے پاس تھے، وہی کفیل بھی تھا سب کا، اس کی وفات ہوتے ہی حالات بدلنے لگے، اب جائیداد کا بٹوارہ ہوا اور احتشام کے والد اور اس کے دو چچاؤں کے درمیاں جائیداد کے بٹوارے کے حوالے سے شدید اختلافات شروع ہو گئے، اب بھائیوں اور ان کی بیویوں کے درمیاں روز کے جھگڑے شروع ہو گئے، ان کے درمیاں دوریاں بڑھتی گئیں، بڑی حویلی میں رہنے والے ان خاندانوں کے بچے بڑوں کے جھگڑوں اور اختلافات سے دور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے وہ سدا ساتھ رہے اور ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے، احتشام کی شروع سے ہی اپنے تایا کی چھوٹی بیٹی مریم سے خوب دوستی تھی، وہ ساتھ پڑھتے اور ساتھ کھیلتے تھے، ان کے درمیاں دوریاں اس وقت حائل ہوئیں جب شدید اختلافات کے بعد ان کے والدین اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے اور اب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے، ایک بھائی کراچی اور ایک بھائی حیدر آباد میں جا کر آباد ہو گئے، احتشام کا باپ اپنا حصہ لے کر شہر میں جا کر بس گیا اور پھر لوٹ کر کبھی ان کی خبر تک نہیں لی، وہیں اس نے دوسری شادی کر لی احتشام اور اس کے بہن بھائیوں کے حصے میں فقط پرکھوں کی حویلی ہی آئی تھی جس میں وہ سب رہتے تھے اور تھوڑی سی زمین، احتشام کے بڑے بھائی نے اس وقت اپنے بکھرے خاندان کو سمیٹا اور فجر سے لے کر مغرب تک بنجر زمین کو فصل کے لائق کرنے میں جتا رہتا، اس کی بہن سلائی اور کڑھائی کر کے بھائی کا ہاتھ بٹاتیں، وہ سب کام کرتے مگر احتشام پر آنچ آنے نہیں دی، وہ سب تو زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے مگر اسے ہر سہولت دی کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنا مستقبل سنوار سکے۔

احتشام ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، اپنی دن رات کی محنت سے انٹر پری میڈیکل میں اس نے شاندار کامیابی حاصل کی اور پھر میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لینے کے لئے وہ شہر آ گیا، داخلہ ملنے کے بعد وہ وہیں ہاسٹل میں رہنے لگا، اسی میڈیکل کالج میں اس کی ملاقات اپنی کزن مریم سے ہوئی، ایک طویل عرصے کے بعد اب جب وہ بچپن کی سرحدوں کو پار کر کے جوانی کی حسین وادیوں میں آ چکے تھے، وہ شروع شروع میں تو ایک دوسرے کو پہچان نہیں پائے تھے لیکن پھر انہوں نے بھی آخر ایک دوسرے کو پہچان لیا کہ وہی بچپن کے ایک حویلی میں رہنے والے اور ساتھ پڑھنے اور کھیلنے والے ساتھی تھے، مریم جوان ہو کر اور بھی خوبصورت ہو گئی تھی، سرو قد، گھنے لمبے بال اور گھنی سیاہ اور لمبی پلکوں کے درمیاں وہی بڑی بڑی گہری اور سیاہ آنکھیں۔

احتشام نے بھی خوب قد نکالا تھا، سلجھے ہوئے طور طریقہ اور کلاس کے ذہین طلباء میں اس کا شمار تھا، تمام استادوں کا فیورٹ طالب علم اور لڑکیوں میں مقبول، پھر بھی رزرو رہتا تھا کہ خاندانی شرافت کا امین تھا، ایک دفعہ جب وہ دونوں میڈیکل کالج کے بڑے سے لان میں درختوں کے نیچے بینچ پر بیٹھے تھے تب بچپن کی

باتیں یاد کرتے ہوئے اچانک احتشام نے کہا تھا۔
''مریم! کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ ہم ایک خاندان ہوتے ہوئے بھی کتنا عرصہ بیگانوں کی طرح ملتے رہے پھر ہم نے ایک دوسرے کو پہچانا، اب ساتھ بھی ہیں مگر یوں کہ درمیان میں سالوں کے فاصلے اور خاندانی اختلافات بھی ہیں۔''
''واقعی۔'' مریم کی آنکھوں میں بھی بے پناہ اداسی امنڈ آئی اور وہ کہنے لگی۔
''ہمارے بڑوں نے ہمیں ایک دوسرے سے یوں دور کر دیا کہ ہم ایک دوسرے کو پہچان نہیں پائے تھے، مگر احتشام ہم نوجوان تو ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے، تو پھر کیا ہم سب کزنز مل کر بڑوں کے درمیاں حائل نفرت کی دیواروں کو گرا نہیں سکتے۔''
''مریم! یہ اتنا آسان نہیں، اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، ہم لوگ اس نفرت اور خود غرضی کا کیا بھگت رہے ہیں۔'' احتشام نے اداسی سے کہا۔
قدرت ان کو قریب لے آئی تھی فارغ وقت میں وہ دونوں ساتھ ہوتے اور اکثر خاندانی رنجشیں یاد کر کے اداس ہوتے تو کبھی بچپن کی شرارتیں انہیں ہنسا دیتیں۔
''مریم! اب تو تم بہت بدل گئی ہو، بچپن میں تو ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتی تھیں اور میں تمہاری رونی صورت دیکھ کر ہنستا رہتا تھا۔'' احتشام نے چڑایا تو وہ بھی چڑ کر بولی۔
''اچھا...... بس...... اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہر وقت تو زمین پر لوٹنیں لگاتے اور درختوں سے چھلانگیں لگاتے مٹی کے مادھو بنے پھرتے تھے اور میرا احسان بھول گئے کہ اکثر تمہارا ہوم ورک کر دیتی تھی کہ اسکول میں سزا سے بچ جاؤ۔''
''خیر...... جناب احسان تو نہیں، جواب میں چچا کے باغ سے کیریاں کون توڑ کر لا دیتا تھا جن میں جان تھی چٹوری کی۔''
دونوں ہنسنے لگے تو احتشام کو اس کی ہنسی اپنے کانوں میں گونجتی جلترنگ کی طرح لگی۔
وہ غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے قریب آتے گئے ان کا دل چاہتا کہ وہ گھنٹوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہیں مریم سدا یونہی ہنستی رہے اور اس کے کانوں میں جلترنگ کی صدا گونجتی رہے، وہ بچپن کے بے فکرے دنوں کی یادیں دہراتے رہے۔

☆☆☆

وقت پر لگا کر اڑتا رہا، وہ دونوں دن رات تعلیمی سرگرمیوں میں بھی ایک ساتھ فعال رہے، مریم ایک آئیڈیل لڑکی تھی، وہ ذہین طالبہ تھی اس کی سادگی نے اسے اور بھی احتشام سے قریب کر دیا تھا، دونوں میں بے حد انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی اور احتشام کو وہ اپنے دل کے کواڑ پر دستک دیتی محسوس ہوتی تھی، ان دنوں وہ اپنے گھر سے دور ہاسٹل میں رہتا تھا اور اس شہر میں اس نے خود کو ہمیشہ اجنبی پایا مگر مریم کے وجود نے اس کے اندر کی اس تنہائی کے احساس کو ختم کر دیا کہ اسے محسوس ہوتا کہ اتنے بڑے شہر میں کوئی ایک پیاری ہستی تو ہے جس سے نہ صرف اس کا خون کا رشتہ تھا مگر وہ اس کی ہر بات بن کہے سمجھ لیتی تھی، کبھی کبھی وہ حسین تصورات کی وادیوں میں بھٹکتا بہت دور نکل جاتا جہاں وہ اس کے انتظار میں کھڑی ملتی اور وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کہیں کا کہیں پہنچ جاتے جہاں وہ دونوں جیون ساتھی ہوتے پھر وہ اپنے خیالوں سے چونک کر جاگ جاتا تب اس کی نظروں کے

سامنے نوری کا چہرہ آ جاتا، نوری، جو اس کی منگیتر تھی اور گاؤں میں رہتی تھی، جو اس کی بہن کے رشتے کے بدلے اس کے نام کی گئی تھی کہ یہ ان کے گاؤں کی رسم تھی اور اگر وہ انکار کرتا تو اس کی بہن کا رشتہ بھی ٹوٹ جاتا اور کوئی دوسرا اس سے شادی نہیں کرتا، کبھی کبھی اس کا دل مجبوری کی اس زنجیر کو توڑ دینا چاہتا تو دماغ سمجھاتا کہ یہ مجبوری نہیں بھی ہوتی تو بھی مریم اس کی دسترس سے بہت دور تھی، وہ غربت میں پلا تھا اور اس کا مستقبل ابھی دھندا میں تھا جبکہ مریم بڑے گھر سے تھی، اسی بڑے گھر سے تو وہ بھی تھا مگر کیا کرتا دادا کی جائیداد بٹی تو اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی اور اس کی سوتیلی ماں، بھائی اور بہن تو بڑی اچھی زندگی گزار رہے تھے مگر ان کے لئے نہ تو باپ کے پیسے سے حصہ تھا نہ عیش و آرام، ان لوگوں نے باپ کے جانے کے بعد بہت غربت دیکھی تھی، تو کیا وہ پیسے سونے اور چاندی کی یہ دیواریں گرا پائے گا؟ ہرگز نہیں، پھر بڑوں کے درمیان اختلافات کی خلیجیں وہ پار کر پائے گا؟

یہ سب کچھ سوچ کر وہ اپنی سوچوں پر پہرا لگا دیتا پھر بھی یہ سوچیں اس کے دل کی دیواروں سے ٹکرا کر انہیں ہلا دیتی تھیں، یوں اسی کشمکش میں وقت بھی گزرتا رہا اور وہ دونوں میڈیکل کے فائنل ائیر میں آ گئے، اب احتشام اکثر خوفزدہ ہو جاتا کہ اب کیا ہوگا؟ کیا فائنل کے بعد وہ دونوں پھر سے بچھڑ جائیں گے؟ اور پھر آخر ایک دن امتحاں کا وقت آ گیا مگر کالج کے نہیں، زندگی کے امتحان کا، ان دنوں اس نے مریم کو بہت خاموش اور الجھا ہوا پایا۔

☆☆☆

اس دن تو وہ صبح سے ہی بہت پریشان تھی، آج تو وہ اپسرا لگ رہی تھی، سفید سمپل سوٹ پر دھنک رنگ دوپٹے میں وہ اپنے نام کی طرح مقدس لگ رہی تھی، ان دنوں وہ پڑھائی کی مصروفیات کے سبب بہت کم بات کر پا رہے تھے کہ اچانک گھنگھور گھٹائیں چھانے لگی، کلاس ختم ہوئیں تو مریم نے اس سے کہا کہ وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہے، احتشام اسے لے کر قریب ایک ریسٹورنٹ میں آیا اور کونے کی ٹیبل منتخب کی کہ بات کرنے میں آسانی ہو اور برگر اور کافی کا آرڈر دینے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ وہ اپنی سوچوں میں گم کھڑکی سے باہر برسات کے نظارے میں گم تھی کہ اچانک گرج چمک کے ساتھ تیز بارش شروع ہو چکی تھی، اسے یوں لگا کہ مریم کے اندر بھی گرج چمک ہو رہی تھیں، اتنے میں برگر اور کافی پیش کی گئی تو احتشام نے برگر اور کافی کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مریم! کافی پیو۔"

"اوہ، تھینک یو۔" کہتے ہوئے اس نے کافی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیا بات ہے مریم؟ آج تم بہت پریشان لگ رہی ہو؟ کوئی مسئلہ ہے؟" اس نے دھیرج سے پوچھا تو وہ اسے خالی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

"ہوں...... ہاں...... بہت پریشان ہوں مگر سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟"

"بولو، آخر کیا بات ہے؟"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کروں؟ تمہارے علاوہ شاید کوئی حل بھی نہ بتا سکے مسئلے کا۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش ہو گئی کہ جیسے ہمتیں جمع کر رہی ہو اور پھر اٹک کر کہا۔

"احتشام! تم سے زیادہ مجھے کوئی نہیں جانتا، میرے گھر والے بھی نہیں، ہم نے تقریباً

پانچ سال ایک ساتھ گزارے ہیں، مگر...... فرض کرو...... اب ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں ......تو......؟"

اس وقت احتشام کو اپنی ذات بھربھری مٹی کے کھلونے کی طرح ریزہ ریزہ ہوتی محسوس ہوئی پھر بھی اس نے ضبط کی انتہا کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہونا ہی ہے ایک دن۔"

"کیا؟...... کیا؟ یہ تم کہہ رہے ہو احتشام؟" وہ حیران ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں مریم! حقیقت پسند کر کر سوچو گی تو تم بھی یہی کہو گی، مگر آج اچانک تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میرے گھر والے میری بہت جلد شادی کروا رہے ہیں، کسی رئیس کے بیٹے کے ساتھ اور ان کے گھرانے میں عورتیں کسی پروفیشنل شعبے میں کام نہیں کرتیں اس لئے نہ تو وہ مجھے فائنل ایئر کا امتحان دینے دیں گے نہ ہی میں شہر میں رہوں گی، ان کا خیال ہے کہ نوکری کرنی ہی نہیں تو اب فائنل کا امتحان کیا دینا۔"

"اوہ...... پھر......؟" احتشام نے اپنے ڈولتے وجود کو سنبھالتے بمشکل کہا۔

"احتشام!" مریم نے جیسے درد کے سمندر میں ڈولتی کشتی کی طرح صدا دی۔

"دولت مند گھرانے میں پرورش پا کر بھی میں نے روایتی ماحول میں کوئی بڑا سپنا نہیں دیکھا نہ ہی کوئی انہونی خواہش کی، مگر میرا ایک ہی خواب تھا، ڈاکٹر بننے کا اور اب وہ خواب فقط چند قدموں کے فاصلے پر ہے کہ میری آنکھوں سے نوچا جا رہا ہے، اگر میں نے فائنل ایئر کا ایگزام نہیں دیا تو میری ساری عمر کی پڑھائی اور ریاضت بیکار جائے گی۔"

"اوہ! تو یہ بات تمہیں پریشان کر رہی ہے؟" احتشام نے جیسے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد تم ان لوگوں کو قائل کر سکو کہ وہ تمہیں ڈاکٹر بننے اور جاب کرنے کی اجازت دے دیں، اکثر لڑکیاں شادی کے بعد تعلیم مکمل کرتیں ہیں، ہماری کلاس میں ایک دو ایسی مثالیں ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو احتشام؟ جس سے میری شادی ہو رہی ہے وہ بہت کم تعلیم یافتہ ہے اور خالص جاگیردارانہ ذہنیت کا حامل ہے، پڑھانا یا نوکری کی اجازت دینا تو ناممکن ہے، وہ گاؤں میں رہتے ہیں اور مجھے بھی بڑی دیواروں والی حویلی میں قید کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر مریم! تمہارا بھائی ادا ندیم تو پڑھا لکھا اور کھلی ذہنیت والا شخص ہے، اس نے یہ فیصلہ کیسے قبول کیا؟"

"احتشام! ہم لوگ جب گاؤں چھوڑ کر شہر میں آئے تھے تو میرے بھائیوں اور ہم سب نے شہر کی ساری روایتیں اپنا لی تھیں اور اب وہ بظاہر تو بہت ماڈرن اور وسیع النظر لگتے ہیں مگر ان کے اندر بھی ایک جاگیردار زندہ ہے، انہوں نے اپنی ذہنیت تبدیل نہیں کی، ہم آج بھی روایت پسند ہیں اور رتوں اور رسموں کے پابند، ہمارے سماج میں مرد صرف یہ سوچتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں، عورتوں کی مرضی ان کے لئے آج بھی اہم نہیں، چاہے وہ کتنے ہی آزاد خیال اور ماڈرن نظر آئیں، ہاں...... میرا بھائی بھی براڈ مائنڈڈ ہے مگر صرف اپنی ذات کی خاطر، اسے ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے اپنی پسند سے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماڈرن لڑکی سے شادی کی جو اس کے ساتھ ہر جگہ قدم سے قدم ملا کر چل سکے، مگر بہن کے لئے

آج بھی وہی سوچ ہے کہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں خواہ مخواہ اپنی عمر گنواں دیتی ہیں، دوسری بات یہ کہ وہ اور بابا تو اپنے مفاد کی خاطر ہی تو مجھے قربان کر رہے ہیں۔"

"اوہ خدایا! آج کے زمانے میں بھی عورت کے ساتھ یہ سب ہو رہا ہے، تم جیسی تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی کے ساتھ یہ ظلم؟"

"احتشام! میں پڑھنا چاہتی ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا تو میری زندگی اندھیروں کے نظر ہو جائے گی، میں تباہ ہو جاؤں گی، میری شخصیت میری ہستی اور میری حیثیت جو میں نے تمام عمر کی محنت سے بنائی ہے ختم ہو جائے گی، میرا خواب ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔"

"مریم! خواب تو میرا بھی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔" احتشام کی آواز جیسے درد کے پاتال سے آئی۔

"تم سے ملا نہیں تھا تو جیسے کوئی خواہش ہی نہیں تھی، کوئی آدرش نہیں تھا، مگر اب تو ہر پل دل تمنا کرتا ہے کہ تم سدا ساتھ رہو۔"

"اتنا سب کچھ جاننے کے بعد بھی تم مجھے برباد ہوتا ہوا دیکھو گے؟ خدا کے واسطے مجھے اس جہنم میں جانے سے بچا لو ورنہ میں ختم ہو جاؤں گی، احتشام کچھ کرو، پلیز۔" احتشام نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا کر سکتا ہوں میں؟ مریم کیا کروں؟"

"کیا تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟ مجھے اپنی زبان سے یہ کہتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے مگر احتشام اس وقت میں خود کو مایوسیوں کے سمندر میں ڈوبتا ہوا محسوس کر رہی ہوں اور سامنے کنارے پر فقط تم ہی نظر آتے ہو جو مجھے ڈوبنے سے بچا سکتے ہو، تم میرا رشتہ مانگو تو شاید یہ فیصلہ ٹل جائے۔"

"مریم! یہ تم کہہ رہی ہو؟ جانتی بھی ہو کہ وہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کریں گے اس قدر نفرتیں ہیں ہمارے بڑوں کے بیچ، پھر صرف یہی نہیں دوسری رکاوٹیں بھی ہیں، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں اور تم نے ناز و نعمت میں پرورش پائی ہے، کیا دے سکتا ہوں میں تمہیں؟ کیا تم میرے ساتھ رہ پاؤ گی؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے احتشام! کیا تم مجھے نہیں جانتے؟ ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنیں گے، ڈاکٹر بننے کے بعد ہم ایک ساتھ بوجھ اٹھائیں گے ہم بہت اچھی زندگی گزاریں گے اور تمہیں مجھ سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔"

"جانتا ہوں مریم! تم بہت آئیڈیل لڑکی ہو اور مجھ سے بہت محبت بھی کرتی ہو مگر یہ بھی جانتی ہو کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔" مریم نے حیرت اور دکھ کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

"تو...... تم واقعی اس پرائمری پاس لڑکی سے شادی کرو گے؟ اور مجھے یوں ڈوبتے دیکھتے رہو گے؟"

میں رشتوں اور رسموں کے آگے بے بس ہوں، میں تو اس وقت بھی بے بس تھا جب میری بڑی بہن کے رشتے کے وٹے سٹے میں میرے بڑے بھائی کی شادی کرائی گئی۔ میں تو اپنے باپ سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ میری ماں ان پڑھ تھی تو اس میں اس کا یہ ہمارا کیا قصور تھا؟ وہ شہر چلا آیا اور اپنی جائیداد کے حصے سے نئی شہری بیوی اور بچوں کو خوشی اور آرام دہ زندگی دی؟ کیا وہ میری ماں، بہنوں اور بھائیوں کو بھی ان کا حق نہیں دے سکتا تھا؟ میرا کیا قصور تھا کہ میرے سوتیلے بہن بھائی تو بڑے پرائیویٹ اسکولوں اور کالج میں پڑھے مگر میرا بھائی جھلستی دھوپ میں ہل چلاتا رہا اور میری بہنیں میری خاطر سلائی کڑھائی کرتی رہیں،

میری تعلیم کے خاطر تو میں کیا انہیں اب مایوس کروں، مجھ پر قرض ہے ان کا۔"

"احتشام! میں تمہیں جانتی ہوں، تم کبھی بھی اس لڑکی کے ساتھ خوش نہیں رہ پاؤ گے، کیا رشتوں اور رسموں کی یہ دیواریں گر نہیں سکتیں؟"

"شاید نہیں...... کیونکہ ان کی جڑیں ہمارے معاشرے میں اتنی گہرائی میں ہیں کہ ہم دونوں کی کوشش بھی رائیگاں جائے گی۔"

وہ دونوں چپ ہو گئے جیسے کہنے کے لئے کچھ رہا ہی نہیں، مریم کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کو روکے ہوئے تھی، اس کی آنکھوں سے برسات کی آمد دکھائی دے رہی تھی، باہر کی برسات سے بھی تیز برسات اور احتشام خوفزدہ تھا کہ اگر یہ بارش اس کی آنکھوں کے بند توڑ کر برس پڑی تو اس کے سیلاب میں اس کا وجود ڈوب جائے گا، وہ تو اسے جھوٹی تسلی بھی نہیں دے پایا کہ وہ خود بے بس تھا اور دکھوں کی صلیب پر چڑھا شخص تھا۔

اچانک وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اپنا سفید گاؤن اور اسٹیتھو اسکوپ اٹھایا اور جانے لگی، جاتے جاتے مڑ کر ایک بار اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا جن میں کتنی التجائیں، آہیں، آسیں اور امیدیں تھیں، احتشام کا دل چاہا کہ دوڑ کر اسے روک لے اور تمام مجبوریاں اور رکاوٹیں پار کر کے اسے لے کر بہت دور چلا جائے، سکھوں کے دیس میں مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ندامت سے سر کو جھکا دیا، اس وقت اسے خود پر غصہ آیا اور اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی اور وہ، جو اس کی محبت تھی، زندگی تھی، اسے وہ خالی ہاتھ لوٹا رہا تھا، وہ اس کی جھولی میں کوئی بھی خوشی نہ ڈال سکا، وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔

وہ جو مریم کی طرح معصوم تھی، پھر بھی نظر نہ آئی، کچھ عرصہ بعد اس نے اس کی شادی کی خبر سنی، اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی، فائنل ائیر کے امتحان ہو گئے، احتشام ڈاکٹر بن گیا، اس کی بہن کی شادی ہو گئی اور وٹے سٹے میں اسے بھی شادی کرنی پڑی، وہ اپنی بیوی نوری کو اپنے ساتھ شہر لے آیا، زندگی سادہ تھی، نوری روایتی بیویوں کی طرح اس کے سارے کام کاج کرتی تھی، وقت پر کھانا دیتی، اس کے کپڑوں کا خیال رکھتی، اس کے کہے کو حکم سمجھ کر مانتی، سارے گھر کا کام مشین کی طرح کرتی، اسے دیکھ کر احتشام اکثر سوچتا کہ وہ عورت ہے یا روبوٹ، مگر جب بھی احتشام دن رات کی ڈیوٹی کے بعد بے حد تھک جاتا اور اس کے دل و دماغ بوجھل ہو جاتے اور اکثر دوسروں کی مسیحائی کرتے کرتے اس کی اپنی روح زخمی ہو جاتی تو اس کا جی چاہتا کہ وہ بہت ساری باتیں کرے، کسی کے ساتھ اپنے مسائل شیئر کرے، مگر آس پاس ایسی کوئی مہربان ہستی نہیں تھی، تب وہ بے مقصد سڑکوں پر پھرتا، پاگلوں کی طرح ہر چہرے کو دیکھتا اور سوچوں پر ہزار پہروں کے باوجود وہ مریم کو بہت یاد کرتا جو اپنے خوابوں کے ساتھ کب کی بڑی حویلی میں اپنے آدرشوں اور آرمانوں کی قبر میں دفن ہو چکی تھی، وہ اسے کبھی بھلا نہیں پایا، آج تک۔

☆☆☆

بینچ پر بیٹھے بیٹھے وہ ماضی کی یادوں میں گم تھا اور جب خیالوں کے سلسلے ٹوٹے تو وہ چونک گیا اور اسے احساس ہوا کہ رات ہو چکی تھی اور پارک تقریباً ویران ہو گیا تھا، اس نے لمبی سانس کھینچی اور بینچ سے اٹھا، اپنے بکھرے بالوں کو درست کیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف جانے والے رستے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

ایک ایک پل جیسے ایک صدی پر محیط ہو کر گزر رہا تھا رات کے سناٹے میں جھینگر کی آواز تک اس کی سماعت پر بم کی مانند لگ رہی تھی درختوں کی جھنڈ میں چاندنی بمشکل اس تک پہنچ پا رہی تھی اور اس ہولناک سناٹے اور وحشت ناک اندھیرے میں وہ کمزور اور نازک سی لڑکی تن تنہا سامنے قدرے اونچائی پر گزرتی سڑک پر نظریں جمائے اپنے وجود کو ایک درخت کے تنے میں چھپانے کی سعی کرتی جان کنی کے عالم سے گویا گزر رہی تھی، سوکھے ہونٹوں پر کوئی دعا بھی نہ ٹھہر پا رہی تھی اور دل کی دھڑکن تو گویا پورے وجود میں دھڑکتی ہوئی سنائی دے رہی تھی، وحشت بھرے انداز میں اس نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اگر کسی کو اس کی غیر موجودگی کی خبر ہو گئی تو اب تک کتے اس کے پیچھے چھوڑے جا چکے ہوں گے جو اس کی بو سونگھ کر یہاں تک بہت جلد پہنچ جائیں گے اور اس کے بعد اس کا کیا حشر ہوگا یہ وہ سوچنا بھی نہیں چاہ رہی تھی شاید وہ شکاری بھوکے کتے اس پر اسی وقت چھوڑ دیئے جائے یا پھر اس سے بھی بڑی کوئی اذیت ناک سزا، اتنا تو طے تھا کہ اسے صفائی کا کبھی موقع نہیں دیا جائے گا وہ ایک بہت بڑے جرم کی مرتکب ہوئی تھی کیوں اور کیا جیسے سوالات میں وہ لوگ بالکل وقت ضائع نہ کرتے وہ ان کی فرسودہ رسموں کو توڑنے کا جرم کر بیٹھی تھی تعلیم نے جو شعور دیا تھا اور جس کی بناء پر وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح آج اپنے لئے صحیح راہ کا انتخاب کر کے گویا اس نے ان کے رسموں کے بتوں کو توڑ ڈالا تھا اور بت شکن کو یہ دلوں پر مہر لگائے لوگ بھلا جینے کب دیتے ہیں۔

''آہ.....'' اپنے دونوں ہاتھ تیزی کے ساتھ لبوں پر رکھ کر اس نے بلند ہوتی اپنی چیخ

مکمل ناول

دبائی تھی درخت پر سے کوئی پرندہ چیخ مار کر اڑا تھا ایک سیکنڈ کے اندر اس کا پورا وجود پسینے میں نہا گیا تھا وحشت زدہ آنکھوں کے ساتھ اس نے پھر سڑک کے بائیں جانب دیکھا تھا۔

''یا اللہ میری مدد فرما، پلیز جلدی آجاؤ، اللہ اسے جلدی بھیج دے۔'' دل ہی دل میں اس نے مضطربانہ سی دعا مانگی تھی رات کے اس پہر دور تک جاتی سڑک بھی بس نیم جاں سی پڑی تھی گاؤں کو جانے والی یہ کمزور اور ناپختہ اکلوتی سڑک اس وقت بالکل سنسان پڑی تھی آدھی رات سے زیادہ وقت گزر چکا تھا بھلا اب کس نے ادھر آنا جانا تھا بے حد احتیاط برتنے کے باعث اس نے اپنا سیل فون آف کر رکھا تھا اس کی ہلکی سی سکرین سے آتی روشنی رات کے اندھیرے میں نمایاں ہو کر اس کی کھوج میں آتے اس کے خون کے پیاسے شکاریوں کو متوجہ کر سکتی تھی وہ اس وقت پوری طرح سیاہ لباس اور سیاہ چادر میں خود کو چھپائے ہوئے تھی۔

''اُف اللہ! وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں میں حق کی خاطر اپنی جان کو داؤ پر لگا کر نکلی ہوں مجھے تقدیر کے غلط ہاتھوں میں نہ سونپنا اسے میری زندگی کا ضامن بنا کر بھیجنا۔'' تبھی بائیں جانب سے آتی سڑک پر کسی کار کی ہیڈ لائٹس ایک دم سے جل کر بند ہوئی تھیں یہ اشارہ تھا ان دونوں کے درمیان طے ہوا تھا فوراً چادر سنبھالتی وہ تیزی سے درختوں سے نکل کر سڑک پر آئی تھی اور اسی تیزی سے دور کھڑی کار کی جانب دوڑ لگائی تھی۔

''چلو فوراً!'' فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس کی جانب دیکھے بغیر اس نے کہا تھا اور اِدھر اُدھر دیکھتی گھبراہٹ کے عالم میں چادر میں منہ چھپا کر سیٹ کے نیچے اپنے وجود کو چھپاتے ہوئے وہ بیٹھ گئی تھی گاڑی نے فوراً ٹرن لیا تھا اور جس راستے سے آئی تھی اسی راستے پر بے حد تیزی سے دوڑنے لگی تھی ٹوٹی پھوٹی سڑک کی وجہ سے اسے اچھے خاصے دھچکے لگ رہے تھے فرنٹ سیٹ کے اگلے خالی حصے میں دھان پان وجود کے ہونے کے باوجود خود کو چھپانا بے حد دشوار ثابت ہو رہا تھا لیکن زبان کو دانتوں تلے دبائے وہ عجیب سے انداز میں اپنے وجود کو ٹیڑھا میڑھا موڑ کر چھپی بیٹھی رہی۔

اس کے حواس جیسے تیز رفتاری کے ساتھ دوڑتی کار کے ساتھ دوڑے چلے جا رہے تھے دل کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی وہ اس وقت جیسے نہ کچھ دیکھ پا رہی تھی نہ سن پا رہی تھی بس ایک ہی خوف سوار تھا اگر وہ لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہوئے یا پھر انہوں نے آگے سے آ کر کار روک دی تو...... وہ بے حد خوف اور تناؤ کا شکار تھی نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اسی حالت میں۔

''اوپر ہو کر بیٹھ جاؤ اب تم خطرے سے باہر ہو شہر میں داخل ہو گئے ہیں ہم۔'' یہ آواز اسے اپنی سماعت کا دھوکہ لگی تھی تبھی اس نے سر اٹھا کر اتنی دیر سے خاموش ڈرائیونگ کرتے ہوئے انسان کی جانب دیکھا تھا اور پھر گویا اسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''تت...... تم؟'' وہ اس انہونی کے لئے قطعی تیار نہیں ایک قیامت اس کی منتظر تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اسے لینے آیا ہے کم از کم وہ اس کا نجات دہندہ ہرگز نہیں تھا بلکہ وہ ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو چکی تھی اس وقت اس نے خود کو کسی چوہے دان میں پھنسے ہوئے محسوس کیا تھا، بے بسی عروج پر تھی۔

☆☆☆

''یار پہلی کلاس سر سعید کی ہے اور وہ کافی سخت مزاج ہیں اپیا نے مجھے بہت سے قصے

سنائے ہوئے ہیں جب وہ یہاں پڑھتی تھیں۔"

جویریہ نے نوٹس بورڈ پر کلاسز شیڈول پڑھتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا اور وہ بس سر ہلا کر رہ گئی یہ اس کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا وہ ایم بی اے میں ماسٹر کرنے کا خواب لے کر آئی تھی۔

"خیر تمہیں کیا لگے تم تو ان کی مستقبل کی ذہین اور چہیتی سٹوڈنٹ بننے والی ہو وہ محنتی پر اعتماد اور ذہین سٹوڈنٹ کی بہت قدر کرتے ہیں۔" جویریہ نے اس کی صلاحیتوں کو تسلیم کرتے ہوئے کہا اور وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔

کلاس میں بیٹھے انہیں کچھ ہی وقت گزرا تھا جب سر سعید اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ ایک نوجوان کے ساتھ داخل ہوئے وہ ایک دراز قامت اور وجیہہ سا نوجوان تھا مگر اس کا حلیہ آج کل کی اس نوجوان نسل سے تعلق رکھتا تھا جو فرسٹریٹڈ ہے اور خود سے بھی خفا اور الم غلم فیشن اپنا کر خود کو نمایاں کیے ہوئے ہے اسے تو کم از کم یہی لگا تھا فرنچ ہیئر کٹ میں قدرے لمبے بال، مضبوط کلائیاں بہت سے بینڈز میں جکڑیں بائیں کان میں چھوٹا سا ایک نگ کا ٹاپس اور جینز کے نیچے اس کے سرخ شوز "تو یہ لڑکے اس رنگ کے شوز پہن کر کتنے چھچھورے لگتے ہیں۔" اس کے چہرے پر ناگوار سے تاثر ابھرے تھے اور مقابل نے جو بالکل اس کے سامنے بائیں سائیڈ والی کرسی پر بیٹھا تھا ایک سیکنڈ میں اپنے متعلق در آنے والی ہلکی سی ناپسندیدگی بھانپ لی تھی اور قدرے نظریں سکوڑ کر کندھے اچکاتے اسے دیکھا تھا، پروفیسر سعید کے کہنے پر تمام سٹوڈنٹس اپنا تعارف کروانے لگے تھے اور جب اس کی باری آئی تو وہ بیٹھے بیٹھے ہی چیونگم چباتا بولا تھا۔

"یہ تعارف ان کے لئے ہے جو آج پہلی دفعہ یونیورسٹی کا منہ دیکھ رہے ہیں مجھے سیفی کہتے ہیں آنرز کا سٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے میری یہاں پر کافی شہرت ہے میرے متعلق مزید معلومات چند ہی دنوں میں سب کو معلوم ہو جائے گی۔" اس کے خود پسند انداز پر سب نئے سٹوڈنٹس حیران ہو کر دیکھ رہے تھے مگر پروفیسر سعید نے اس کو مسکراتے ہوئے بس تنبیہی نظروں سے دیکھا تھا جس سے سب کو یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ انسان کتنا بھی بدتمیز ہو کم از کم اپنی کسی خوبی کی بناء پر اساتذہ کا پھر بھی چہیتا ضرور ہے۔

اور جب اس کی باری آئی تو وہ پر اعتماد انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے بولی تھی۔

"مائی نیم از ماہ نم بختاور اور میں......"

"ابسلیوٹلی رونگ Absolutely wrong۔" اس کی بات کاٹ کر سیفی بولا تھا۔

"سر ان کا نام Scientificly تو Wrong ہے ہی سننے میں بھی ناٹ گڈ ساؤنڈ۔" انداز چڑاتا ہوا تھا اور وہ چڑ بھی گئی تھی۔

"جی وہ کیسے؟" وہ اپنے ازلی اعتماد کے ساتھ کرسی پر بیٹھے چیونگم چباتے اس نوجوان سے پوچھ بیٹھی تھی اسے وہ بے حد برا لگا تھا خواہ مخواہ اور ہو رہا تھا لیکن اس کا اعتماد اسے مہنگا ہی پڑا تھا کم از کم پہلے ان پوری کلاس کے سامنے اپنا مذاق بنوانا اسے قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

"دیکھیے مس نم میرا مطلب مس ماہ نم میری اردو بہت اچھی تو نہیں لیکن جہاں تک میری معلومات ہے ماہ چاند کو کہتے ہیں اور نم raindrop اگر تو یہ فارسی میں ہے تو یہ Moon raindrop بنتا ہے اگر نیم فارسی میں بولا جائے اور اگر اسے عربی میں بولے تو num بولا جاتا ہے جس کا مطلب سلیپ ہوتا

ہے اور اس طرح یہ Sleep of the moon بنتا ہے سوان شارٹ Man کا مطلب Moon اور nam کا مطلب dew یا اردو میں نمی یعنی چاند پر نمی رائٹ اور آپ نے پوری دنیا کے سائنسدانوں کو کھلا چیلنج دے ڈالا کہ چاند پر نمی ہے ویری اسٹرینج۔'' اس کی وضاحت پر سبھی کے لبوں پر مسکراہٹ در آئی تھی ماسوائے ماہ نم کے کاش وہ بھی اسی طرح اس سیفی کے نام کے بخیے ادھیڑ سکتی سر سعید نے سیفی کو گھورتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا وہ ادھورے تعارف کے ساتھ بیٹھ تو گئی تھی مگر اسے سیفی پر بے انتہا غصہ بھی آیا تھا۔

''اس کے منہ مت لگنا ایک نمبر کا فلرٹ بندہ ہے اس کی بدنامی کے کئی قصے مشہور ہیں اپیا نے مجھے خاص طور پر اس سے بچ کر رہنے کی تاکید کی تھی پہلے لڑکیوں سے دوستی کرتا ہے محبت کا جھوٹا جھانسا دیتا ہے اور جب وہ اس کی محبت میں اندھی ہر حد پار کر جاتی ہیں تو دامن جھاڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے ایک لڑکی نے تو اس سے شادی کرنے کے لئے خودکشی تک کر ڈالی تھی پہلے اس سے دوستی کی خوب الو بنایا اور جب وہ شادی پر اصرار کرنے لگی تو یہ پیچھے ہٹ گیا تب اس نے اس کے نام خط لکھ کر نیند کی گولیاں کھالیں لیکن اس پر رتی بھر اثر نہیں ہوا تھا اپیا کی کلاس فیلو تھی وہ انہوں نے مجھے سختی سے اس کے سائے سے بھی دور رہنے کی ہدایت کی ہے اور یہی میں تمہیں دوں گی۔'' کلاس ختم ہونے پر جویریہ نے کینٹین کی طرف آتے اس کے متعلق بتایا تھا اور ماہ نم تو پہلے ہی دل میں اس لوفر بندے سے دور رہنے کی ٹھان چکی تھی وہ کسی بھی قسم کا اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتی تھی اس کے پپا کتنی مشکل سے پورے خاندان کی مخالفت مول لے کر پڑھا رہے تھے وہ یہ بخوبی جانتی تھی اور وہ ان کے اعتماد کو کسی قیمت پر ٹھیس نہیں لگا سکتی تھی۔

''لیکن وہ پروفیسر سعید بھی تو اسے کچھ نہیں کہہ رہے ورنہ اس کا جو Attitud تھا ٹیچر ہو کر وہ کیسے برداشت کر رہے تھے۔'' وہ جویریہ کے آگے اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر رہ نہیں پائی تھی جویریہ اس کی کالج کے زمانے سے اچھی دوست تھی اور ان دونوں نے اکٹھا یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا جویریہ کی بڑی بہن اپیا بھی اسی ڈیپارٹمنٹ سے پڑھ کر گئی تھی لہٰذا جویریہ کے پاس ان کے توسط سبھی معلومات موجود تھیں۔

''ہوں اپیا بتاتی ہیں بہت ذہین سٹوڈنٹ ہے اور اس کے فادر بھی بہت ویل آف اور اسٹیبلش بزنس مین ہے کافی ڈونیشنز دیتے رہتے ہیں شاید اس لئے۔'' جویریہ نے مزید بتایا اور وہ بس کندھے اچکا کر رہ گئی۔

اگلے چند روز تو کلاسز ٹائمنگ سمجھنے اور اٹینڈ کرنے میں گزرے پروفیسرز کے ساتھ تعارف ہوتے ہوئے گزرے ماہ نم بہت جلد یونیورسٹی کے ماحول میں ایڈجسٹ کر گئی تھی وہ ایک ذہین اور پراعتماد لڑکی تھی اپنے کالج میں بہترین مقررہ رہ چکی تھی وہ یہاں پر پڑھنے آئی تھی اور بس سبھی کو اس کے لئے دیئے انداز سے اندازہ ہو چکا تھا اس کی کسی کے ساتھ کوئی دوستی نہیں تھی ماسوائے جویریہ کے جو بے حد سوشل تھی اور تقریباً پوری کلاس سے دوستی بنا چکی تھی، ماہ نم کا فارغ وقت زیادہ تر لائبریری میں گزرتا اسے جویریہ کی طرح گروپس میں بیٹھ کر گپیں لگانے یا کینٹین میں انجوائے کرنا سے غرض نہیں تھی ایسے میں وہ تنہا لائبریری چلی آتی اور یوں اس کی دوستی کسی سے بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

☆☆☆

"تم...... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ عاصم کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آیا اور تمہیں کیوں بھیجا؟ یہ سب کیا ہے؟" گھبراتے ہوئے اس نے ایک سانس میں دو تین سوال کر ڈالے لیکن جواب ندارد تھا وہ سنجیدہ چہرہ لئے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے؟" وہ قدرے چلاتے ہوئے بولی تھی اس کی جان پر بنی تھی اور مقابل کا اطمینان قابل دید تھا۔

"تو......؟" اس کے یوں چلانے پر وہ بولا تھا جواب ان کے لئے غیر متوقع ہوتا جو اسے جانتے نہیں تھے وہ اپنی زندگی کو اس نئے عذاب سے دوچار کرنے کو تیار نہیں تھی جبھی غصے میں بولی تھی۔

"گاڑی روکو، ابھی اسی وقت، میں نے کہا گاڑی روکو۔" اعصاب پر قابو ہونے کے باوجود وہ جس چویشن سے دوچار تھی زیادہ دیر تک سکون کا مظاہرہ کرنا ناممکن تھا وہ پھر چلائی تھی ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے اس نے لاک کیا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی وہ چلتی گاڑی سے کودنے کا رسک لے سکتی تھی لیکن اس شخص کا ساتھ تباہی کے سوا کچھ نہیں تھا اسے اچھی طرح احساس تھا۔

"روکو گاڑی!" وہ پھر چلائی تھی۔

"جسٹ شٹ اپ، منہ بند کر کے آرام سے بیٹھو میں تمہیں عاصم کے گھر چھوڑ کر اپنی بقایا نیند پوری کرنا چاہتا ہوں ویسے بھی مجھے کوئی یوں کچی نیند سے جگا کر اس قسم کا بے ہودہ کام کرنے کو کہے تو میرے دماغ کو گرمی چڑھ جاتی ہے اور بقول تمہارے میں جاہل، گنوار، جانور یا ذہنی مریض ہوں تو پھر ایسی اعلیٰ صفات کے حامل شخص سے کیا توقع کی جا سکتی ہے ناؤ یو بیٹر نو اور ابھی ہم شہر میں داخل ہوئے ہیں آدھی رات کو اس سنسان سڑک سے تمہیں کوئی ٹیکسی نہیں ملے گی لہٰذا چپ چاپ منہ بند کر کے بیٹھو۔" دانت کچکچاتے ہوئے اس نے سخت چہرے سے اسے جھاڑ کر رکھ دیا تھا اور اپنی پوری توجہ پھر سے ڈرائیونگ پر مرکوز کر لی تھی اپنی بے بسی پر اسے شدید رونا آیا تھا قدرت ہر بار اس بدتمیز شخص کے ہاتھوں اس کی بے عزتی نہ جانے کیوں کرواتی تھی، گالوں پر پھسلتے آنسوؤں کو سختی سے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا اچانک اسے اپنے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کا خیال آیا تھا اسے آن کر کے اس نے تیزی سے عاصم کا نمبر ملایا تھا لیکن آگے سے فون آف جا رہا تھا۔

"یا اللہ!" وہ کراہ کر رہ گئی تھی اس صورت حال میں جب وہ اپنے پیچھے واپسی کی تمام کشتیاں جلا کر نکلی تھی صرف ایک شخص کے بھروسے جس کا نام عاصم تھا اور وہ اچھی طرح سے اس کے حالات سے واقف تھا ہر صورت اور زندگی بھر ساتھ نبھانے کا یقین دلایا تھا اور وہ اسی کے کہنے اور اسی کے بھروسے تو یوں رات کی سیاہی میں سیاہ نصیب کے ساتھ اس حویلی سے نکلی تھی اور اب اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا اور کوئی اس کا نمبر بھی نہیں تھا اور شخص سے کچھ بھی پوچھنا فضول تھا اب کی بار اس کے رونے میں اضافہ ہوا تھا چاہ کر بھی وہ خود کو رونے سے روک نہ پائی تھی۔

"مس نم صاحبہ آپ کے رونے سے مجھے غصہ آ رہا ہے اور اگر اس غصے میں میرے اندر کا جنگلی پن نکل آیا تو نتائج کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔" اب کی بار نہایت سرد لہجے میں اس نے تنبیہ کی تھی اور وہ جلدی سے آنسوؤں کو صاف کرتی نچلا لب دانتوں سے کچلتی باہر دیکھنے لگی تھی رات کے اس پہر تمام شہر تقریباً سویا پڑا تھا یہ علاقہ

ویسے بھی کم گنجان آباد تھا وہ دعا کرنے لگی تھی کہ عاصم کا گھر جلد از جلد آ جائے اور اس کی اس نئی مصیبت سے جان چھوٹے۔

☆☆☆

''افوہ کیا مصیبت ہے پرے کرو اسے جب میں تیار ہو رہی ہوتی ہوں تم اسے میرے کمرے میں مت لایا کرو۔'' دو سال کے خوبصورت سے بچے کو وہ خود سے پرے دھکیلتے ہوئے نخوت سے آیا سے کہا گیا تھا۔

''نہیں...... نہیں مما پاس جانا۔'' آیا کی بانہوں میں آ کر وہ مچلا تھا لیکن مسز زیبا کو اپنے نئے ہیر اسٹائل اور ساڑھی کی فال خراب ہونے کا خدشہ تھا انہوں نے معصوم سے بچے کا رونا خاطر میں نہ لاتے ہوئے فوراً آیا کو اسے باہر لے جانے کا اشارہ کیا تھا۔

''اختر...... اختر!'' نک سک سے تیار ہاتھ میں چھوٹا سا گولڈن پرس پکڑے وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھیں ساتھ ہی انہوں نے ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے آوازیں دی تھیں۔

''جی بیگم صاحبہ!'' وہ مودب سے کچن سے برآمد ہو کر پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔

''اختر میری ایک فرینڈ کے گھر پارٹی ہے، صاحب آئے تو بتا دینا میں رات دیر سے آؤں گی کتنی بار ان کے آفس فون کیا ہے مگر وہ آفس سے باہر گئے ہوئے ہیں کھانا گرم کر کے دے دیجئے گا اور بابا کو بھی ایک بار دیکھ لیجئے گا ویسے تو آیا کھلا کر وقت پر سلا دے گی مگر آپ پھر بھی چیک کر لینا۔'' کھڑے کھڑے انہوں نے ہدایات جاری کی تھیں اور وہ بس مودب سا سر اثبات میں ہلاتے چلے گئے تھے، وہ اس گھر کے پرانے ملازم تھے اور نک چڑھی بیگم انہیں بہت حقیر گردانتی تھیں۔

''اف توبہ آج کس پر بجلی بن کر گرنے کا ارادہ ہے اس ساڑھی میں تو تم قیامت لگ رہی ہو اللہ زیبا کہیں سے نہیں لگتا کہ تم شادی شدہ ہی نہیں ایک بچے کی ماں بھی ہو۔'' اس کی دوست نے پارٹی میں آئی زیبا سے گلے لگتے ہوئے کہا تھا سلیولیس کافی کھلے گلے والے بلاؤز کے ساتھ شیفون ریڈ کلر کی ساڑھی جس کے باڈر پر گولڈن ستاروں کا کام تھا کا پلو لہراتے ہوئے وہ ایک ادا سے بل کھائی تھیں۔

''آؤ تمہیں شکیل سے ملواؤں میرا کزن ہے بہت بڑا بزنس مین ہے آفس اس کا دوبئی میں ہے۔'' پنکی اس کا ہاتھ پکڑے لوگوں کی گیدرنگ میں راستے بناتی آگے بڑھی تھی۔

''شکیل ان سے ملو، میری بیسٹ فرینڈ زیبا۔''

''ہیلو!'' شکیل نامی نوجوان نے آنکھوں میں ستائش بھرے مسکرا کر کہا تھا۔

''ہائے!'' وہ ایک ادا سے بولی تھیں ان کی آنکھوں میں بھی شکیل کے لئے ستائش ابھری تھی اتنا ہینڈسم مرد اس نے پہلی بار ہی دیکھا تھا دولت اور حسن اسے قدرت نے فراوانی سے نوازا تھا بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا اسے۔

''بھئی آپ لوگ باتیں کریں میں ذرا دوسرے مہمانوں کو دیکھ لوں۔'' پنکی دوسری جانب بڑھ گئی تھی۔

''سرخ رنگ میرا کبھی فیورٹ نہیں رہا لیکن یہ آپ پر اس قدر اچھا لگ رہا ہے کہ آج کے بعد میں اسے شاید ہی ناپسند کر سکوں۔'' شکیل نے مسکراتے ہوئے تعریف کی تھی۔

''اوہ شکریہ۔'' وہ دھیمے سے ہنسی تھیں۔

بہت جلد وہ آپس میں گھل مل گئے تھے وہ ایک بذلہ سنج اور بے حد خوبصورت گفتگو کرنے والا دلچسپ انسان تھا سارا وقت وہ اس کے حسن

کے قصیدے پڑھ پڑھ کر اسے محفوظ کرتا رہا اور عورت تو تعریف کی بھوکی ہوتی ہے اس کے شوہر نے آج تک اس کی بے تحاشہ حسن کو اتنے خوبصورت لفظوں کے ساتھ نہیں سراہا تھا آج کی دعوت زیبا کے لئے یادگار بن گئی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

☆☆☆

"عاصم کا گھر آ گیا ہے۔" گاڑی ایک بنگلے کے سامنے جھٹکے سے روکتے ہوئے اس نے کہا تھا یہ ایک کشادہ مگر سنسان سڑک تھی جس کے دونوں اطراف گھر بنے ہوئے تھے وہ جانتی تھی یہ عاصم کا گھر ہے ایک بار جب اس کی بہن کی شادی تھی وہ سب کلاس فیلوز آئے تھے ایک جھٹکے سے اتر کر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ تک پہنچی تھی اور بیل ڈور بجائی تھی بنگلے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا ایک بار پھر بیل ڈور بجاتے جب اس کی نظر گیٹ پر لگے بڑے سے تالے سے ٹکرائی تو اسے ایک اور شدید جھٹکا لگا تھا وہ تیزی سے پلٹ کر واپس آئی تھی اور وہ جو اسے گیٹ کے پاس چھوڑ کر گاڑی سٹارٹ کرنے لگا تھا اسے واپس آتا دیکھ کر سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"تت...... تالا...... تالا لگا ہوا ہے۔" تھوک نگلتے ہوئے وہ ہکلائی تھی۔

"واٹ؟" وہ فوراً گاڑی سے باہر نکل کر گیٹ تک پہنچا تھا آثار واضح تھے کہ گھر میں کوئی موجود نہیں لیکن عاصم نے اسے اپنے گھر لانے کو ہی کہا تھا اس نے جلدی سے موبائل پر عاصم کا نمبر ملایا مگر وہ بند جا رہا تھا اسے کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔

"گاڑی میں بیٹھو جلدی؟" وہ تیزی سے گاڑی کی جانب آیا تھا رات کے اس پہر لڑکی کے ساتھ پا کر کوئی بھی مشکوک ہو سکتا تھا اور پھر پولیس تو اسے مواقع کی تلاش میں ہوتی ہے وہ گاڑی میں آ بیٹھی تھی اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے عاصم کے متعلق وہ کیا سوچے اور کیا نہیں خیالات منتشر ہو چکے تھے وہ نڈھال سی بے جان ہو کر سیٹ سے سر ٹکا کر یونہی بیٹھ گئی صبح کا صرف ایک توس کھا رکھا تھا سارے دن تو روتے ہی گزرا تھا اس نے بے حد کوشش کی تھی کہ اس جال میں نہ پھنسے جو اس کے اردگرد سازش کے ساتھ بنا گیا تھا وہ اس جال میں پھنسنے سے تو فرار ہو کر بچ گئی تھی لیکن اب اس نئی افتاد کا کیا کرتی بے بسی ہو کر اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

"بیٹا یونیورسٹی کیسی جا رہی ہے؟" بختاور صاحب نے ماہ نم کے ہاتھ کے بنے کیک کی پلیٹ اس سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"ایک دم فرسٹ کلاس۔" چائے کا کپ ان کے قریب میز پر رکھتے ہوئے وہ بولی تھی وہ اس وقت اپنے چھوٹے سے لان میں شام کی چائے پی رہے تھے کافی دنوں بعد پپا اس وقت گھر پر موجود تھے ورنہ کاروبار کے سلسلے میں چند مہینوں سے وہ بہت بزی تھے اور دن رات کا فرق مٹائے ہوئے تھے۔

"باپ کا کاروبار فرسٹ کلاس جا رہا ہے بیٹی کی یونیورسٹی فرسٹ کلاس جا رہی ہے اور ماں کا انتظار بھی فرسٹ کلاس جا رہا ہے۔" زینب بیگم نے چائے پیتے ہوئے ہلکا سا شکوہ کیا تھا وہ اکیلی گھر میں بور ہو جاتی تھیں کام تو وہ نمٹا کر وقت پر فارغ ہو جاتی تھیں تین لوگوں کا کام ہی کتنا تھا ماہ نم یونیورسٹی میں آدھا دن گزار کر گھر آ کر بھی اسائمنٹس یا پڑھائی میں مصروف رہتی تھی آج کل وہ مما کو زیادہ وقت نہیں دے پا رہی تھی، اس لئے

تنہائی سے وہ کچھ خائف ہوگئی تھیں۔
''ہوں کچھ دن اور ملک کے جو حالات جا رہے ہیں اس میں چھوٹا موٹا کاروبار چلانا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔'' کافی دنوں سے پریشان بختاور صاحب نے آخر کار کہا تھا۔
''پپا کوئی پرابلم ہے؟'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ بولی تھی۔
''ارے نہیں بیٹا جنرل بات کر رہا ہوں، بوڑھا ہوگیا ہوں ناں بس تم جلدی سے ماسٹر کرلو تو یہ کاروبار تمہارے حوالے کر کے ہم دونوں میاں بیوی ورلڈ ٹور پر نکل جائیں گے اور ساری زندگی کا شکوہ کہ وقت نہیں میرے لئے آپ کے پاس کو دور کر ڈالوں گا۔'' بیوی اور بیٹی کے چہرے پر یکدم پریشانی کے آثار ابھرتے دیکھ کر وہ ہشاش بشاش ہوتے بولے تھے۔
''واہ کیا بات ہے شادی نہیں کرنی بیٹی کی؟'' زینب بیگم ان کے پلان پر بولی تھیں۔
''ارے کیوں نہیں کرنی مگر ہماری ایک ہی تو اولاد ہے اس کاروبار کو بھی تو اسی نے سنبھالنا ہے۔''
''جیسے حویلی والے یہ سب کرنے دے گے اتنی مشکل سے تو آپ اسے پڑھا رہے ہیں ورنہ ہمارے خاندان میں لڑکی کی تعلیم وہ بھی یونیورسٹی تک ناممکن آگے ہی وہ سب آپ سے خفا رہتے ہیں۔'' زینب نے پھر لب کشائی کی تھی۔
''جانتا ہوں لیکن میں اس کے حق کے لئے آخری دم تک لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہوں اور اس میں مجھے کبھی کسی کی خفگی کی پرواہ نہیں رہی گلناز کا فون آیا، بیٹا آپ نے کیا پھپھو کو فون؟'' آخر میں انہوں نے بات کا رخ بدلا۔
''جی پپا ٹھیک ہیں وہ یاد کر رہی تھیں ہم سب کو چھٹیاں ہوگی تو آنے کا کہا تھا میں نے۔''
پھپھو کے ذکر پر وہ قدرے افسردہ سی بولی تھی۔
''ساری عمر یہ دکھ رہے گا میں اسے اس عذاب سے بچا نہیں پایا میرا شعور، میری تعلیم اچھے برے کی تمیز میری بہن کے کام نہیں آسکی اپنے اور تمہارے لئے تو میں ڈٹ گیا لیکن اس کی دفعہ میں کچھ بھی نہ کر پایا اور وہ ایک ظالم رسم کی بھینٹ چڑھ گئی۔'' ان کے لہجے میں پچھتاوا در آیا تھا۔
''آپ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے انہوں نے آپ کی غیر موجودگی میں یہ سب اسی لئے کیا تھا۔'' زینب نے انہیں تسلی دینا چاہی ماحول ایک دم ہی افسردہ اور بوجھل ہوگیا تھا بختاور جو پہلے ہی کافی پریشان سے تھے بہن کے ذکر پر دل مزید بوجھل ہوگیا تھا اور شام ان تینوں کے ساتھ چپ چاپ خاموش سی ڈھلتی چلی گئی تھی وہ تینوں اپنے ہی خیالات میں گم صم بیٹھے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

''یہ لے لیں۔'' کسی نے تیزی سے پن اس کی جانب بڑھایا تھا اور اس نے بھی بلا تامل پکڑ کر پروفیسر ذاکر کا لیکچر نوٹ کرنا شروع کردیا تھا۔
''تھینک یو۔'' کلاس ختم ہونے پر اس نے بائیں سیٹ پر بیٹھے سٹوڈنٹ کو پن واپس کرتے ہوئے کہا تھا اچانک اس کے بال پوائنٹ کی سیاہی ختم ہوگئی تھی جبھی اس نے اپنا پن اسے دیا تھا۔
''لائبریری چلیے، ابھی سے اس اسائنمنٹ پر کام شروع کریں گے تو وقت پر دے پائیں گے۔'' اس نے پن واپس لیتے ہوئے پوچھا تھا پروفیسر ذاکر نے تین تین سٹوڈنٹس کا گروپ تشکیل دیا تھا جس میں ماہ نم، عاصم اور سیفی کا بھی

گروپ تھا جسے سن کر ماہ نم کافی جز بز ہوئی تھی سر ذاکر کافی سخت مزاج تھے اور اصول پسند بھی کسی بھی غلط بات پر وہ کھڑے کھڑے کی بے عزتی کر کے رکھ دیتے تھے پھر وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ مقابل لڑکا ہے یا لڑکی وہ اپنا گروپ چینج کرنے کا بھی نہیں کہہ سکتی تھی عاصم پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا کہ وہ کلاس کا کم گو، سلجھا ہوا اچھا سٹوڈنٹ تھا مگر سیفی؟ اس سے وہ جتنا بچتی تھی اتنا ہی اس سے ٹکراؤ ہوتا تھا کلاس میں ان دونوں کی ٹاپک پر بحث ہونا لازمی ہوتا تھا وہ جس ٹاپک پر اتنی محنت سے ریسرچ کر کے ڈسکس کرنے لگتی وہ کوئی نہ کوئی نقطہ پکڑ کر اسے غلط ثابت کرنے کھڑا ہو جاتا اور اکثر غلط ثابت کر بھی دیتا وہ اس کے بدتمیز انداز پر خائف ہو جاتی تھی ورنہ وہ جتنی اچھی مقررہ تھی اسے ہرانا اتنا آسان نہیں ہوتا تھا مگر اول روز سے اس سے دامن بچا کر چلنے والی پالیسی کی وجہ سے وہ جلد ہی خاموش ہو جاتی وہ جانتی تھی کہ وہ اسے جان بوجھ کر چڑاتا ہے اور بولنے پر اکساتا ہے خواہ مخواہ فری ہونے کی فضول حرکتیں لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ کافی ذہین تھا جنرل نالج غضب کی تھی۔

پروفیسر کے لیکچر اس نے کبھی نوٹ کرتے نہیں دیکھا اس کے باوجود اسائمنٹس اور پرزینٹیشنز غضب کی ہوتی تھیں کبھی لائبریری تک نہیں جاتے دیکھا تھا اسے لیکن ٹیسٹ میں نمبر اسی کے پورے ہوتے یہاں تک کہ بعض دفعہ کلاس میں وہ پروفیسر سے ایسے ایسے سوالات کرتا جن کا جواب وہ ٹھیک طرح سے نہ دے پاتے اس لئے سر سعید اور خود سر ذاکر ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ سیفی کی وجہ سے وہ اپنے لیکچر کی بھرپور تیاری کر کے آتے ہیں وہ اس کی ذہانت کو سراہتے تھے اور ماہ نم حیران ہوتی تھی کہ محض ذہانت کی وجہ سے اس کا Attitude، بدتمیز، خودسر اور لاپرواہ انداز وہ کیسے برداشت کر جاتے ہیں۔

''ٹھیک ہے۔'' کتابیں سمیٹ کر وہ مختصر بولی تھی او عاصم کے ساتھ لائبریری چلی آئی تھی اس نے تو سیفی سے کچھ ڈسکس کرنا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی مدد لینی تھی عاصم کا بھی یہی انداز تھا لہٰذا ان دونوں نے ہی مل کر اسائمنٹس بنائی اس دوران سیفی یونیورسٹی بہت کم آیا اس نے بھی ان سے سر ذاکر کی اسائمنٹ کے متعلق کچھ نہیں پوچھا حالانکہ وہ جان چکا تھا۔

''کیا ہم اپنی محنت پر صرف اس کا نام ہی شامل کریں گے اور وہ مفت میں واہ واہ کرائے گا۔'' اسائمنٹ جمع کرانے سے پہلے ماہ نم نے عاصم سے پوچھا۔

''نہیں ہرگز نہیں اگر اس نے ہم سے ایک بار بھی اسائمنٹ کا نہیں پوچھا تو ہم اس کا نام کیوں شامل کریں گے اور یہ اتنا مشکل ٹاپک ہے کہ جب تک دو تین لوگ مل کر اس پر کام نہ کریں کمپلیٹ ہونے والا نہیں وہ خود ہی پروفیسر ذاکر کو اپنی Excuse دے گا یا جیسے اس کی مرضی۔'' عاصم کے جواب پر اسے طمانیت کا احساس ہوا تھا۔

لیکن اس وقت انہیں حیرت ہوئی جب سیفی نے اپنی اسائمنٹ تنہا بنا کر جمع کروا دی بلکہ کروا چکا تھا اور اس کی اسائمنٹ بہترین قرار پائی تھی ماہ نم کو بہت عجیب اور نہ جانے کیوں برا لگا تھا، نہایت ہی مغرور انسان تھا۔

☆☆☆

''لو بھئی زیبا میں نے کیمرے میں فلم ڈلوا لی ہے آج شام پارک میں جا کر تمہاری اور اسفند کی خوب تصویریں بناؤں گا۔'' تک سک تیار ہوتی بیگم سے وہ بولے تھے۔

''او نو ڈارلنگ آج میری دوست کی برتھ ڈے پارٹی ہے مجھے وہاں جانا ہے۔'' وہ فوراً انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی تھیں۔

''لیکن آج جمعہ ہے میں نے آفس کا کام جلدی نبٹا لیا تھا کہ چھٹی کا دن ہے بس ایک ضروری کام تھے وہ کر کے آ گیا شاف کو تو جمعے کی چھٹی تھی۔'' انہوں نے بتایا۔

''ویل تم تو جمعے کی بھی چھٹی نہیں کرتے، مجھے کیا معلوم آج جلدی آ جاؤ گے۔'' انہوں نے لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''بس یار کاروبار بڑھانے کی کوشش میں ہوں اور کاروبار کو جب تک دن رات وقت نہ دو، محنت نہ کرو قیمت وصول نہیں ہوتی میں جانتا ہوں کچھ عرصے سے مصروف رہ کر میں تم دونوں کو پوری توجہ نہیں دے پا رہا اسی وجہ سے پروگرام بنایا اور اب کوشش کروں گا کہ ہر جمعے پوری چھٹی تم لوگوں کے ساتھ منا سکوں۔'' بیڈ پر لیٹے انہوں نے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تھا۔

''اسفند بھی کافی عرصے سے ہمارے ساتھ آؤٹنگ پر نہیں گیا اسے ہماری زیادہ توجہ اور وقت کی ضرورت ہے ایک آیا بھلا وہ سب کیسے کر سکتی ہے جو ایک ماں کا فرض ہے۔''

''مجھے میرا فرض یاد دلانے کی ضرورت نہیں تمہارے اصرار پر ہی وہ اس دنیا میں آیا ہے ورنہ میں تو ابھی بچوں کے جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتی تھی ساری عمر پڑی ہے، پل رہا ہے وہ اور اگر تمہیں زیادہ مسئلہ ہے تو دو اس کو ٹائم اتنے عرصے بعد اگر میرا پروگرام بن ہی گیا ہے فنکشن میں جانے کا تو اسفند نام کی زنجیر ڈالنا چاہ رہے ہو تم مجھے نہ جانے تمہاری اس مڈل کلاس سوچ کا میں کیا کروں۔'' وہ اچانک ہی چیخ گئی تھی لپ اسٹک کو زور سے ڈریسنگ ٹیبل پر پٹختے ہوئے وہ بولی تھی اور وہ اس کا یہ ردعمل دیکھ کر حیران رہ گیا تھا وہ اپنے بچے کا ذکر کس انداز میں کر رہی تھی۔

''ماں ہو تم اس کی۔'' انہوں نے احساس دلانا چاہا۔

''تو تم بھی باپ ہو اس کے۔'' جواب دوبدو آیا تھا۔

''بیگم صاحبہ اسفند بابا کو کھانسی زکام سے بخار آیا ہے کافی بے چین سا ہے۔''

''تو مجھے کیوں بتا رہی ہو اس کا باپ بھی یہیں پر ہے اسے بتاؤ۔'' وہ نہایت بدتمیزی کے ساتھ یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکلتی چلی گئی تھی اور صاحب اس کی حرکت پر خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئے تھے لیکن رات کو ان دونوں کے جھگڑے کی آوازیں بیڈ روم سے باہر نکل کر پورے گھر میں گونج رہی تھیں نوکر اب صاحب اور بیگم کے جھگڑوں کے عادی ہوتے جا رہے تھے لیکن وہ چھوٹا سا بچہ وہ کیسے ایڈجسٹ کرتا اس معصوم کو کیسے سمجھایا جا سکتا تھا اختر نے کھانسی سے بے حال بچے کو اپنی گود میں لے کر ٹہلتے ہوئے افسردگی سے سوچا، آیا اب تک اسے سنبھال کر تھک چکی تھی اور اس کے انداز میں بیزاری در آئی تھی جبھی اس نے اسفند کو اپنی گود میں اٹھا لیا کبھی کبھی ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی بچے ماں باپ کی بھرپور توجہ اور پیار سے محروم رہ جاتے ہیں اور ایسے بچے بدنصیب کہلاتے ہیں نہ جانے اس معصوم بچے کا نصیب کیسا تھا؟ وہ بس سوچ کر رہ گئے تھے کہنے کو تو وہ اس گھر کے پرانے ملازم تھے لیکن ان کی وفاداری کی بناء پر صاحب اور ان کے والد بھی ان پر کافی بھروسہ رکھتے تھے اور گھر کا تمام نظام وہی سنبھال رہے تھے زیبا کے آنے کے باوجود۔

☆☆☆

"شٹ!" انجان منزل کی جانب رواں دواں وہ ڈرائیونگ کے دوران بار بار عاصم کا نمبر ٹرائی کر رہا تھا مگر آف جا رہا تھا اور اس لڑکی سے کچھ بھی پوچھنا وہ اپنی ہتک سمجھتا تھا۔

"عاصم سے مجھے ایسے رویے کی امید نہ تھی، کہاں پھنسا دیا، اب اس بلا کو لے کر کہاں جاؤں؟" وہ اب قدرے پریشان ہونے لگا تھا۔

تمام راستے وہ بس نیم جاں سی چپ چاپ بیٹھی رہی تھی۔

"آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔" والا معاملہ ہوا تھا اس کے ساتھ، گاڑی ایک بڑی سی عمارت کے گیٹ کے پاس جا کر رکی تھی۔

"اترو۔" گاڑی کا ڈور لاک کھولتے ہوئے اس نے قدرے سخت لہجے میں اسے کہا تھا۔

"ک...... کہاں...... میں...... میں نہیں اتروں گی۔" اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس نئی افتاد سے کیسے نمٹے۔

"دماغ خراب ہے کیا؟ ساری عمر گاڑی میں بیٹھی رہو گی، یہ ہمارا آبائی گھر ہے یہاں کاکا جان رہتے ہیں بہت نیک اور بھروسہ مند انسان ہیں، میں تمہیں ان کی تحویل میں دے کر واپس شہر اپنے فلیٹ پر چلا جاؤں گا عاصم کو آج رات ہی ٹریس کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا ہو گی اور اس کے لئے میں تمہیں اپنا دم چھلا بنائے لے کر نہیں گھوم سکتا، تم ایک دفعہ کاکا جان سے مل لو وہ تمہیں قابل اعتبار لگیں گے۔" آخری جملہ اس نے قدرے جتا کر ادا کیا تھا۔

"اب یہاں مراقبے میں بیٹھنے کی بجائے نکلو جلدی کرو۔" ایک ہی پوزیشن میں گم صم بیٹھے دیکھ کر اسے کوفت ہوئی تھی۔

چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر وہ اس کی سنگت میں بڑے سے گیٹ کے پاس آن رکی تھی۔

رات تیسرے پہر میں چپ چاپ داخل ہو چکی تھی کوٹھی پر خاموشی کا راج تھا ظاہر اس وقت سب محو استراحت تھے تبھی ہاتھ میں پکڑے موبائل پر وہ کوئی نمبر ملا کر کال کرنے لگا تھا یقیناً وہ اپنے کاکا جان کو فون کر رہا تھا تاکہ اٹھ کر وہ گیٹ کھلوا سکے ساتھ ہی اس نے ڈور بیل بھی دو تین بار بجائی تھی تبھی اچانک ایک گاڑی بڑی تیزی کے ساتھ ان کی گاڑی کے پیچھے آ کر رکی تھی گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں وہ دونوں اچانک بے حد نمایاں ہوئے تھے۔

وہ سرعت سے پلٹا تھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے "شٹ" نکلا تھا ماہ نم بھی گھبرا سی گئی تھی کوئی بہت تیزی سے گیٹ کا دروازہ کھول کر ان کی جانب آیا تھا۔

"دنیفی تم؟ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" اور وہ نووارد نے اس کی جانب سرسری نظر ڈالی تھی مگر وہ قدرے چونکا تھا۔

"جی وہ ڈیڈ!" ایک پل کو تو اسے بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ کیا کہے۔

"تمہیں اس وقت اپنے فلیٹ پر ہونا چاہیے، یہاں کہاں گھوم رہے ہو، جاؤ برکت کے ساتھ فلیٹ پر چلے جاؤ۔" اب کی بار لہجے میں تنبیہ اور غصہ ابھرا تھا۔

"یہ وہ نہیں ہے ڈیڈ ایشو کچھ اور ہے۔" اسے یہی مناسب لگا کہ سب سچ بتا دے اور وہ قدرے نروس سی اپنے سامنے کھڑی بارعب شخصیت کو دیکھ رہی تھی حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کہیں سے سفر کر کے پہنچے ہیں سوٹ بوٹ میں ملبوس وہ شخص کچھ پراسرار سا لگا تھا۔

"دو فلائٹس بدل کر اور کار میں لمبا سفر کر کے یہاں اس لئے آیا تھا کہ سکون کی نیند لے

لوں، I am two tired میں بہت تھکا ہوا ہوں، لیکن تمہارے یہ نت نئے ایشوز، گیٹ کھلواؤں اندر چل کر بات کرتے ہیں، جلدی کرو۔" تھکن زدہ لہجے میں کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی جانب پلٹ گئے تھے اور سیفی نے کاکا جان کا سیل فون پھر ملایا تھا فون ملنے پر اپنے آنے کی اطلاع دے کر گیٹ کھولنے کا کہا تھا چند ہی لمحوں میں گیٹ کھول دیا گیا تھا اور دونوں گاڑیاں تیزی سے محل نما کوٹھی میں داخل ہوتی چلی گئیں تھیں وہ بھی سیفی کے کہنے پر دوبارہ گاڑی میں آن بیٹھی تھی۔

☆☆☆

"واٹ؟ آر یو میڈ، تم...... تم اتنے بے وقوف کیسے ہو سکتے ہو؟" سیفی کی بات سنتے ہی وہ اچھل ہی تو پڑے تھے۔

"تم جاؤ اپنے کمرے میں، میں اس لڑکی سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے خود کو کول ڈاؤن کرنے کی ناممکن کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن پریشانی اور غصہ ان کے ہر انداز سے چھلک رہا تھا ایک بزرگ آدمی نے جلدی سے گلاس میں فریج سے بوتل نکال کر پانی ڈال کر انہیں دیا۔

"کاکا کسی دن اس لڑکے کی حرکتوں سے یا تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا یا پھر میں خود کو شوٹ کر لوں گا۔" ان کی بات پر وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا اور دھپ دھپ کرتے دائیں طرف بنا زینہ چڑھتا چلا گیا تھا۔

ماہ نم اس کے یوں اکیلا چھوڑ جانے پر بے حد گھبرا اٹھی تھی وہ جو اس کی موجودگی سے ہمیشہ ایک بے نام کوفت اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جاتی تھی آج اس کی غیر موجودگی اس کے لئے پریشانی کا باعث بنی تھی وہ محسوس ہی نہ کر سکی آج وہ اس کی موجودگی میں اتنی کریٹیکل چویشن میں قدرے پرسکون تھی، اسے اپنے آپ پر حیرت اور غصہ بیک وقت آیا تھا۔

"ماہ نم تم اتنی کمزور کب سے ہو گئی کہ اس جیسے شخص کی موجودگی تمہارے لئے باعث سکون بننے لگے۔" اس نے دل میں خود کو سرزنش کی تھی۔

"اب تم بتاؤ اصل کہانی کیا ہے اور دیکھو جھوٹ کی ایک رتی بھی تم نے شامل کی اپنی کہانی میں تو میری طرف سے کسی رحم کی امید مت رکھنا صرف تمہارا سچ ہی تمہیں بچا سکتا ہے ورنہ تمہاری لاش کہاں غائب ہو گی اور کیسے یہ تمہیں تو یقیناً پتہ نہیں چلے گا مگر تمہیں ڈھونڈنے والے بھی تمام عمر کھوج نہ لگا سکیں گے۔" ان کے سفاکانہ انداز پر اس نے نظر اٹھا کر ایک پل انہیں دیکھا تھا۔

"کاکا کیا سیفی یہاں پر بھی لڑکیاں لانے لگا ہے؟ مگر یہ اس کے ٹیسٹ کی تو نہیں ہے۔" انہوں نے پاس کھڑے مودب کاکا سے سوال کیا تھا اور ان کی بات کا مطلب جان کر سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو گیا تھا رواں رواں سلگ اٹھا تھا احساس توہین سے اور پھر اعتماد سے وہ بولتی چلی گئی تھی۔

بے حد غصہ سے بات شروع کر کے آخر میں وہ بے حد رنجیدہ ہو چکی تھی اس نے واضح طور پر بتایا تھا کہ اس کے سیفی کے متعلق کیا احساسات ہیں اور عاصم کے متعلق بھی کچھ نہیں چھپایا تھا اور نہ ہی اس کا ماضی تاریک تھا جسے وہ اپنی سیاہ چادر کے پلو میں باندھ کر سب سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی لہٰذا وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

اس کی پوری بات سن کر ان دونفوس کو سانپ سونگھ گیا تھا، معاملہ جتنا وہ گھمبیر سمجھ رہے تھے یہ اس سے کئی گناہ خطرناک اور الجھا ہوا تھا عزت اور زندگی داؤ پر لگ چکی تھی انہیں ایک پل

میں ہی برسوں سے کمائی عزت وقار خاک نشین ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"کاکا میرے سیکرٹری اختر کو فون کریں اسے کہے کہ میرے ذاتی وکیل احسان صاحب اور ایک نکاح خواں کے ساتھ فوراً یہاں پہنچے فوراً۔" ان کے لہجے سے سرسراتے جملے برآمد ہوئے تھے جنہیں سن کر جہاں کاکا ساکت وجود میں حرکت آئی تھی وہیں اس کا وجود ساکت ہوا تھا۔

"اگر تو تم سچ کہہ رہی ہو تو تم بہت بہادر لڑکی ہو۔"

"صاحب درالامان......" وہ اسے مخاطب ہی ہوئے تھے جب کاکا نے پلٹ کر کہنا چاہا۔

"نہیں کاکا اب یہ ممکن نہیں سیفی اس معاملے میں انوالو ہو چکا ہے وہ لوگ چھوڑنے والے نہیں اور اگر میڈیا ان کی جانب ہو گیا تو سمجھے ہمارا دیوالیہ نکل جائے گا ساکھ کا، عزت کا ہمیں مالی ہی نہیں ذاتی بھی بہت بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا شاید جس کا تمام عمر ازالہ نہ ہو سکے میں جیسے کہہ رہا ہوں فوراً ویسا کریں۔" ہاتھ اٹھا کر انہوں نے کاکا کو بات پوری کرنے سے روکتے ہوئے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا اور کاکا بات سمجھ کر فوراً پلٹے تھے۔

"تمہارا اور سیفی کا نکاح ہوگا ابھی اور اسی وقت۔" ان کی بات سن کر اسے لگا تھا کہ بھاری بھرکم فانوس سے سجی چھت اس کے سر پر آن گری ہو وہ جوان کی باتوں سے اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ اس کے اور عاصم کے نکاح کا فوری انتظام کر رہے ہیں سیفی کا نام سن کر ایک پل کو اس کے اعصاب مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔

"عاصم! عاصم سے۔" کپکپاتے لبوں کے ساتھ وہ بمشکل بول پائی تھی اس کے لٹھے کی مانند سفید چہرے کو دیکھ کر بے حد غصہ اور گھبراہٹ محسوس ہونے کے باوجود جیسے انہیں اس پر ترس آیا تھا ورنہ تو ان کا دل چاہ رہا تھا کہ سامنے بظاہر نازک سی لیکن بدنامی اور بربادی کو سونامی اپنے اندر چھپائے یہ اس لڑکی کا گلہ دبا کر اپنی جانب بڑھتے ہوئے طوفان کا خاتمہ کر ڈالے۔

"میرا تجربہ اور مشاہدہ مجھے بتا رہا ہے کہ عاصم بزدل نکلا ہے وہ تمہیں بیچ راہ میں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور بزدل ہمیشہ کمینہ ہوتا ہے تبھی اپنی مصیبت کسیفی کے گلے ڈال کر خود نجات حاصل کر لی ہے، لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ نکاح صرف کاغذی نکاح ہے اگر عاصم سامنے آ جاتا ہے اور تمہیں اپنانے کا ویسے ہی دعوی دار ہے جیسے وہ خود کو ظاہر کرتا ہے تو سیفی سے طلاق دلوا کر میں خود تمہارا ہاتھ عاصم کے ہاتھ میں دوں گا تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا ہو گا۔" اور پھر وہ ہر بات تفصیل سے اسے سمجھاتے چلے گئے تھے وہ ذی شعور تھی ان کی باتوں کو وہ سمجھ بھی رہی تھی اور اس کے دل کو لگ بھی رہی تھیں وہ ایک بارعب شخصیت کے حامل تھے لیکن اس وقت ان کا دوستانہ رویہ اس کے اعصاب کو پرسکون رکھے ہوئے تھا مگر جب نام سیفی کا آتا تو اس کا حلق تک کڑوا ہو جاتا اور پھر سیفی ان کی بات پر عمل کرتا ہے اور نکاح کو محض کاغذی نکاح ہی رکھتا اس کی کیا گارنٹی وہ مر کر بھی اس پر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔

"اگر وہ دنیا کا آخری انسان ہو اور اسے اس پر بھروسہ کرنا پڑے، مدد مانگنی پڑے تو بھی وہ ایسا نہ کرے۔" اس نے دل میں سوچا۔

"کاکا سیفی کو بلا کر لائے نہیں۔" انہوں نے اچانک کاکا کو مخاطب کیا۔

"دیکھ کر آیا تھا بابا سوئے پڑے ہیں۔"

کا کا نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔
''تو پھر جگا کر اسے یہ ساری صورت حال بتا کر لے آئیں، وہ لوگ بھی پہنچتے ہی ہوں گے۔'' کا کا خاموشی سے سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے اور ماہ نم کے پاس خاموشی سے رونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

☆☆☆

کا کا نے اسے جگاتے ہی ماہ نم اور اس کے نکاح کی فوری اطلاع دی تھی گہری نیند میں سے اگر کوئی اسے جگائے تو وہ نہایت چڑچڑا اور بد دماغ ہو جاتا تھا کا کا کو بخوبی اندازہ تھا اس کے متوقع ردعمل کا تن فن کرتا ہوا وہ نیچے آیا تھا۔
''دماغ ٹھیک ہے آپ کا، سوچا بھی کیسے آپ نے یہ سب، میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا اور اس سے تو مر کر بھی نہیں اگر یہ دنیا کی آخری لڑکی ہو تو بھی آپ ایسی بے ہودہ بات سوچ بھی کیسے سکتے ہیں اور میرے مسئلے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت ہی کیا ہے، یہ میری پرابلم ہے اور آج تک میں نے اپنی پرابلمز خود ہی حل کی ہیں آپ سے مدد مانگی ہیں جو خدائی فوجدار بن رہے ہیں یہ عاصم کے لئے بھاگ کر آئی ہے صبح تک پتہ چل جائے گا اس کا پھر یہ جانے اور وہ۔'' اتنا بدتمیز لہجہ اور اتنا گستاخ انداز اور آخری جملہ سن کر ماہ نم کا غصے سے برا حال ہو گیا دل میں اس کے لئے پہلے ناپسندیدگی اور بڑھی تھی۔
''یہ عاصم کے لئے بھاگ کر آئی ہے تو تم اسے بھگا کر کیوں لائے ہو عاصم کہاں ہیں؟'' ماہ نم کو ان کے سوال پر نہیں بلکہ ان کے نارمل انداز پر حیرت ہوئی تھی صوفے پر بیٹھے نہایت پرسکون لہجے میں سوال پوچھا گیا تھا، اس کے گستاخانہ انداز پر تو انہیں بھڑک ہی اٹھنا چاہیے تھا مگر ان کا انداز کافی سرد تھا۔
''انکل میں عاصم کے لئے بھاگ کر نہیں آئی میں......''
''میں نے تم سے کچھ پوچھا یہ ان دونوں کا معاملہ تھا تم بیچ میں کیا کر رہے ہو؟'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر ماہ نم کو بولنے سے روکتے ہوئے اس بپھرے ہوئے سانڈ سے پوچھا۔
''عاصم نے مجھے آٹھ بجے فون کر کے اسے لانے کو کہا تھا۔'' اکھڑے انداز میں جواب آیا۔
''اور تم لینے چل پڑے، سبزی منڈی سے سبزی لانے کی درخواست کی تھی جو یوں منہ اٹھا کر چل پڑے۔'' ان کے طنزیہ انداز پر اس کی کان کی لوئیں سرخ ہوئی تھیں۔
''میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟'' غصے سے مٹھیاں بھینچتے اس سے انہوں نے سوال دہرایا تھا۔
''جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا میں آپ کو، مجھے یہ نکاح نہیں کرنا اور بس اور میں اب سونے جا رہا ہوں کوئی ڈسٹرب نہ کرے مجھے۔'' بدتمیزی سے جواب دیتا وہ آگے بڑھا اور ماہ نم پریشان خاموش تماشائی بنی بس یہ سب کاروائی دیکھنے پر مجبور تھی اس کے انکار پر اسے قدرے سکون محسوس ہوا تھا۔
''تو ٹھیک ہے صبح تمہیں کا کا نہیں بلکہ پولیس جگانے آئے گی اور تم جو اپنے آج تک ہر پرابلمز خود ہی حل کرتے چلے آئے ہو کم از کم میرے ساتھ شرط لگا لو کہ اس وقت اسے مسئلے کو نہ تم حل کر سکو گے نہ تمہارا باپ۔'' ان کی بات پر اس کے بڑھتے ہوئے قدم تھم سے گئے تھے۔
''سیفی بات کو ٹھنڈے دماغ سے سنو اور سوچو۔'' انہوں نے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی اور ساتھ ہی کا کا کی جانب دیکھا

تھا۔
"بابا! صاحب ٹھیک کہہ رہے، بچی کا معاملہ ہے اور کافی خراب صورت حال ہے اس کا صحیح حل ابھی نکالنا ضروری ہے۔" کاکا نے آگے بڑھ کر نرمی سے سیفی کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا نظریں جھکائی ماہ نم نے انہیں نظر اٹھا کر دیکھا تھا کاکا جان کا انداز اڑیل گھوڑے کی پیٹھ تھپکا کر اسے رام کرنے کا سا تھا۔
"آ جاؤ بیٹا صاحب کی بات کو سن لو۔" انہوں نے اسے پھر آمادہ کرنا چاہا۔
"دیکھو سیفی یہ کافی خطرناک صورت حال ہے اسے نظر انداز ہرگز نہیں کیا جا سکتا، میری عزت ہی نہیں تمہاری زندگی بھی داؤ پر لگ چکی ہے وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح بو سونگھتے ہوئے یہاں پہنچے گے اور لڑکی کو یہاں پا کر جو پولیس کیس بنے گا اس سے نجات میری ساری دولت اور اثر رسوخ خرچ کر کے بھی تمہیں حاصل نہ ہو گی میرے ساتھ تعاون کرو اور مجھے بتاؤ کہ عاصم نے تمہیں کیوں کہا اسے وہاں سے لانے کو جبکہ ان دونوں کے درمیاں یہ طے پایا تھا کہ ٹھیک ایک گھنٹے بعد عاصم جا کر بتائی مطلوبہ جگہ اسے اپنے ساتھ لا کر فوراً نکاح کرے گا یہ معاملہ ان دونوں کا تھا تم کہاں سے بیچ میں آ گئے؟"
شروع سے ماہ نم کے دماغ میں آئے سوال کو انہوں نے زبان دی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جس نوعیت کے ان کے تعلقات تھے وہ کبھی سیدھے طریقے سے اصل بات نہیں بتائے گا، ملک بختاور نے سنگل صوفے پر ٹکے سیفی سے بات کا آغاز کیا وہ اس وقت جس طرح اپنے ہیجان، غصے اور پریشانی کو قابو کیے تحمل سے اس سے بات کر رہے تھے یہ وہی جانتا تھا۔
"بتاؤ ناں بابا ہم سب بے حد پریشان ہیں۔" کاکا جان نے نرم لہجے میں اسے بولنے پر اکسایا تھا وہ پاس ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔
"عاصم نے مجھے تقریباً رات نو بجے فون کیا تھا وہ بے حد پریشان اور گھبرایا ہوا تھا اور بہت عجلت میں بھی تھا اس نے مجھے بس اتنا کہا کہ یہ وقت اس کے احسان اتارنے کا ہے اس نے مجھے مطلوبہ جگہ بتائی اور وقت کہ اس سڑک پر جا کر میں کار کی ہیڈ لائٹ جلا کر فوراً بند کر دوں اشارہ پا کر ماہ نم آ جائے گی وہ مشکل میں ہے اور عاصم نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس مشکل میں اس کا ساتھ دے گا اور پھر فوراً اس کے گھر چھوڑ جاؤں آگے وہ جانے اور ان کا کام بس مجھے تو اسے لانا ہے اس نے مجھے یاد دلایا تھا کہ میں نے اسے کہا تھا کہ جب کبھی بھی ضرورت پڑی وہ مجھے ضرور بتائے میں دل سے اس کے احسان کا بدلہ اتارنا چاہتا ہوں گھبرائے ہوئے اس نے مجھے بھی بار بار یاد کروایا اور واسطہ دیا کہ بس میں یہ کام کر دوں بس جانا ہے اور لانا ہے تو میں چلا گیا۔" سیفی نے کندھے اچکاتے ہوئے بتایا ماہ نم نے اس کے لاپرواہ انداز پر قدرے حیرانگی سے اسے دیکھا ایک احسان اتارنے کے لئے وہ اپنی جان مشکل میں ڈال رہا تھا اس کا شاید اسے ادراک ہی نہ تھا۔
"عاصم خود کیوں نہیں لینے گیا؟" ملک بختاور نے سنجیدہ تاثرات سے سوال دہرایا تھا۔
"کیا تم نے اس سے یہ پوچھا نہیں؟" انہوں نے ایک اور سوال جڑا تھا۔
"پوچھا تھا، بے وقوف نہیں ہوں میں، اس نے بتایا کہ اس کے گھر میں سے کسی نے شاید اس کی بہن یا ابو نے ماہ نم کے ساتھ فون پر ہونے والی گفتگو سن لی تھی جس میں وہ اس سے سارا پلان ڈسکس کر رہا تھا کس وقت، کس جگہ پر پہنچنا

ہے، کیسے آنا ہے اور نکاح کرنا ہے وغیرہ وغیرہ اور اس وقت وہ لوگ اسے باہر نہیں نکلنے دے رہے تھے اب بھی بڑی مشکل سے وہ واش روم میں آ کر مجھے کال کر رہا تھا۔"

"ہوں تو پھر اس کے گھر تالا کیوں لگا ہوا تھا، تو اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ متوقع مصیبت سے بچنے کے لئے عاصم کو لے کر گھر سے نکل گئے ہیں۔" خود ہی سوال کر کے انہوں نے خود ہی جواب دیا تھا سوال کا مقصد ان دونوں کو موجودہ صورت حال سے آگاہی دینا تھا ماہ نم کا سیفی کے منہ سے عاصم کے متعلق جان کر دل ایک بار ڈوبا تھا لگتا تھا جس ناؤ میں سوار ہو کر جس طوفان کا مقابلہ کرنے چلی تھی اسی میں چھید نکلا تھا۔

"کاکا دیکھ رہے ہیں آپ۔" انہوں نے آہ بھرتے ہوئے نہ جانے کاکا جی کو مخاطب کر کے کیا باور کرانا چاہا۔

"میں نے فاروق اور وکیل کو بلایا ہے بس آنے ہی والے ہیں چند گواہوں کی موجودگی میں تمہارا نکاح ہو جائے گا اور پھر ایک جنگ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جانا ہمیں میڈیا کو ہر حال میں اپنا حامی بنانا ہے اس وقت یہی ایک ہتھیار ہمیں یہ جنگ جتوا سکتا ہے اس کے لئے یہ سب ضروری ہے کیوں کہ ماہ نم کے گھر والے اپنے علاقے میں کافی اثر رسوخ رکھتے ہیں اور پھر فرسودہ روایات پر جان دینے والے ہیں معاملہ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو گا انہیں جب تک یہ باور نہ کرا دیا جائے کہ ہم ان کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں اور طاقت میں ان سے زیادہ ہیں میں اپنے ایک دو صحافی دوستوں کو بھی بلا رہا ہوں، ایک کا تو تعلق بڑے مستحکم نیوز چینل سے ہے اور ایک اخبار کا ایڈیٹر ہے وہی اس بات کو کامیاب بنائیں گے سب آنے ہی والے ہیں مجھے ان کے سامنے یہ شادی نہیں کروں گا والا ڈرامہ نہیں چاہیے جانتا ہوں میں تمہیں عمر بھر شادی نہیں کرنی یہ شادی نہیں کاغذی کاروائی ہے محض ایک کاغذی اور وقتی تعلق نکاح کے باوجود تمہارا ماہ نم سے کوئی تعلق نہیں ہو گا یہ ماہ نم کی بھی ڈیمانڈ ہے اور مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ تم دونوں اس تعلق کو قائم رکھنے پر تیار نہیں میرا کنسرن صرف یہ ہے کہ میں اس نکاح کے بل بوتے پر ہی تم دونوں کے ساتھ ساتھ اپنی عزت کو بچا سکتا ہوں۔" انہوں نے گویا بات ختم کر دی تھی۔

ماہ نم کی خواہش جان کر اس نے کافی روکھے اور طنزیہ انداز میں ماہ نم کی جانب دیکھا تھا اتفاق سے اسی وقت ماہ نم نے بھی اسے دیکھا اور نظریں جھکا لیں وقت نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے ورنہ وہ کبھی بھی اس شخص کا نام اپنے نام کے ساتھ قبول نہ کرتی۔

اور پھر جیسے باقی کی کاروائی ایک فلم تھی جو ماہ نم کے سامنے چل رہی تھی وہ سب لوگ آ چکے تھے ملک بختاور نے انہیں سب کچھ بتایا تھا اور ان سب کی متفقہ رائے بھی تھی کہ نکاح کر دیا جائے تاکہ قانون سے بچنے کا ٹھوس ثبوت موجود ہو اور پھر مولوی نے نکاح پڑھا نہ جانے تین بار کیسے اس نے اثبات میں سر ہلایا ہر بار سر جھکانے پر اس کی گردن پر بھاری سل کا نادیدہ بوجھ بڑھتا چلا گیا تھا نکاح کے بعد وہ سب لوگ باری باری رخصت ہوتے چلے گئے تھے وہ جب سے آئی تھی ایک ہی پوزیشن میں کب سے سنگل صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی، صبح سے بھوک، خوف اور گھبراہٹ کے ساتھ پے در پے بدلتے حالات نے اس کے اعصاب کو بے حد کمزور کر ڈالا تھا سیفی ابھی تک اس کے بائیں ہاتھ رکھے صوفے پر چپ سا بیٹھا

تھا یہ چپ کسی طوفان کا پیش خیمہ ہو گی کون جانے۔

"کاکا ماہ نم کو ان کا روم دکھا دیں یہ کافی تھک چکی ہو گی۔" ملک بختاور نے کاکا جان سے کہا کاکا جان کے اشارے پر بمشکل چکراتے سر کے ساتھ اس نے خود کو کھڑا کیا، لیکن کھڑے ہوتے ہی اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا اور بہت زور کا چکر آیا اس سے پہلے کہ وہ دھڑام سے گر جاتی سیفی نے سرعت سے اٹھ کر اسے تھام لیا تھا اور وہ بے ہوش ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔

☆☆☆

ہم جس وجاں بچا کے تو لے آئے تھے ضرور
دل پر مگر لگی تھی جو وہ ضرب کاری تھی

آنکھیں کھولتے ہی اس نے ایک پر تعیش کشادہ کمرے کے جہازی بیڈ پر خود کو دراز پایا کچھ لمحے لگے تھے اسے سمجھنے میں کہ وہ کہاں اور کیوں ہے یونہی کمرے پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے بائیں جانب راکنگ چیئر پر نیم دراز سوئے ہوئے سیفی پر اس کی نظر ٹھہری تھی اور سچویشن کا ادراک ہوا اس نے کمرے سے بھاگ جانا چاہا تھا وہ بے حد ڈر گئی تھی تبھی اٹھ کر کمرے سے نکلنے کے ارادے سے تیزی سے اٹھنے کی کوشش میں اس کی بلند کراہ نکل گئی تھی اس کے جسم نے اس کو سوچ کر ساتھ دینے سے گویا انکار کر دیا تھا اسے بے حد کمزوری محسوس ہوئی تھی سر بھی چکرا گیا تھا وہ خود کو بیٹھنے کے قابل بھی نہ کر سکی تھی۔

سیفی اس کی آہ سن کر فوراً اٹھ گیا تھا جلدی سے اس کے بیڈ کے پاس آیا ماہ نم اسے قریب پا کر متوحش زدہ ہوئی تھی اور آنکھوں میں خوف نمایاں ہوا تھا۔

"کاکا جان..... کاکا جان، اسے ہوش آ گیا ہے کھانے پینے کا کچھ کریں۔" اچانک اسے بنا کچھ پوچھے یا کہے وہ پلٹا اور کاکا جان کو آوازیں دیتا دھڑام سے دروازہ اپنے پیچھے بند کرنے کے نہ جانے کہاں چلا گیا۔

"بدتمیز، جنگلی!" دروازے کے یوں بند کرنے پر وہ بس بڑبڑا کر رہ گئی۔

"آ گیا بیٹا ہوش! شکر ہے اللہ کا، اب کیسی طبیعت، یہ سوپ بنوایا ہے تھوڑا سا پی لو تمہاری کمزوری دور ہو جائے گی انشاء اللہ۔" کاکا جان نے سرہانے کے قریب کھڑے شفقت سے کہا اور ساتھ ہی کھڑی ملازمہ کو بھی اشارہ کیا۔

"صفیہ بیٹا، بی بی صاحبہ کو بٹھا کر سوپ پلا دو شاباش پھر ڈاکٹر نے جو دوائی تجویز کی ہے اس کی خوراک دینی ہے۔" کاکا نے پاس کھڑی ملازمہ کا نام لیتے ہوئے ہدایت جاری کی۔

"دوائی کا تو سیفی بابا کو پتہ ہو گا جی، جب سے بی بی بے ہوش تھی وہ یہیں پر بیٹھے رہے ہلے تک نہیں اور اب کدھر چلے گئے۔" ملازمہ بے حد باتونی اور موقع کی پرواہ کیے بغیر بولنے والی لگی تھی۔

ماہ نم کو، صفیہ نے جلدی سے سوپ کا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور تکیہ بیڈ کراؤن کے ساتھ لگا کر ماہ نم کو قدرے ٹیک لگا کر بٹھانے میں مدد کی اور پھر پاس بیٹھ کر اسے نیم گرم سوپ پلانے لگی۔

کاکا نے بیڈ کے پیچھے موجود بڑی سی گلاس ونڈو کے دبیز پردے کھسکائے اور دن کی نرم سی روشنی نے کمرے میں آ کر ماہ نم کے اعصاب کو سکون دیا اس کے بعد وہ خاموشی سے راکنگ چیئر پر آن بیٹھے۔

ماہ نم نے تقریباً سوپ کا سارا پیالہ ختم کر ڈالا اسے اپنے اندر توانائی سی اترتی محسوس ہوئی۔

"صفیہ سیفی بابا سے کہو کہ آ کر ڈاکٹر کی بتائی

دوائی کی خوراک کا بتا دیں۔" کا کا نے فارغ ہوتی صفیہ سے کہا نہ جانے کیوں ماہ نم کو لگا جیسے وہ جان بوجھ کر سیفی کو بلا رہے ہوں ورنہ خوراک کے بارے میں اس کے پاس جا کر پوچھ کر بھی اسے دی جا سکتی تھی، نیم دراز ہی اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

سیفی کی اندر آتے ہی اس پر نظر پڑی بڑی آنکھوں پر لمبی پلکیں گرائے وہ نیم دراز تھی۔ لمبے بالوں کی چوٹی بیڈ سے نیچے ڈھلکی پڑی تھی اور بہت سی لٹوں نے اس کے چہرے کا احاطہ کر کے اسے کی چہرے پر معصومیت اور بے پروائی کو نمایاں کر ڈالا تھا خود سے بے نیاز اس کا چہرہ بے حد زرد اور وہ بے حد کمزور لگی تھی۔

سیفی کی آواز پر اس نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں اور بیڈ پر جھٹ ادھر ادھر دوپٹے کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی اپنی دائیں سائیڈ پر تکیے کے پاس دوپٹہ پا کر اس نے جلدی سے اپنا سر ڈھکا تھا سیفی نے اچھی نظر سے یہ ساری کاروائی دیکھی تھی اور پھر خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔

"بیٹا آپ آرام کرو ڈاکٹر نے آرام کرنے کی ہدایت کی ہے یہ دوائیاں بھی کمزوری اور اعصاب کو پرسکون رکھنے کے لئے ہیں اللہ کرم کرے گا صفیہ آپ کے پاس ہی موجود ہے۔"

صفیہ کی مدد سے دوائیاں کھا کر وہ لیٹ گئی تھی اور کا کا جان اسے آرام کی تلقین کرتے کمرے سے چلے گئے تھے، بند آنکھوں کے پیچھے گزشتہ گھنٹوں کے واقعات چلنے لگے تھے۔

"پھپھو کا پتہ نہیں کیا حال ہے؟ کہیں وہ سب انہیں میرے کیے کی سزا نہ دینے بیٹھ جائیں وہ بے چاری تو آگے ہی اتنی بڑی سزا جھیل رہی ہیں اور وہ تو بس مجھے اس عذاب اور تمام عمر اس سزا سے بچانے کی قصوروار ہیں یا اللہ میری اور پھپھو کی مدد فرمانا ہماری مشکلات کو تو ہی دور کر سکتا ہے۔" وہ دل میں دعا گو تھی پھر نقاہت کے باوجود صفیہ کی مدد سے اٹھ کر وہ وضو کر کے اپنے رب کے آگے سربسجود ہو گئی تھی اور صفیہ نے اس کمزور، نازک سی لڑکی کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھا تھا سیفی جو اپنا موبائل وہیں بھول گیا تھا کمرے میں اسے نماز پڑھتے دیکھ کر خاموشی سے پلٹ گیا تھا موبائل لے کر، اس کے اپنے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے جس لڑکی کو وہ سخت ناپسند کرنے لگا تھا آج خود کو اس کی مدد کرنے پر مجبور پا رہا تھا، اپنی بے بسی پر اسے یکدم پھر غصہ آیا تھا اگر ان دونوں کے بیچ وہ ناگوار واقعہ نہ ہوا ہوتا تو شاید وہ اس سے اس قدر بدگمان نہ ہوتا وہ عورت ذات سے نفرت کرتا تھا بے وفائی اس کی گھٹی میں شامل تھی اور آج ماہ نم نے یوں گھر سے نکل کر عاصم کے ساتھ حاصل کرنے کے لیے اس کے خیالات کو مزید مستحکم کر ڈالا تھا اس کا جی چاہا تھا کہ اس بے وفا خود غرض عورت کا گلہ دبا دے لیکن وہ ایسا کر نہیں پایا تھا کوشش کے باوجود بھی اسے اپنے احساسات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کمرے میں آ کر وہ ڈرنک کرنے لگا تھا ہمیشہ سے وہ اس حرام چیز میں پناہ لینے کی کوشش کرتا تھا اور اب بھی وہ ایسا ہی کر رہا تھا ماہ نم کے اقدام نے اس کے زخم ادھیڑ ڈالے تھے اس کی آنکھوں میں ماضی کی کریہہ یادیں چلنے لگی تھیں کانوں میں بدصورت آوازیں گونجنے لگی تھیں تبھی وہ گلاس پر گلاس چڑھاتا چلا گیا تھا اور دھت ہو کر وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ ناخوشگوار واقعہ ان کے بیچ فائنل ائیر میں پیش آیا تھا ماہ نم کی بہت کم اپنے فیلوز کے ساتھ دوستی ہونے کے باوجود وہ عاصم کو اپنا دوست مان

چکی تھی وہ ہمیشہ اس کے کام آیا تھا اور یہ سب کرتے ہوئے اس کے انداز میں سوائے دوستی اور خلوص کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا عموماً گروپ اسائنمنٹس میں وہ اکٹھے ہوتے تھے وہ اس پر اعتبار کرنے لگی تھی عاصم بھی دوستوں کے معاملے میں کافی Chossi تھا چند ایک لڑکوں سے اس کی دوستی تھی وہ کافی پڑھا کو ٹائپ کا تھا اور سیفی کے تو سائے سے بھی بدکتا تھا بقول اس کے لوہار کی دوستی میں ایک آدھ چنگاری سے دامن خراب ہی ہوتا ہے اور بعض اوقات تو پورا دامن جل جانے کا خطرہ ہوتا ہے، اس معاملے میں ان کی رائے ایک تھی سیفی تو اسے جب بھی نظر آیا کسی نہ کسی نئی لڑکی کے ساتھ ہی نظر آیا۔

''تو یہ...... یہ شخص اتنے کپڑے نہیں تبدیل کرتا ہوگا جتنی لڑکیاں۔'' یونہی کینٹین میں بیٹھے سامنے کی ٹیبل پر سیفی کو کسی نئی لڑکی کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اس نے سوچا تھا آج جویریہ کو اس نے ٹریٹ دی تھی جو اپنی مرضی کا آڈر دینے گئی تھی آج اس کا یونیورسٹی میں لاسٹ ڈے تھا اس کی شادی ہو رہی تھی اور شادی کے فوراً بعد اسے اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا چلے جانا تھا وہ اپنی پڑھائی بیچ میں چھوڑ کر جا رہی تھی جس کا اسے چنداں افسوس نہیں تھا ماہ نم کا اس کا جتنا بھی وقت گزرا بہت اچھا گزرا تھا اس لئے آج وہ اسے ٹریٹ دینا چاہ رہی تھی جبھی عاصم بھی کینٹین میں داخل ہوا اور سیدھا ان لوگوں کی میز کی جانب چلا آیا اسے بھی معلوم تھا جویریہ کے متعلق اور وہ بھی ان کی چھوٹی سی پارٹی میں شریک ہو گیا۔

''تو یہ ہے جویریہ تمہیں ذرا بھی افسوس نہیں اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑنے پر۔'' جویریہ جو مسلسل چہک رہی تھی اور کینٹین میں موجود سٹوڈنٹس کے بارے میں عجیب و غریب کمنٹس دے کر ان لوگوں کو مسلسل ہنسنے پر مجبور کر رہی تھی ماہ نم نے ہنستے ہوئے اسے ٹوکا۔

''ہاں بالکل۔'' عاصم نے بھی جھٹ ہاں میں ہاں ملائی۔

''لو افسوس کس بات کا اتنی پڑھائی کے بعد بھی تو وہی ہانڈی چولہا ہی کرنا ہوتا ہے اور میں تو کینیڈا جا رہی ہوں وہاں کے تو اور ہی مزے ہوں گے کیوں عاصم تم لڑکوں کو بھی کتنی محنت کر کے باہر جانا نصیب ہوتا ہے اور میں تو آرام سے......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ کھلکھلائی تھی اور وہ بھی مسکرا پڑے۔

''اب اسے ہی دیکھو اپنی وجاہت کو خوب کیش کرا رہا ہے لڑکیوں میں عاصم کیا یہ شروع سے ہی ایسا ہے؟ تمہاری تو سنا ہے کافی دوستی ہے اس کے ساتھ۔'' جویریہ نے سیفی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا ماہ نم کی نظر اس کی جانب گئی تو اسی وقت سیفی نے بھی اسے دیکھا۔

''ہاں یہ ایسا ہی ہے دوستی تو بس میری اتنی نہیں ہے لیکن یہ شروع سے ہی ہیرو بننے کا شوقین پرائی لڑائیوں میں بھی کود پڑتا ہے جب ہم لوگ یہاں آئے تو اس کی ایک گروپ کے ساتھ پھڈا ہو گیا تھا تب اس نے نیا نیا جم جوائن کیا تھا مسلز دکھانے کے چکر میں جھگڑا بڑھ گیا تھا اور پھر میں بھی اس کے ساتھ خواہ مخواہ اس جھگڑے میں گھسیٹ لیا گیا تھا تب سے میں نے اس سے دوستی کم کر لی تھی ہیلو ہائے تو اب بھی ہے لیکن اس کی سرگرمیاں۔'' عاصم نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اور پھر بات بڑھائی۔

''حیرت تو مجھے ان لڑکیوں پر ہے جو اس کے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس پر مرتی ہیں، لیٹ نائٹ پارٹیز، ڈرنک کرنا، فضول کا ہلا گلہ مچائے رکھنا اور کئی گرلز فرینڈز۔'' عاصم نے

اس کی خوبیاں گنوائی تھیں۔
''ان سب فضولیات کے باوجود وہ ہر سال ٹاپ کرتا ہے اور تمام پروفیسرز کا چہیتا بھی ہے۔'' جویریہ بولی تھی۔
''پیسہ بولتا ہے مس جویریہ پیسہ اگر ہمارے پاس بھی باپ کی بے تحاشہ دولت ہو لٹانے کے لئے بے دریغ خرچ کرنے کے لئے تو ہم بھی ہر جگہ ہر دل عزیز ہوں۔'' عاصم نے جھٹ کہا تھا۔
''یعنی اگر تم بھی اتنے امیر ہوتے تو تم بھی یہی کچھ کرتے؟'' ماہ نم نے پوچھا تھا اسے عاصم کی بات عجیب لگی تھی۔
''ہاں بالکل۔'' عاصم نے ترنت جواب دیا تھا۔
''تو پھر برائی تو اس کی بے تحاشہ دولت میں ہوئی اس میں تو نہیں۔'' جویریہ نے نقطہ اٹھایا۔
''اینی ویز مجھے ذرا گھر جلدی جانا ہے تو میں تو چلتا ہوں اللہ حافظ۔'' عاصم نے اپنی کتابیں سمیٹنے کے ساتھ بات بھی سمیٹی اور اٹھ کھڑا ہوا اور ماہ نم جویریہ کی بات کو سوچتی رہ گئی۔
''ارے مجھے بھی جانا ہے تم مجھے اپنی بائیک پر ہی ڈراپ کر دو راستے میں میرا گھر پڑتا ہے۔'' جویریہ جھٹ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور ماہ نم کو جویریہ کی یہی فرینکنس اچھی نہیں لگتی تھی۔
''او کے بھئی اللہ حافظ شادی میں تم دونوں نے ضرور آنا ہے کارڈ بھجوا دوں گی۔'' جویریہ جاتے جاتے بھی تلقین کرنا نہیں بھولی تھی۔
''وہ تو تم پورے ڈیپارٹمنٹ کو ہی بھجوگی سارے زمانے سے تو ہیلو ہائے ہے۔'' عاصم نے اسے چھیڑا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
''یہ تو ہے۔'' وہ دونوں اسے بائے کرتے ہوئے چلے گئے اور وہ بھی اپنی کتابیں سمیٹ کر بل پے کر کے اٹھنے ہی لگی تھی جب سیفی اٹھ کر سیدھا اس کے قریب رکھی کرسی پر آن بیٹھا، ماہ نم نے اس کی حرکت پر چونک کر اور قدرے ناگوار تاثرات سے اس کی جانب دیکھا۔
''میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں صرف دوستی۔'' بغیر کسی لگی لپٹی رکھے اس نے اپنا موقف بیان کیا اور ماہ نم کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی خود پر کنٹرول کرتے ہوئے اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔
''میں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی۔''
''تو عاصم لڑکا نہیں ویری اسٹرینج۔'' اس کے اگلے سوال اور انداز پر اسے شدید تاؤ آیا تھا۔
اسے یہی مناسب لگا کہ وہ خاموشی سے وہاں سے چلی جائے وہ کتابیں سمیٹ کر تیزی سے اٹھ کر مڑی جبھی سیفی نے پیچھے سے اس کے دوپٹے کا کونہ کھینچا جس کی وجہ سے وہ اس کے سر سے اتر گیا اچانک یوں بے حجاب ہونے پر اسے اپنے غصے پر قابو نہیں رہا اور شدید اشتعال کے ساتھ پلٹ کر اس نے سیفی کو تھپڑ دے مارا۔
''جنگلی انسان تمہیں جرأت کیسے ہوئی میرا دوپٹہ کھینچنے کی۔'' سیفی جو اس کے اٹھنے پر خود بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اس غیر متوقع حملے کے لئے قطعی تیار نہیں تھا اس کے تھپڑ اور اتنی زور سے چلانے پر سبھی ان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔
''تڑاخ!'' اتنی ہی شدت سے سیفی نے بھی اسے تھپڑ دے مارا تھا۔
''اور تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھ پر گھٹیا الزام لگانے کی میرے بینڈ کے ساتھ اس کا کونہ اٹک گیا تھا۔'' سیفی نے بائیں بازو کو قدرے بلند کرتے ہوئے غرا کر جواب دیا تھا جہاں پر اس کے بینڈ کے ساتھ اس کے دوپٹے کا کونہ پھنسا نظر آ رہا تھا کھینچ کر کونہ نکالتے وہ کرسی کو زور سے ٹھوکر مارتا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا اور ماہ نم اتنی تذلیل

پر وہیں پر بیٹھتی چلی گئی تھی وہ جو تماشہ نہیں چاہتی تھی اچھا خاصا تماشا بن گئی تھی احساس توہین سے اس کی آنکھیں جل اٹھیں تھیں کچھ لڑکیاں آ کر اسے دلاسہ دینے لگی تھیں لیکن ہر ایک کی نظروں اور کچھ کی زبانوں پر بھی سوال تھا کہ ان کے درمیان یہ ہنگامہ کیوں ہوا وہ جو ہمیشہ سکینڈل بننے سے بچتی آئی تھی اچھی خاصی اس واقعہ کے بعد اسکینڈلائیز ہو گئی تھی کافی دنوں اس واقعہ کا چرچا رہا تھا اسے لگتا تھا کہ ہر کوئی اسے مڑ مڑ کر دیکھتا ہے سیفی کو وہ پہلے ناپسند کرتی تھی اور اب شدید نفرت ایسے موقع پر عاصم نے اسے بہت مورل سپورٹ دی تھی وہ اس بات کا ذکر گھر میں تو ہرگز نہیں کر سکتی تھی اسے یونیورسٹی جانا بے حد مشکل لگنے لگا تھا لیکن وہ غیر حاضر ہو کر اس جانور کے آگے اور باقی لوگوں کے سامنے بھی خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی تبھی عاصم نے ایک اچھے دوست کی طرح اس کا ساتھ دیا سمجھایا اور آہستہ آہستہ وہ اس کی باتوں سے بہل کر اس واقعہ کے اثرات کم کرنے کے قابل ہو سکی تھی تبھی عاصم نے ایک روز اسے مستقبل کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ رزلٹ کے بعد اولین مقصد جاب کا حصول ہے تاکہ وہ اپنے گھر والوں کو ماہ نم کے گھر بھیج سکے اور ماہ نم نے بھی واضح کر دیا تھا کہ اس بات کا فیصلہ صرف اس کے والدین کے ہاتھ میں ہے اگر انہیں منظور ہوا تو اسے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا البتہ وہ اسے ایک اچھے اور سچے دوست کے طور پر قبول کر چکی تھی، لیکن تقدیر اس کے نصیب میں کیا لکھ چکی تھی اسے کیا خبر تھی۔

☆☆☆

''اُفوہ! شکیل میں آج نہیں آ سکتی، اسفند کو بہت تیز بخار ہے وہ سکول بھی نہیں گیا وہ تو میری جان کو آ جائے گا۔'' مسلسل بڑھتے ہوئے تقاضے پر وہ قدرے جھنجھلا کر بولی تھی، شوہر کا ذکر بھی ناپسندیدگی سے کیا گیا تھا۔

''ہاں سنبھالتی تو آیا ہے مگر تم سمجھوں ناں رات بھی میری اس کے ساتھ خاصی جھڑپ ہوئی ہے، آئی پرامس کل سارا دن تمہارے ساتھ گزاروں گی شاپنگ ہوٹلنگ سب ہوگا بہت بے چین ہوناں ملنے کے لئے خوب خرچا کرواؤں گی تو ہی سکون آئے گا۔'' وہ اٹھلا کر ناز سے بولی تھی اور ایک دو باتیں مزید کرنے کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا اور کوفت بھرے انداز میں اسفند کے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی اور وہ مالکن کے یہ انداز دیکھ کر بس افسردہ سے اور پریشان سے کچن کی جانب بڑھ گئے تھے کچھ سالوں سے اس گھر میں مرد مہمانوں کی آمد بڑھ گئی تھی خاص طور پر شکیل نامی مہمان کی جو بیگم صاحبہ کا خاص دوست تھا اور یہی بات وہ اپنے مالک کو بتا نہیں پا رہے تھے وہ جھٹلائے جاتے ان کی بات رد کر دی جاتی تو اتنے سالوں کی بنائی ساکھ، عزت اور بھروسہ سب ختم ہو کر رہ جاتا اور پھر اسفند جو اب سات سال کا ہو چکا تھا اس پر ان سب باتوں کا بہت برا اثر پڑ رہا تھا، بیگم کی مہنگی اور فضول فرمائشیں پوری کرنے کے لئے ان کے صاحب پیسے کمانے والی مشین بنتے جا رہے تھے نہ دن کا ہوش تھا نہ رات کی خبر وہ مضطرب سے دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگے۔

☆☆☆

ہمیشہ آئینوں کے ہی مقدر میں کیوں چوٹیں
کبھی یہ معجزہ بھی ہو کہ پتھر چوٹ کھا جائیں

''بیٹا کافی عرصہ ہو گیا ہے حویلی کا چکر لگائے، رات گلناز نے فون کیا تھا وہ تمہارا پوچھ رہی تھیں کافی اداس لگ رہی تھیں تم سے۔'' صبح

کے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے بختاور نے بیٹی کو مخاطب کیا تھا جو ان کے لئے چیز آملیٹ اور جنجر بریڈ بنا کر لائی تھی کوکنگ اس کا شوق تھا اور ہر وقت تھوڑا بہت وقت نکال کر وہ اپنے اس مشغلے سے لطف اندوز ہوتی رہتی تھی اور ساتھ میں مما پپا کو بھی مزے کرواتی رہتی تھی۔

''جی پپا! پڑھائی کی کچھ مصروفیت تھی پھپھو سے ملاقات ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں ان فیکٹ اس سے ٹیلی فون پر بھی بات نہیں ہو سکی ان کے پاس اپنا سیل فون تو ہے نہیں اور لینڈ لائن جو عموماً خراب رہتی ہے بات ہو نہیں پاتی۔'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ بولی تھی۔

''ہوں رات بھی اختیار کے نمبر سے بات کر رہی تھی۔'' چھوٹے بھائی کا نام لیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''تو پھر اس ویک اینڈ پر چلتے ہیں ہوا بدل جائے گی۔'' زینب چائے کا سپ لیتے ہوئے بولیں تھیں۔

''ہوں یہ ٹھیک ہے کافی عرصہ ہی گزر گیا ہے سب سے ملاقات کیے ہوئے ویسے بھی مجھے اختیار سے کچھ کام بھی ہے چلتے ہیں سب۔'' بختاور نے پروگرام بناتے ہوئے کہا۔

''کیوں ماہ نم ٹھیک ہے۔'' خاموشی سے ناشتہ کرتے ہوئے زینب نے پوچھا۔

''جی ٹھیک ہے آج کل اسٹڈی بھی نارمل سی ہو رہی ہے میں آسانی سے وقت نکال لوں گی، مگر شام کو واپس آ جانا ہے مجھ سے زیادہ دیر تک اس ماحول میں رہا نہیں جاتا تینوں چچیوں کی آپس میں بنتی نہیں اور جس کی خیریت پوچھ لو باقی دو کا منہ بن جاتا ہے اور پھپھو کو دیکھ کر تو دل ہمیشہ دکھی ہو جاتا ہے پھپھو کی محبت نہ ہو تو میں کبھی ادھر کا رخ بھی نہ کروں لیکن جانتی ہوں میری صورت میں انہیں کچھ لمحوں کے لئے تازہ ہوا میسر آتی ہے مجھی جاتی ہوں۔'' ماہ نم نے حامی بھرتے ہوئے قدرے افسردگی سے کہا اور اس کی بات سن کر بختاور اور زینب کے چہروں پر بھی سنجیدگی سی چھا گئی اور ماہ نم ماضی میں کھوئی چائے کے چھوٹے سیپ لینے لگی جب ایک بارہ سال کی بچی کے لہجے میں ستائش تھی۔

''آپ کے بال کتنے خوبصورت ہیں اور کتنے لمبے بھی میں بھی آپ ہی کی طرح لمبے بال رکھوں گی۔'' بچی نے گیلے بالوں کو کنگھی کرتی ہوئی اپنی پھپھو سے کہا وہ اپنی نازک اندام اور خوبصورت کم گو سی پھپھو سے بے حد متاثر تھی، گرمیوں کی چھٹیاں وہ خاص اپنی پھپھو سے ملنے کے لئے حویلی آئی تھی ورنہ اسے یہاں کا گھٹا گھٹا سا ماحول کچھ خاص بھاتا نہ تھا، لیکن اس کی پھپھو بے حد حسین تھی۔

''نصیب خوبصورت ہونا چاہیے مانو یہ خوبصورتی ورنہ بیکار ہے۔'' پھپھو دھیمی سی مسکان سے بڑبڑائی تھی۔

''آپ کے لئے تو پرستان سے ہینڈسم شہزادہ آئے گا آپ کو بیاہنے میرے پھپھا بھی آپ کی طرح بے حد خوبصورت ہونے چاہیے۔'' بچی کا لہجہ شرارتی ہوا تھا۔

''تم اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی بڑی باتیں کرتی ہو مانو، بھائی صاحب نے تمہیں بہت چھوٹ دے رکھی ہے۔'' انہوں نے مڑ کر اس کی چھوٹی سی ناک ہلکے سے دباتے ہوئے سرزنشانہ انداز میں کہا تھا، وہ اس کی باتیں بے حد پیار سے سنتی تھیں وہ ان کے لئے ایک روزن تھا یہ اس معصوم بچی کو خبر تو نہ تھی البتہ انہی کی باتوں پر پھپھو کے چہرے پر آنے والی دبی، جھجکی اور بھی جھینپی سی مسکان اسے باور کرائی تھی کہ پھپھو اس کی

باتوں پر خوش ہو رہی ہیں۔
اور یہ منظر اس وقت کا تھا جب وہ بچی پندرہ سال کے سن کو لگی تھی آج بھی وہ حویلی صرف اپنی پھپھو کی وجہ سے گرمی کی چند چھٹیاں گزارنے آئی تھی حویلی میں برادری کے بہت سے لوگ جمع تھے، اس کے دادا اونچا شملہ پہنے سفید کڑک دار لٹھے کے سوٹ میں بڑے کروفر کے ساتھ صوفے پر براجمان تھے، اس کے چاچا بھی سفید لٹھے کے سوٹ میں ملبوس اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر اکڑے بیٹھے تھے آج اس کی پھپھو کا نکاح تھا حویلی میں آتے ہی سب سے پہلے یہ خبر انہیں سنائی گئی تھی اس کی ماں یہ خبر سن کر خوش ہونے کی بجائے بے حد پریشان ہو گئی تھی دادی کے سامنے انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر دادی نے ہاتھ اٹھا کر خاموش کرا دیا تھا ان کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹی کا نصیب جاگ گیا ہر ایک کے چہرے پر عجیب سی عقیدت چھلک رہی تھی وہ دل میں اس بات پر خفا کہ پھپھو کی شادی یوں اچانک اور بنا بتائے وہ پھپھو کو چھیڑنے ان کے کمرے کی جانب بھاگی تھی۔
پھپھو کو تیار کیا جا رہا تھا اور پھپھو کی تیاری دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔
''تمہارے بھائی دوسرے شہر بزنس ٹور پر گئے ہیں ورنہ شاید یہ سب......'' مما نے آگے بڑھ کر گلناز پھپھو سے کہا تھا اور پھپھو ان کی ادھوری بات سن کر ان کے گلے لگ کر یوں بے اختیار اور مچل کر روئی تھیں جیسے کسی کی میت پر رویا جاتا ہے۔
''ہائے ہائے بڑی بھاگوان ہے اپنی گلناز اللہ ہر کسی کو یہ مرتبہ نہیں بخشتا خود تو بخشی گئی ہم بھی بخشے جائیں گے اس کے طفیل بڑا رتبہ مل گیا اسے تو، اس کی دعائیں قبول ہو گئیں، رحمت کا سایہ صدا اس پر رہے گا اور اس کے طفیل ہم لوگ بھی اعلیٰ رتبے پر پہنچ گئے تو یہ استغفار گناہ گار ہو کر بھی۔'' چچی نے آگے بڑھ کر ان دونوں کو روتے ہوئے الگ کیا تھا ماثو کا چھوٹا ذہن اس سچویشن کو تو سمجھ نہ پا رہا تھا مگر وہ اتنا ضرور سمجھ پا رہی تھی کہ اس کی پھپھو اس شادی پر خوش نہیں، حیا سے پلکیں بوجھل تھیں نہ گالوں پہ آنے والی حسین گھڑی کا تصور کر کے شرم کی شفق وہ تو بلکہ عجیب سے حلیے میں تھیں مایوں کا پیلا جوڑا پہننے کی بجائے سفید لباس زیب تن کر رکھا تھا اور زیور پہنانے کی بجائے دو عورتیں پھپھو کا زیور اتار رہی تھیں یہ کیسا نکاح، یہ کیسی شادی تھی مما بھی چپ اور گم صم سی تھیں۔
''نکاح کی تیاری مکمل ہے دلہن کو جلدی سے لے کر آؤ۔'' کسی نے باہر سے پکارا تھا یہ بات سن کر پھپھو کے لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ ابھرنے کی بجائے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا آنکھوں میں بے بسی اور ایک ساتھ ابھری تھی، پھپھو کی کلائیوں سے چوڑیاں اتار دی گئی تھیں اور کانوں سے سونے کی بالیاں پھر بالکل سیدھی مانگ نکال کر کس کر بالوں کی چوٹی باندھ کر سفید دوپٹہ یوں عقیدت سے اوڑھا دیا گیا تھا کہ بس اب ان کا چہرہ ہی نظر آ رہا تھا دو رشتے دار عورتیں انہیں تھام کر کمرے سے باہر چلی تھیں اور ان کے بیچ چلتی پھپھو پر ماثو کو کسی لاش کا گماں گزرا تھا کیا زندہ لوگ بھی دفنا دیئے جاتے ہیں ذہن میں تلخ سوال یونہی ابھرا تھا۔
وہ بھی سبھی لوگوں کی سنگت میں بڑے سے دالان خانے میں آن رکی تھی اس کی متلاشی نظریں اپنے ہونے والے پھپھا کو کھوج رہی تھیں۔
''لگتا ہے پھپھا، پھپھو کی طرح خوبصورت

نہیں جو پھپھو یوں افسردہ ہیں۔" ذہن نے ایک اور تاویل گھڑی مگر شادی کا یہ انداز بھی تو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا نہ ڈھولکی نہ گانے، نہ قہقہے، نہ زرق برق لباس بس ہر کوئی سر جھکائے عقیدت بھرے تاثرات چہرے پر سجائے خود میں مگن تھا۔

اور پھر اس کی پھپھو کا نکاح ہو گیا اور وہ سن دماغ اور پھٹی آنکھوں سے اتنی مکروہ، اتنی قبیح اور اتنی ظالم رسم کو ہوتے دیکھتی رہ گئی اس کی پھپھو کو ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں پر ایک بیڈ، ایک الماری، دو کرسیاں اور جائے نماز اور لال گوٹے والے کپڑے میں لپٹے جزدان میں پڑھے قرآن پاک کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسے اپنی باذوق پھپھو کا پرتعیش سا کمرہ یاد آیا تھا۔

اسے اب حویلی سے ڈر لگنے لگا تھا، اپنے دادا سے اپنے چاچا اور اپنی پھپھو سے بھی اس پھپھو سے جسے وہ بچپن سے ہی بے حد پسند کرتی تھی اسے اپنی بہ نازک اور حسین سی پھپھو کسی فیری ٹیل کی فیری لگتی تھی اسے اپنی پھپھو کا ہر روپ بے حد بھاتا تھا اس کا دل سراہتا تھا انہیں ہر روپ میں وہ خوبصورت تھیں جب بھی لمبے بالوں کی موٹی سی چوٹی سائیڈ پر ڈالے اپنی ڈائری میں شعر لکھ رہی ہوتیں اور کسی پسندیدہ شعر پر قلم کو ہونٹوں میں دبائے دھیمے سی مسکاتی تو کتنی حسین لگتیں، یا پھر باغ میں کھڑی پینٹنگ کرتے ہوئے وہ تتلی ہی تو لگتی تھیں پھولوں پر عاشق تتلی اور جب بھی بارش ہوتی تو اس کے ساتھ مل کر خوب بارش میں بھیگتی اسے پکڑتی وہ جل پری لگتیں، نت نئی ڈشیں بنانے کا بے حد شوق تھا انہیں تب چولہے کی تپش سے دہکتا چہرہ اور ستواں ناک میں ہیرے کی لونگ عجیب سی چھب بنا دیتی یا پھر کسی کپڑے پر پھول بوٹے کاڑھتے ہوئے ان کی مخروطی انگلیاں، گلابی پوریں اف وہ کس قدر حسین تھیں

اگرچہ انہوں نے صرف مڈل تک پڑھا تھا، وہ بھی گھر ایک آسانی سے یہ بھی ان کی بے حد فرمائش پر مانو کے ابو نے دادا سے بحث کرکے اجازت دلوائی تھی، وہ پہننے اوڑھنے کی نا صرف شوقین تھیں بلکہ بہت اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں اس معاملے میں انہیں زیادہ تر گھیر دار فراک اور چوڑی دار پاجامے بھاتے تھے بے حد نفیس کپڑا زیب تن کرتی تھیں ان کی چوائس بہت اعلیٰ تھی جلدی انہیں کوئی چیز پسند نہ آتی تھی پھر ہر سوٹ کے ساتھ ہم رنگ چوڑیاں اور بندے بھی کبھی دادی ان کے یوں نک سک تیار رہنے پر ان پر خفا ہونے لگتیں تب وہ انہیں گدگدا کر کھلکھلا کر ان کی ڈانٹ کو ہنسی میں اڑاتی مانو کا ہاتھ تھامے بھاگ جاتی اور مانو اس خوبصورت پری کا ہاتھ تھامے اس کے ساتھ دوڑی چلی جاتی لیکن اب اسے اس پری سے ڈر لگنے لگا تھا، سفید لباس میں ملبوس بڑا سا سفید دوپٹہ اپنے اردگرد لپیٹے وہ بس اپنے چھوٹے سے نیم تاریک کمرے میں پڑی رہتیں پانچ وقت کی نماز کی پابند تو وہ پہلے بھی تھیں بلکہ بچپن سے مانو کو بھی انہوں نے اپنے سنگ اس کا عادی بنا ڈالا تھا اب بھی نوافل ادا کر رہی ہوتیں، تسبیح کر رہی ہوتیں یا پھر قرآن پڑھ رہی ہوتیں، خوشی اور اداسی میں انہیں میوزک سننا بے حد پسند تھا وہ کہا کرتی تھیں مانو آج دل اداس ہے کشور اور لتا کے گانے سنتے ہیں ریڈیو پر اور کبھی کہتیں مانو آج دل خوش ہے رفیع اور لتا کے گانے سنتے ہیں ریڈیو پر اور مانو کے ہاتھوں سے منگوایا وہ چھوٹا سا ریڈیو گود میں لے کر بیٹھ جاتیں اور جب مانو سمجھانا چاہتی کہ پھپھو ریڈیو ہماری مرضی کے گانے تھوڑی لگتے ہیں تو وہ پیار سے اس کی ناک دبا کر کہتیں کہ ان میں سے لگے گے تو ضرور بس وہی سنے گے اور اب اسے سمجھ ہی نہ آتی کہ پھپھو

اداس ہیں یا خوش وہ تو سپاٹ چہرے کے ساتھ بس ایک ربوٹ کی طرح زندگی نبھائے جا رہی تھیں، وہ ہاتھ تھام کر انہیں باہر لے جانا چاہتی کہ پھپھو دیکھئے کتنا خوبصورت موسم ہے، بوندا باندی ہو رہی ہے پکوڑے بنوا کر بارش میں بھیگتے ہوئے کھاتے ہیں تب وہ دھیمے سے ہاتھ چھڑا لیتی مانو کے اصرار پر بس اتنا کہتیں مانو یہ میری زندہ قبر ہے اور قبر سے مردے نکلا نہیں کرتے تب وہ ان کی اجڑی حالت دیکھ کر رو پڑتی، اس پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا تھا اس نے حویلی جانا کم کر دیا پھپھو کے نکاح کے بعد وہ گھر آ کر بھی کئی مہینے ڈسٹرب رہی تھی بابا کو جب علم ہوا تھا تو وہ گئے تھے دادا اسے پھپھو کے متعلق بات کرنے مگر انہوں نے ٹوک دیا تھا یہ کہہ کر کہ بس تم نے اپنی مرضی کرنی تھی کر لی لیکن اس معاملے میں، میں تمہاری ہرگز نہیں سنوں گا۔

☆☆☆

چوہدری بختاور اپنے نام کی طرح بخت آور ثابت ہوا تھا اس کے کچھ خواب تھے جاگتی آنکھوں سے دیکھے خواب، ایسے خواب جو اس کی حقیقی زندگی سے ہرگز میل نہ کھاتے تھے اردگرد کے لوگ اگر جان جاتے تو نوچ ڈالتے اس کی آنکھوں سے خواب مگر وہ بختاور تھا، شادی کے چھ سال بعد اپنے والدین کو انوکھی مسرت بھری خوشی سے آشنا کرنے والا، کم گو، نرم خو اور بے حد ذہین یہ سب تو خدا کسی کو بھی نواز دیتا ہے انوکھی بات تو یہ تھی کہ ایک فیوڈل خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود اس کا رجحان بزنس کی جانب تھا اسے فصلیں کاشت کتائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی یہی نہیں بلکہ اپنے باپ دادا کے نام اور شملے کو بلند رکھنے کے لئے کسی طرح مزارعوں پر حکمرانی کرنی تھی ان کے محدود ذہنوں کو بھی جاگیرداری کے رعب

اور کبھی اونچی ذات کے ناطے مذہب پر اپنا تسلط قائم رکھتے اپنے آباؤ اجداد کی فرسودہ رسومات کو دلجمعی اور مضبوطی سے تھامے دلوں پر مہر لگائے کم ذاتوں کو کیسے قابو رکھنا تھا ان سب باتوں سے وہ دور بھاگتا تھا اس لئے جب اس نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر ہاورڈ یونیورسٹی میں بزنس مینجمنٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے اعلان کیا تو پورے خاندان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا بھلا اتنی جائیداد کے ہوتے ہوئے یہ بھانت بھانت کے لوگوں سے مل ملا کر دن رات کا چین حرام کر کے چھوٹا موٹا کاروبار چلانے کا کیا تک لیکن وہ بختاور تھا اپنے بابا کا بے حد چہیتا اور اپنی بات منوانے کا فن با خوبی جانتا تھا انہیں اپنے لائق فائق بیٹے پر فخر تھا ان کے رشتے داروں کے اور بیٹے کبڈی میں، کتوں کی لڑائی میں، گھوڑوں کی ریس میں انعام جیت کر آئے تھے اور ان کا بیٹا ہر سال کلاس میں اول آنے پر ٹرافی یا شیلڈ لاتا اس کے کزن بعض اوقات اس کا مذاق اڑاتے لیکن اسے پرواہ نہیں تھی اور جب ان کے بیٹے کا اخبار میں انٹرویو آیا فوٹو گرافر نے اس کے پورے صوبے میں میٹرک میں اول آنے پر تصویریں کھینچ کر اخبار میں چھاپیں تو خدا بخش کا سینہ اور چوڑا ہو گیا جو فخر جو غرور بختاور نے انہیں بخشا تھا کسی کے پاس نہ تھا تبھی تو وہ اس کی وہ بات بھی مان لیتے جو بظاہر ان کے خاندان میں نہیں ہوئی تھی باہر جانے کا سن کر بختاور کی ماں کو باہر سے کوئی فرنگن نہ بیاہ لائے کی فکر دامن گیر ہوئی تو بختاور نے جھٹ ان کی اکلوتی یتیم بھانجی جو ان کی زیر کفالت تھی کا نام لے ڈالا اسے وہ اپنے پاؤں کی زنجیر بنا کر باہر کے لئے اڑان بھرنا چاہتا تھا اونچے خاندان کی وہ بچی جو تھی تو بے آسرا لیکن ان کا خون تھی کم از کم کسی کا فرانی کا خون تو ان کی

لیا تھا اپنے بنگلے کو بھی اسی سلسلے میں گروی رکھ دیا تھا اپنی پریشانی انہوں نے بیوی اور بیٹی سے شیئر نہ کی تھی انہیں یقین تھا کہ بہت جلد وہ اپنے کاروبار کو سنبھال لے گے اور قرض بھی جلد اتر جائے گا باپ سے مدد مانگنا انہیں منظور نہ تھا یہ ان کی خودداری کے خلاف تھا اور پھر ان سب کو موقع مل جاتا ان کے فیصلے پر تنقید کرنے کا اور وہ مجبور کرتے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ حویلی آن بسے اور اسی دوران چوہدری خدا بخش کی اچانک ایک رات ہارٹ فیل ہو جانے سے موت واقع ہو گئی یہ ایک صدمہ تھا جو سب نے سہا اب حویلی کا سارا انتظام ان کا چھوٹا بھائی چوہدری اختیار سنبھال رہا تھا باپ کی موت کے بعد دوری اور بڑھ گئی تھی ہاں البتہ وہ ماں سے ملنے کے لئے کبھی کبھار حویلی چلے جاتے تھے۔

مانو اور زینب انہیں کافی دنوں سے ٹینشن میں دیکھ رہی تھیں زینب کے بے حد استفسار کے باوجود وہ ٹال دیتے تھے اور پھر یہی پریشانی ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی تھی وہ دلوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکے تھے حویلی سے ان کی والدہ کی بیماری کی خبر آئی تھی چوہدری بختاور اور زینب ماں سے مل کر حویلی سے واپس آ رہے تھے کہ اپنی سوچ اور پریشانی میں گم ان سے کار بے قابو ہو گئی تھی آج قرض لوٹانے کی آخری تاریخ تھی، انہوں نے چھوٹے بھائی سے اپنے حصے کی بات کی تھی زمین بیچ کر ان کا ارادہ قرض کی رقم لوٹانے کا تھا مگر عیار اور لالچی فطرت چوہدری اختیار نے ٹال مٹول سے کام لینا شروع کر دیا اور اسی ٹال مٹول میں تاریخ سر پر آن پہنچی تھی بس یہی سب سوچیں ان پر حاوی ہو گئیں اور انہیں موت کی وادی میں پہنچانے کا سبب بنی اس دن مانو پر ایک قیامت تھی جو آ کر بیت گئی وہ لاسٹ سمسٹر کا لاسٹ پیپر دے کر گھر آئی تھی اور کچھ ہی دیر میں دادی کی خیریت معلوم کر کے اس کی مما بابا واپس آنے والے تھے صبح حویلی سے فون آیا تھا دادی کی حالت خراب تھی بس انہیں آناً فاناً نکلنا پڑا مانو نہیں جا سکتی تھی اس کا آج لاسٹ پیپر تھا یونیورسٹی واپسی پر وہ گھر آ کر انتظار کر رہی تھی ابھی سیل پر مما سے بات ہوئی تھی لیکن سامنے سے آتے بڑے سے ٹرالر کو دیکھ کر بھی وہ کار کو قابو نہ کر سکے اپنی پریشانی میں غلطاں انہیں چونک کر اس وقت سامنے سے آتی موت کا احساس ہوا جب وہ سر پر آن پہنچی تھی ایکسیڈنٹ بے حد برا ہوا تھا گاڑی کا اگلا حصہ بری طرح سے پچک گیا تھا اور دونوں جائے حادثہ پر ہی دم توڑ گئے تھے، مانو کا انتظار تمام عمر کے لئے انتظار ہی رہ گیا تھا تقدیر کے اس پلٹنے پر مانو کے ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے، ہوش آیا تو وہ حویلی میں تھی اس کے سیل فون پر اس کے بابا کے فون سے کسی نے کال کی تھی جائے حادثہ پر ان کی کار کے پاس فون گرا پڑا تھا پہلا نمبر جو کہ مانو کا تھا وہ آخری کال تھی پر اسے کال کر کے یہ اندوہناک خبر سنائی گئی تھی اس کی چیخیں نکل گئی تھیں وہ بے یقین تھی اور گھر میں تنہا گم ہوتے حواسوں کے ساتھ اس نے حویلی فون کیا تھا اور پھر اس کے چاچا جائے حادثہ پر پہنچ گئے تھے۔

ڈیڈ باڈیز قریبی سول ہسپتال لے جائی جا چکی تھیں شناخت کروا کر وہ ڈیڈ باڈیز لے کر حویلی چلے گئے تھے اور پھر شہر آ کر مانو کو بھی لے گئے تھے اس کی صورت دیکھ کر اور اجڑی حالت نے پتھر سے پتھر دل کو رلا دیا تھا اس پر بار بار غشی طاری ہو رہی تھی اچانک اتنا بڑا صدمہ، لیکن یہ تو اس کی تقدیر کا دیا پہلا صدمہ تھا اور پھر وہ پے در پے صدمات کا شکار تھی بلاشبہ وہ مضبوط اعصاب

آنے والی نسلوں میں داخل ہو کر ان کی نسل برباد نہیں کرے گا یا خوشی بختاور کا نکاح زینب سے کر ڈالا زینب جو محض پرائمری پاس تھی ایک گولڈ میڈلسٹ کے ساتھ بیاہ دی گئی وہ ملنسار تھی، اطاعت گزار تھی اور دل و جان سے اپنے شوہر کو چاہتی تھی اور ان دونوں کی محبت کا ثبوت ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی مانو تھی جس کی پیدائی پر زینب کا کیس بگڑ گیا تھا اور کچھ پیچیدگیاں ہونے کے باعث وہ دوبارہ ماں بننے کے قابل نہ رہی تھی اور بختاور نے اسے خدا کی مرضی جان کر قبول کرلیا تھا اپنی اولاد کے لئے بھی بختاور نے خود کو اپنے گھر بار سے قدرے دور رکھا تھا وہ شہر میں چھوٹا سا کاروبار چلاتا تھا اور بچی تعلیم پر خاص توجہ دیتا ہوئے حویلی سے قدرے فاصلے پر رکھتا تھا بختاور کے اس اقدام پر خدا بخش اور باقی کے لوگ کافی ناخوش تھے مگر بہت کچھ حاکمانہ اور آمرانہ طریقے سے منوانے والے خدا بخش اپنے اس ذہین اور نیک اور صلح جو بیٹے کے سامنے دل کے ہاتھوں مجبور تھے لہٰذا بختاور اپنی مرضی کی پرسکون زندگی گزار رہا تھا، بختاور کے بعد اختیار تھا فیوڈل سوچ کا حامی ایک آمر جاگیردار جسے اپنی زمین کا ایک ایک انچ بے حد عزیز ہوتا ہے اختیار کی دو بیٹیاں تھیں بیٹے کے لئے دوسری شادی کی تھی لیکن دوسری بیوی نے ایک چوہیا کا بچہ بھی پیدا نہ کرکے دیا تھا لہٰذا اب مانو کی دادی بیٹے کی تیسری شادی کی تیاری میں تھی اور سبھی لوگ اس کے حامی تھے کیونکہ اس خاندان کو ایک وارث کی اشد ضرورت تھی بختاور کی بڑھائی تو اس کو لے ڈوبی تھی جو بس ایک بیٹی پر قناعت کیے بیٹھ گیا تھا لیکن اختیار ایسی جذباتی اور بے وقوفانہ سوچ ہرگز نہ رکھتا تھا اور سب سے چھوٹی پھپھو گلناز تھی، جس کا نکاح قرآن سے اس لئے کر ڈالا گیا کہ پوری برادری میں اس کے جوڑ کا رشتہ نہ تھا اور غیر برادری میں بیاہنے کا مطلب جائیداد کا بٹوارا جو انہیں کسی صورت میں منظور نہ تھا۔

بختاور، گلناز کے لئے کچھ بھی نہ کر پائے تھے اور حویلی والوں کے اس ظالمانہ فیصلے سے بد دل ہو کر انہوں نے حویلی آنا جانا بے حد کم کر دیا تھا، مانو ایک ذہین اور خوبصورت بچی تھی اس کے باپ نے اس کی تربیت ایک پراعتماد شخصیت کے طور پر کی تھی اور اس کی ماں نے ایک سلیقہ مند، سلجھی اور اسلام کو صحیح معنوں میں عملی طور پر اپنانے والی لڑکی کے طور پر پرورش کی تھی اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا نکھار، اعتماد اور سلجھاؤ نظر آتا تھا، پھپھو کے گوشہ نشین ہونے کے بعد حویلی آنا جانا بے حد کم ہو گیا تھا بس جب پھپھو کی یاد ستاتی اور فون پر وہ بے حد اسے یاد کرتیں اور آبدیدہ ہو جاتیں تو وہ کچھ دیر کے لئے ان سے مل آتی اور ہر بار دل پر ایک بوجھ لے کر آتی۔

مانو کا مستقبل صاف اور سیدھا تھا وہ ایم بی اے کر رہی تھی ایک ذہین سٹوڈنٹ اور بہت اچھی مقررہ تھی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس کا ارادہ اپنے بابا کا چھوٹا سا کاروبار سنبھالنے کا تھا اور اس کے والدین اچھا سا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کا ارادہ تھا، راوی ہر طرف چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

لیکن وقت کب ایک سا رہتا ہے تقدیر کا وار ہمیشہ پیچھے سے ہوتا ہے انسان بے خبری میں مارا جاتا ہے چوہدری بختاور کا کاروبار آہستہ آہستہ گھاٹے کی جانب بڑھنے لگا تھا حالات کچھ اس طرح کے ہوتے جا رہے تھے کہ وہ اپنی کاروباری سوجھ بوجھ اور ذہانت کے باوجود کاروبار کے گرتے ہوئے گراف کو روک نہ پا رہے تھے اسی پریشانی میں انہوں نے بینک سے خطیر رقم کا لون

کی پراعتماد لڑکی تھی ورنہ آج کل وہ جن حالات کا شکار تھی شاید بزدل ہوتی تو کب کی خودکشی کر چکی ہوتی اس کا زیادہ تر وقت پھپھو کے پاس ان کے نیم تاریک کمرے میں گزرتا وہ اس پر کچھ نہ کچھ پڑھ کر پھونکتی رہتیں اور اس کے صبر کے لئے دعا گو رہتی اس کا گھر بینک نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا چچا کی زبانی اور پھپھو نے تفصیل سے بتایا تھا کہ بختاور بھائی کا کاروبار خسارے میں تھا اور یہی پریشانی ان کی موت کا سبب بنی تھی مانو کے دل پر ایک اور بوجھ آن پڑا تھا اس کا باپ تنہا خود پر جھیلتا کاروباری پریشانی کو اس دنیا سے چلا گیا اس حویلی اور زمین میں اس کا بھی حصہ تھا جسے بیچ کر وہ آسانی سے قرض لوٹا کر ہر پریشانی سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا لیکن حویلی کے اصول اور پھر ایک دن ایک اور بدترین خبر پا کر طلوع ہوا تھا چونکہ برادری میں اس کے جوڑ کا رشتہ نہ تھا لہٰذا اس کے چچا نے قرآن سے نکاح کا فیصلہ کیا تھا اب ہر قسم کے فیصلے کرنے کا اختیار چوہدری اختیار کو حاصل تھا گاؤں میں چوہدری بختاور کی زمینوں کو لے کر چہ مگوئیاں ہونے لگیں تھیں، سوال اٹھنے لگے تھے اور مانو پڑھی لکھی، عاقل بالغ لڑکی تھی، ہوا کا رخ بدل رہا تھا اس سے پہلے کہ یہ ہوا آندھی کی صورت اختیار کرے چوہدری اختیار نے بچاؤ کی تدبیر نکال لی تھی تیسری بیوی سے ہونے والی بیٹی ابھی دس دن کی تھی ابھی تک اللہ نے اسے اولاد نرینہ سے محروم رکھا تھا اگر اس کا ایک دن کا بھی بیٹا ہوتا تو شاید وہ مانو کا نکاح اس سے کر ڈالتا، جائیداد اس کی محفوظ ہو جاتی مانو پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی تبھی پھپھو نے اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا روتی بلکتی مانو کو چپ کرواتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا کہ یونیورسٹی میں کوئی ایسا ہے جو اس وقت اس کا ساتھ دے سکے وہ

رات کے اندھیرے میں اسے اس عذاب سے نکال لے جائے پہلا نام ماہ نم کے ذہن میں عاصم کا ہی آیا تھا، پھپھو کے کہنے پر اس نے عاصم کو فون کر کے تمام صورت حال سے آگاہ کیا تھا وہ فوراً اس کی مدد کو تیار ہو گیا تھا ماہ نم کے حالات جان کر اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے سارے زمانے سے چھپا کر خود میں بسا لے وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا ان کے پاس وقت بالکل نہیں تھا آج رات ہی نکلنا تھا وقت اور جگہ کا انتخاب ہو گیا تھا پھپھو نے ہی ماہ نم کو رات میں حویلی سے نکلنے میں مدد کی تھی ساتھ میں ہدایت کی تھی کہ فوراً نکاح کر لے اپنوں کی بے اعتباری کا زخم وہ کھا چکی تھی پھپھو کی تمام ہدایات اپنے پلے سے باندھ کر اور قرآن کے سائے میں وہ حویلی سے رخصت ہو گئی تھی۔

لیکن ہوا کیا آج وہ عاصم کی بجائے سیفی کی منکوحہ بن کر اس کے گھر کے کسی بیڈ روم میں موجود تھی ماہ نم جو نیم غنودگی میں تھی ایک دم اٹھ کر ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی تھی اس کے اعصاب کمزور ہو گئے تھے وقتی صدمات نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا صفیہ اس کی حالت سے گھبرا کر کسی کو بلانے کے لئے بھاگی وہ اسے اپنے قریب بھی نہیں آنے دے رہی تھی سیفی جو اپنے کمرے سے نکل رہا تھا گھبرائی ہوئی صفیہ کو دیکھ کر فوراً اس کے کمرے میں آیا تھا تب تک وہ بیڈ سے اتر کر کمرے سے نکلنے والی تھی اسی لئے تیزی سے آتے سیفی سے ٹکرا گئی۔

''چھوڑو میرا راستہ، مجھے یہاں نہیں رہنا، مجھے کہیں پر بھی نہیں رہنا، مجھے...... مجھے اپنے مما پپا کے پاس جانا ہے۔'' روتے ہوئے وہ بلند ہوئی تھی اس وقت وہ بالکل ہوش و حواس میں نہیں تھی ورنہ سیفی کے سامنے وہ یوں کبھی نہ آتی دوپٹہ

ندار دریشمی سلکی بال پوری طرح سے کھل کر اس کی کمر کو ڈھکے ہوئے تھے اس کا نازک وجود دوپٹے کے بغیر اس کے دلکش خدوخال نمایاں کر رہا تھا وہ ہمیشہ دوپٹے کو سر پر اوڑھ کر رکھتی تھی سیفی کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے بال اتنے لمبے اور اتنے خوبصورت ہیں اس نے اس کے دلکش سراپے سے نظریں چراتے ہوئے اسے قابو کرنا چاہا۔

''آرام سے..... آرام سے۔''

''چھوڑو مجھے..... مجھے جانا ہے..... میری مما پپا کے پاس۔'' اس نے جھٹکے سے خود کو سیفی سے چھڑاتے ہوئے تیزی سے کمرے سے نکلنا چاہا سیفی نے بھی اسی تیزی سے اس کی نازک کلائی تھامی تھی۔

''چھوڑو مجھے..... مجھے نہیں رہنا تم جیسے کمینے انسان کے پاس، چھوڑو ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔'' آنکھیں بند کرتے ہوئے وہ زور سے چلائی تھی تبھی سیفی نے سختی سے پکڑ کر اسے بیڈ کی جانب دھکیلا۔

''نہیں رہوں گی میں یہاں پر۔'' گلہ پھاڑ کر وہ چلائی تھی اس کی کلائی ابھی تک سیفی کے مضبوط ہاتھ میں جکڑی ہوئی تھی۔

''ہوش میں آؤ کیا بکواس کیے جارہی ہو۔'' وہ کچھ بھی سن رہی تھی نہ سمجھ رہی تھی بس مچلتے ہوئے اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی تبھی سیفی نے اسے ہوش میں لانے کے لئے ہلکے سے جھٹکے دیا تبھی وہ جھول کر اس کے قریب آئی اور پھر اس کے حواس کام کرنا چھوڑ گئے اس کے بے ہوش وجود کو گرنے سے بچاتے ہوئے اس نے فوراً اسے اپنے بازوؤں میں سنبھالا تھا اور پھر اپنے بازوؤں میں اٹھائے اسے بیڈ پر تقریباً پٹخنے والے انداز میں لٹایا۔

''خیال رکھو اس کا۔'' صفیہ کو کہتا کمرے سے نکلتا چلا گیا تھا۔

''ہونہہ اب مما پاپا یاد آرہے ہیں یہ سب یار کے ساتھ بھاگنے سے پہلے سوچنا تھا ان کی عزت خاک میں ملا کر احساس ہوا ہے۔'' نفرت اور غصے سے اس نے دل میں سوچا تھا۔

''خواہ مخواہ کی مصیبت گلے پڑ گئی۔'' وہ بڑبڑایا تھا۔

☆☆☆

''کہاں جارہے ہو؟'' تک سک سے تیار سیفی کو پیچھے سے آواز پڑی تھی جسے سن کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

''دوستوں کی طرف۔'' بغیر پلٹے جواب دے کر اس نے آگے کی جانب قدم بڑھایا تبھی وہ فوراً بولے تھے۔

''رکو تم باہر نہیں جاسکتے؟''

''مگر کیوں؟'' انداز میں خودسری نمایاں تھی۔

''جو کارنامہ تم نے سرانجام دیا ہے اس کے بعد یہ ''کیوں'' جیسے سوال پوچھنے کی ضرورت تو نہیں رہتی۔'' قریب آکر انہوں نے جتاتے ہوئے کہا تھا۔

''بٹ!''

''دیکھو جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا تمہیں یہیں رہنا ہے میں چاہتا تو فوراً تمہیں کسی باہر کے ملک بھجوا دیتا لیکن میں چاہتا ہوں اس مصیبت کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے ایک بار ان لوگوں کے آمنے سامنے بات کر کے سیٹل ڈاؤن ہو جائے پھر ہی دیکھے گے اور اس میں کسی بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔'' انہوں نے دوٹوک لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''انہیں کیا معلوم کہ ''میں'' ہی اسے بھگا کر لایا ہوں نہ جانے کتنے عرصے بعد وہ اس بات کا

کھوج لگا سکے، لگا بھی سکے گا کہ نہیں۔"
"بھگا کر، ویل سیڈ...... برخوردار کافی اثر و رسوخ والے لوگ ہیں اور پھر ایسے معاملات چھپائے نہیں چھپتے وہ چین سے نہیں بیٹھے ہوں گے ان کی عزت اور علاقے میں اثر و رسوخ سب داؤ پر لگ چکا ہے وہ بہت جلد اصل بات تک پہنچ جائیں گے اور اگر تم یوں آزاد گھومتے پھرتے نظر آ گئے تو تمہارا قلع قمع کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے تم تک پہنچ گئے تو اس تک بھی پہنچ گئے میں اس معاملے میں رتی بھر رسک لینے کو تیار نہیں ہمیں انتظار کرنا ہو گا یہاں فارم ہاؤس پر تمہاری مرضی کے کئی مشغلے موجود ہیں امید ہے تم بور ہرگز نہیں ہو گے اور فی الحال یہ پارٹیز وغیرہ یا اپنے دوستوں کو بھی ادھر مت بلانا اور نہ انہیں اپنی یہاں موجودگی کی اطلاع دینا اس معاملے کو میرے طریقے سے ہی ہینڈل کرنے دو۔"
"مائی فٹ۔" نہایت گستاخی سے پیر پٹختا وہ پلٹا اور دھم دھم سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔
پیچھے وہ ایک بے بس باپ کی صورت لئے اسے دیکھتے رہ گئے تھے وہ جتنا کڑیل جوان تھا اس کے باپ کے کندھے فخر سے سیدھے ہونے چاہیے تھے مگر وہ تو ان پر ہر دفعہ اپنی حرکتوں سے ایسا بار ڈالتا کہ وہ اس بار سے جھکتے چلے جا رہے تھے شکستگی سے چلتے ہوئے وہ صوفے پر آن بیٹھے، کاکا جان نے افسردہ سی نظر ان پر ڈالی اور گلاس میں پانی ڈال کر انہیں پیش کیا۔
"کاکا میرے گناہ شاید بہت بڑے تھے، یہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا یہی میری سزا ہے ناں لیکن اس سے بڑی تکلیف وہ سزا اور سوچ یہ ہے کہ مجھے زچ کرنے کے لئے تکلیف دینے کے لئے یہ خود کو تباہ کر رہا ہے باندھ کر رکھ دیا ہے اس نے مجھے۔" سینے کو ہلکے ہلکے مسلتے ہوئے دلگرفتہ سے بولے۔
"وقت اسے سمجھا دے گا، آپ کو بھی تو وقت نے سمجھا ہی دیا ہے۔" کاکا جان نے نرم لیکن کچھ جتاتے ہوئے لہجے میں کہا اور وہ بس نادم سے بیٹھے رہ گئے۔

☆☆☆

وہ بہت پرجوش تھے سرپرائز دینے کے خیال سے وہ مسکرا رہے تھے انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔
"آج جمعرات ہے اسفند کو سکول میں ہاف ڈے پر چھٹی ہو گی اور کل ویسے ہی چھٹی ہو گی اور ایک چھٹی تو میں نے ہفتے کی لے لی ہے ہمارے پاس تقریباً دو دن ہیں آج ہی تیاری کر کے کسی ہل اسٹیشن کو نکل جائے گے اسفند اور زیبا کو میں بالکل وقت نہیں دے پا رہا کم از کم یہ دو دن مکمل طور پر ان کے ساتھ انجوائے کرتے گزاروں گا زیبا کی ناراضگی بھی مجھ سے اسی وجہ سے رہتی ہے اسی غصے میں گھر پر تو کیا ہم پر بھی توجہ دینے بالکل بند کر دی ہے میں اپنی فیملی کو ٹوٹنے نہیں دوں گا مجھے کوشش کرنی ہے اور وہ دونوں کتنے حیران ہوں گے کہ میں جو کل آنے والا تھا میٹنگ اٹینڈ کر کے آج ہی اچانک جا کر انہیں سرپرائز دوں گا لیکن ابھی تو صبح کے دس بجے ہیں ہوں ایسا کرتا ہوں کہ اسفند کو سکول سے ابھی چھٹی کروا کر ساتھ ہی گھر لے جاتا ہوں زیبا تو سوئی پڑی ہو گی ہم باپ بیٹا اسے جا کر جگاتے ہیں۔" خود کلامی کرتے ہوئے وہ سارا پروگرام ترتیب دے چکے تھے اور پھر انہوں نے سکول سے اسفند کو پک کیا وہ ان کے کل کے بجائے آج آنے پر کافی حیران ہوا تھا لیکن جب ڈیڈ نے بتایا کہ وہ دونوں کو ساتھ لے کر سیر کے لئے جا رہے ہیں تو اس کا جوش اور خوشی دیکھنے کے لائق تھی

باپ بیٹا سارے راستے مختلف پروگرام بناتے ہوئے آئے تھے۔
''شی! آواز نہیں نکالنی بالکل تمہاری مما اس وقت سو رہی ہوگی چپکے سے جا کر مما کو سرپرائز دیتے ہیں۔'' دبے پاؤں آگے بڑھتے ہوئے انہوں نے اسفند کو ہدایت دی۔
''لیکن مما ڈور لاک کر کے سوتی ہیں۔'' اسفند نے سرگوشی میں کہا۔
''میرے پاس ڈپلی کیٹ چابی موجود ہے آہستہ سے دروازہ کھول کر بیڈ کے پاس جا کر دونوں ایک ساتھ اونچی آواز میں بولیں گے سرپرائز ٹھیک ہے۔'' انہوں نے چابی نکالتے ہوئے اسفند کو ہدایت دی دونوں باپ بیٹا سرگوشیاں میں بات کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔
اور پھر انہوں نے بغیر آواز پیدا کیے دروازہ کا لاک کھولا اور ایک دم سے پورا دروازہ کھول کر اسفند کا ہاتھ پکڑے وہ کمرے میں داخل ہوئے لیکن سامنے کے منظر نے ان پر کھولتا ہوا تیزاب ڈال دیا تھا روح تک جھلس گئی تھی زیبا کسی اور مرد کے ساتھ بیڈ پر کافی شرمناک حالت میں تھی انہیں دیکھ کر وہ چیخی تھی اور وہ سات سالہ بچہ جو باپ کا ہاتھ تھامے اپنی ماں کو خوشی خوشی سرپرائز دینے آیا تھا اس کے احساسات کو سمجھنا شاید کسی کے بس کی بات نہیں انہوں نے تیزی سے اسفند کو کمرے سے باہر دھکیلا اور اپنے خاص ملازم کو چیخ کر بلاتے ہوئے اسفند کو ان کے حوالے کیا تب تک وہ دونوں بھی سنبھل چکے تھے لیکن جو بربادی اس گھر میں آئی اس روز اس سے کوئی بھی سنبھل نہ پایا، وہ اس بدذات، بے وفا عورت پر چیخ رہے تھے لیکن اس کی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی دیکھ کر الٹا انہیں دوبدو جواب دیتی وہ اسی مرد کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گھر سے نکلتی چلی گئی تھی انہوں نے کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی تھی ایک بار بھی اس نے پلٹ کر اپنے بیٹے کی جانب نہ دیکھا جس کی معصوم روح پر داغ پڑ چکا تھا اور وہ تنہا کمرے میں پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے اپنی مکروہ حرکت کا ذمہ دار اس حرافہ نے انہیں ٹھہرایا تھا کہ ایک کم صورت مرد اور کم دولت مند انسان کے ساتھ وہ نہیں رہ سکتی جو دن رات ایک کر کے کاروبار سے محض اتنا کماتا ہے کہ محض چند ہی آسائشات مہیا کر پاتا ہے وہ اس کا خون کر ڈالنا چاہتے تھے مگر ان کے وفادار اور خاص ملازم اختر بیچ میں آ گئے انہوں نے اسفند کو واسطہ دے کر انہیں انتہائی قدم اٹھانے سے روکا ماں بدکردار اور باپ اس کے قتل میں جیل میں اس معصوم بچے کا کیا بنے گا بہت مشکلوں سے قابو کر پائے تھے، وہ صاحب کو اسفند یہ سب باہر کھڑا سن اور دیکھ رہا تھا اتنا سا وقت پا کر وہ دونوں فرار ہو گئے تھے اور اسفند اپنی ماں کا ہاتھ کسی غیر مرد کے ہاتھوں میں جکڑے دیکھتا رہ گیا تھا اختر بے بسی سے اسے اپنے ساتھ لگائے رو پڑے تھے روح پر گھاؤ دونوں کو ایک جیسے لگے تھے عورت کے اس غلیظ اور مکروہ روپ نے ہر عوت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اعتبار ختم کر دیا تھا ان کا وہ بچہ تھا اور اس عمر میں اتنی مکروہ حقیقت دیکھنا اور جاننا وہ اسے اپنی بانہوں میں بھر کر رونے لگے تھے لیکن اسفند کی آنکھیں خشک تھیں پیاسے صحرا کی مانند ویران اور خشک اور پھر آنے والے وقتوں میں انہوں نے اس کی آنکھوں میں یہی ویرانی ہمیشہ ڈیرے جمائے دیکھا۔

☆☆☆

''کیا مصیبت مول لے لی ہے، عاصم تمہارا یہ احسان اتارنا مجھے بھاری پڑا ہے اور خود ایسے

غائب ہو جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"
کمرے میں چکراتے ہوئے اس نے عاصم کا نمبر ٹرائی کرنا چاہا جو ہمیشہ کی طرح بند تھا فون کو بیڈ پر اچھالتے ہوئے اس کے غصے میں اضافہ ہوا تھا اور پھر فون پکڑ کر وہ اپنے کمرے سے نکل کر ماہ نم کے کمرے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔
غصے میں دستک دیئے بغیر وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا وہ جو شاید ابھی ابھی واش روم سے نہا کر نکلی تھی دھلا دھلا سا سوگوار حسن گھنے لمبے بال بھیگے ہوئے کمر کے نیچے تک پوری پشت کو بھگوئے ہوئے تھے یوں کمرے میں آتے دیکھ کر وہ ٹپٹا کر دوپٹے کو جلدی سے بڑھ کر اوڑھنے کے لئے بڑی ناگواری اس کے چہرے پر واضح تھی اس نے دوپٹہ سر پر اوڑھا تھا اور سوالیہ نظروں سے بدتمیز اکھڑ سے انسان کی جانب دیکھا تھا۔
"آج کے بعد کمرے کو لاک لگا کر رکھنا ہوگا ہر وقت۔" ذہن میں یہی سوچ آئی تھی اس کے۔
"اپنے ڈیڈ کو فون کرو ابھی اور اسی وقت اور انہیں بتاؤ کہ تم یہاں پر ہو فوراً یہ ایڈریس لکھا ہے تمہاری وجہ سے میں یہاں قید ہو کر نہیں رہ سکتا وہ لوگ آئیں اور اس مسئلے کو نمٹائیں۔" فون اور کاغذ کی ایک چیٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ تلخی سے بولا تھا۔
"میرے پاپا زندہ ہوتے تو میں مسئلہ ہی کیوں بنتی۔" آنکھوں کے ساتھ لہجہ بھی ڈبڈبایا تھا سیفی اس کی بات پر چونکا۔
ماہ نم نے کچھ سوچتے ہوئے حویلی کا نمبر ملایا۔
"اللہ کرے پھپھو فون اٹھائیں۔" قبولیت کی گھڑی تھی جو چوتھی بیل پر پھپھو نے فون اٹھایا ان کی آواز سن کر اس کا گلہ رندھ گیا۔
"ہیلو ہیلو۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھپھو کی آواز سنائی دی تھی۔
"ہیلو ماہ نو! ماہ نو تم ٹھیک ہو؟"
"جی پھپھو!" بمشکل اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے اس نے گزشتہ رات کے واقعات مختصر جلدی جلدی سنائے تھے۔
کچھ ضروری باتیں وہ پھر خوف کر گئی تھی جیسے عاصم کا عین موقع پر چھوڑ جانا، سیفی کے والد کا آنا اور پھر نکاح کا انتظام وغیرہ اس نے بس اتنا بتایا کہ اس کا سیفی کے ساتھ نکاح ہو گیا ہے اور وہ ٹھیک ہے اور پھر اس نے سیفی کا بتایا پتہ انہیں بتا دیا تھا فون بند ہونے پر سیفی اپنا سیل فون لے کر بنا کچھ کہے اس کے کمرے سے نکلتا چلا گیا تھا اور وہ خاموشی سے بیڈ پر ٹک گئی تھی، جس مشکل میں وہ پھنس چکی تھی اس سے نکلنے کی راہ اسے سوجھ نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

"وہ بی بی جی! نیچے آئے ہیں وہ...... صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" شام کو صفیہ نے قدرے بوکھلائے سے انداز میں آ کر ماہ نم کو اطلاع دی تھی۔
"تو کیا پھپھو نے فوراً ہی بتا دیا؟" وہ حیرت سے سوچ کر رہ گئی اور پھپھو کا فوراً ایڈریس دے دینے کی اسے سمجھ نہ آئی لیکن پھر بھی وہ چادر میں خود کو چھپائے اندر سے حوصلہ مجتمع کرتی دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آئی تھی، وہاں پر بہت سارے لوگ جمع تھے جو یقیناً فوری طور پر بلائے گئے تھے سب کی موجودگی کے بعد ہی اسے نیچے آنے کے لئے کہا گیا تھا، وکیل نکاح خواں سیفی کے ڈیڈ کے جاننے والے صحافی چند ایک اور بااثر شخصیت سیفی اس کے ڈیڈ اور چچا

اور ان کے چار مسلح دار گارڈ براجمان تھے، کاکا جان بھی ایک طرف خاموشی سے کھڑے تھے اسے سیڑھیاں اترتا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب آئے تھے گویا انہوں نے آگے بڑھ کر اسے حوصلہ دیا تھا۔

''تم ذلیل، احسان فراموش لڑکی۔'' چچا اسے دیکھ کر آپے میں نہ رہے تھے اور اسے مارنے کے لئے آگے بڑھے تھے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ماہ نم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کے آگے ڈال دے۔

''خبردار جو کسی نے میری بیوی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی۔'' سیفی نے تیزی سے درمیان میں آتے ہوئے چوہدری اختیار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وارن کیا تھا اور ماہ نم اس پل پل بدلتے شخص کے تیور دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''چوہدری صاحب بہتر ہوگا کہ اس معاملے کو آرام سے بیٹھ کر حل کیا جائے۔'' وکیل نے اٹھ کر مداخلت کی تھی۔

''معاملہ وغیرہ نمٹانے کی کوئی ضرورت نہیں آج حویلی میں اس کی موت کا سوگ منایا جا رہا ہے صبح ہی پوری برادری میں اطلاع کروا دی گئی تھی کہ اسے کم ذات کو سانپ نے ڈس لیا ہے اور یہ مرگئی ہے زہر نے لاش کو خراب کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے فوراً دفنا دیا گیا یہ اب ہم سب لوگوں کے لئے مرچکی ہے یہاں تو میں بس ایک دو ضروری باتیں نمٹانے آیا ہوں ابھی کچھ گھنٹے قبل یہ اپنی پھپھو کو فون کر کے ادھر نہ بتاتی تو شاید اس کی تلاش میں چند دن اور لگ جاتے مگر اس کمینی کی دیدہ دلیری دیکھو فون کر کے بتا رہی ہے اور وہ فون تو پہلے ہی میرے قبضے میں تھا۔'' چچا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے زہر خند لہجے میں سب پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''تو پھر یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟ جبکہ یہ آپ سب کے لئے مرچکی ہے اس سے اب آپ کا کوئی تعلق واسطہ تو رہا نہیں۔'' سیفی نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا تھا وہ ابھی تک ماہ نم کی ڈھال بنا کھڑا تھا۔

''یہ کچھ کاغذات ہیں اس پر دستخط چاہیے اگر تو یہ آرام سے کر دیتی ہے تو ٹھیک ہم سمجھ لیں گے یہ ہمارے لئے ہمیشہ کے لئے مرگئی ورنہ قبر کی دیواروں تک اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں میں۔''

دولت کی ہوس نے اس کے چچا کا خون سفید کر ڈالا تھا وہ بھول چکا تھا کہ اس کی یہ بھتیجی یتیم اور مسکین ہے۔

''کیسے کاغذات؟'' وکیل نے پوچھا تھا۔

''جائیداد کے جس کی یہ میرے بھائی اور بھابھی کے مرنے کے بعد وارث ہے وہ ساری جائیداد میرے نام کر دے تو بس۔'' سفاکی اور عیاری کی انتہا تھی۔

جہاں وہ سب سن کر ساکت اور حیران کھڑی تھی وہیں سیفی بھی اس بات پر چونکا تھا کہ ماہ نم کے والد اور والدہ کی ڈیتھ ہو چکی ہے اسے ملال چھو کر گزرا تھا ابھی چند گھنٹے قبل اس نے کتنی بے رحمی سے اسے باپ کو فون کرنے کو کہا تھا۔

''ٹھیک ہے یہ ان کاغذات پر دستخط کر دے گی لیکن آپ کو بھی چند کاغذات پر دستخط کرنے ہوں گے۔'' ملک بختاور نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

''کن کاغذات پر؟'' وہ چونکتے ہوئے۔

''آپ کی طرف سے یہ ضمانت دی جائے گی کہ آپ ان دونوں کی شادی پر خوش اور مطمئن ہیں اور انہیں کبھی کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانے کی

کوشش نہیں کریں گے۔'' تحمل سے جواب آیا تھا۔

''ورنہ صورت حال تو واضح ہے یہ دونوں عاقل بالغ ہیں رضا مندی سے شادی کرنے کی اجازت انہیں قانون اور مذہب دونوں دیتے ہیں کورٹ میں جا کر اگر اس نے یہ بیان دے دیا کہ دولت کے لالچ کی بناء پر اسے آپ کی طرف سے جان کا خطرہ ہے تو قانون اسی کا ساتھ دے گا پھر آج کل کا میڈیا بقیہ ادھیڑ کر رکھ دے گا آپ کی شان اور عزت کی جگ ہنسائی اور رسوائی کے علاوہ آپ کو کچھ حاصل نہ ہو گا اس کے حصے کی جائیداد بھی آپ کے ہاتھ سے جائے گی۔'' انہوں نے بات کو مزید واضح کرتے ہوئے گیند گویا ان کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔

''بیٹا آپ دستخط کر دو، وکیل صاحب آپ بھی یہ پیپرز چوہدری صاحب کو دے دیں دستخط دونوں جانب سے ہوں گے۔'' ملک بختاور نے ماہ نم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور سیفی کو سامنے خالی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ماہ نم بھی قدرے فاصلے پر بیٹھ گئی وہ ابھی تک خاموش تھی اور پھر پیپرز پر نظر دوڑاتے ہوئے وہ وکیل کی بتائی جگہوں پر سائن کرتی چلی گئی سیفی نے اس کی ہاتھوں کی ہلکی سی لرزش کو محسوس کیا تھا، پیپرز ایک دوسرے کو دیئے گئے تو چوہدری افتخار فوراً اپنے گارڈز کے ساتھ اس گھر سے بنا کچھ کہے اور ملے باہر نکلتے چلے گئے تھے۔

ماہ نم بس سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی اور وہاں پر موجود ہر شخص کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی ماسوائے سیفی کو جو اصل صورت حال سے ناواقف تھا۔

''بیٹا آپ جاؤ کمرے میں آرام کرو۔'' مختار صاحب نے اس کی ذہنی اور دلی کیفیت کو بھانپتے ہوئے یہاں سے ہٹانا چاہا وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے کی جانب چل دی صفیہ کا کا جان کے اشارے پر اس کے پیچھے گئے تھی۔

☆☆☆

''میں اندر آ سکتا ہوں بیٹا جی۔'' مختار صاحب نے دروازے پر دستک دے کر پوچھا تھا اور وہ جو کب سے چپ چاپ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی جلدی سے اٹھ کر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''جی انکل آیئے۔'' دروازے پر ایستادہ کھڑے ہوئے دیکھ کر ان سے کہا تھا۔

''صفیہ آپ یہ کھانا گرم کر لاؤ، اب تک تو ٹھنڈا ہو چکا ہے۔'' انہوں نے میز پر پڑی کھانے کی ٹرے کی جانب دیکھتے ہوئے پاس کھڑی صفیہ سے کہا دوسرے معنوں میں یہ اس کو کمرے سے نکالنے کا بھی جواز تھا وہ تنہائی میں ماہ نم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے اور ماہ نم کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا، صفیہ خاموشی سے ٹرے پکڑ کر باہر نکل گئی تھی مالک کا اشارہ وہ بھی بخوبی سمجھتی تھی۔

''بیٹھیے بیٹا مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' سامنے بیٹھتے ہوئے انہوں نے صوفے پر ماہ نم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''سب سے پہلے تو میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں کہ بنا آپ سے پوچھے ان کاغذات پر دستخط کرنے کو کہا۔'' انہوں نے واضح انداز میں بات کا آغاز کیا، اس کی خاموشی پر وہ پھر گویا ہوئے۔

''دولت کا لالچ جب لہو میں گردش کرنے

لگے تو پھر خون سفید ہو جاتا ہے اگر آج آپ یہ دولت جیسی افریت سے چھٹکارا نہ حاصل کرتیں تو آپ کے چچا تا عمر بھوکے بھیڑیئے کی طرح آپ کے پیچھے رہتے اور موقع ملنے پر آپ کی ذات کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتے اور ایسی دولت آپ کے کس کام جو رہے تو آپ کے نام لیکن استعمال کرنے کا چارہ نہ ہو وہ سب زمینیں آپ کو وہ لوگ کبھی فروخت نہ کرنے دیتے کورٹ کچہری بھی ایسے معاملات میں تیزی سے معاملہ نہیں نبٹا سکتے خواہ مخواہ اپنی جان کا روگ پال لیتی، لوہا گرم تھا لہٰذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس معاملے کو جلد از جلد نبٹا دوں لالچی انسان کمزور اور بزدل بھی ہوتا ہے امید ہے کہ اب آپ کے چچا آپ کی جاں خلاصی کر چکے ہوں گے۔'' انہوں نے وضاحت دی تھی۔

''آپ کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں میں خود بھی ان سب مصیبتوں سے نجات چاہتی تھی دولت کا مجھے لالچ ہے اور نہ ہوں، میرے بابا نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ میں کہیں پر بھی ملازمت کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہوں۔'' اس نے مختصر الفاظ میں ان تشفی کروائی تھی اس نے دل کی رضا مندی پر ان پیپرز پر دستخط کیے تھے جن کے بعد اس کے کندھوں سے بھاری بوجھ سرک گیا تھا۔

''شاباش تم ایک بہادر اور پر اعتماد لڑکی ہو، پہلی نظر ہی میں میں نے بھانپ لیا تھا اور مجھے ایسے لوگ پسند ہیں تبھی اسی وقت تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا، میں تمہارے والد کی جگہ پر ہوں اور اس ناطے سے تمہیں مشورہ دینے کا حق رکھتا ہوں، مستقبل کے بارے میں میرے پاس تمہارے لئے مخلصانہ تجویز ہیں اگر تم مناسب سمجھو تو اس پر عمل کرو ورنہ اگر تمہارے ذہن میں کوئی پلاننگ ہے تو وہ بھی بتاؤ تم اپنے فعل میں آزاد ہو میں تمہیں صرف یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ تم یہاں رہ کر کسی بھی قسم کی پابندی کا شکار نہیں ہو۔'' انہوں نے ملائمت سے کہا تھا۔

''جی انکل میرا ارادہ کسی گرلز ہوسٹل میں شفٹ ہو جانے کا ہے اور کوئی نوکری کرنے کا۔'' اس نے جلدی سے اپنا خیال بیان کیا تھا۔

''سو فیصد یقین تھا مجھے تم سے کسی ایسی ہی بات سننے کا۔'' وہ نرمی سے مسکرائے تھے۔

''میرے سوالات تمہیں برے اور تلخ لگیں گے لیکن ان کا جواب مجھ سے زیادہ تمہارا ڈھونڈنا بے حد ضروری ہے۔'' اس کے جواب کے لئے وہ ایک پل رکے تھے۔

''جی انکل پوچھیئے میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گی ایسی مشکل گھڑی میں مجھ انجان لڑکی کا جس طرح آپ نے ساتھ دیا ہے میں آپ کی احسان مند ہوں۔'' ان کے ٹھہرنے پر وہ جلدی سے بولی تھی۔

''خیر وہ صرف تمہاری مدد تو نہیں تھی اس میں میری اپنی ذاتی غرض بھی شامل تھی لہٰذا تمہیں چنداں میرا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اور جس ''ذاتی غرض'' کی طرف ان کا اشارہ تھا وہ اس سے پہلو تہی کیے بیٹھی تھی، اس لئے وہ خاموش ہی رہی تھی۔

''تم گرلز ہاسٹل اور نوکری کرنے کی بات کر رہی ہو اور جن حالات سے دوچار ہو کر نکلی ہو مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس انکم کے نام پر کچھ نہیں ہو گا ایسے میں ہاسٹل کا خرچا اور نوکری کون سی تمہیں پلیٹ میں تجی مل جائے گی اس میں بھی محنت اور صبر کی ضرورت رہے گی تو یہ سب کیسے ہو گا۔'' انہوں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا تھا۔

''میری کچھ یونیورسٹی فیلو ہیں اس شہر میں،

میں ان سے ادھار لے کر ہاسٹل شفٹ ہو جاؤں گی اور پھر نوکری کی تلاش اور اس سلسلے میں بغیر ہمدردی اور سفارش کے اگر آپ کے آفس مجھ لائق کوئی نوکری ہو تو مجھے ضرور ذہن میں رکھیئے گا یہ ایک اور احسان ہوگا آپ کا۔" انہوں نے ان کے سوالات کا سنجیدگی سے جواب دیا تھا جس کے بعد وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

"میں تمہیں ایک پریکٹیکل لڑکی سمجھا تھا لیکن تمہارے جواب میں بے حد جذباتی پن نمایاں ہو رہا ہے تم صرف ایک نقطے پر سوچ رہی ہو اور بہت ساری اہم باتوں کو یکسر نظر انداز کر رہی ہو۔" ان کی بات پر اس نے تفہیمی نظروں سے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"تمہارے چچایوں تو جائیداد لے کر یہاں سے گئے ہیں جو اصل میں تمہاری تھی، تمہارا حق تھا اور پھر اس طرح کی بے عزتی، وہ یہ سب بھولنے والے نہیں وہ اپنے سر پر تمہارے نام کی تلوار لٹکا کر نہیں رکھنے والے جب تک انہیں یقین نہ ہو جائے کہ تم ان کے لئے کبھی بھی کسی بھی قسم کا کانٹا ثابت نہیں ہوگی اور یہ یقین انہیں وقت دلائے گا ابھی لوہا گرم ہے اور تم خود یہ سب کر کے ان کے لئے آسان شکار بن رہی ہو وہ تم پر کچھ عرصہ نظر ضرور رکھیں گے اور یوں تنہا پا کر یقیناً تمہیں جان سے مارنے کی کوشش کریں گے پھر ایک تن تنہا لڑکی کے لئے یہ پورا معاشرہ اس جنگل کا روپ دھار جاتا ہے جس میں ہر سو خونخوار بھیڑیے پائے جاتے ہیں مختلف روپ دھار کر بہت مشکل ہے کہ فوری نوکری تمہیں تمہاری قابلیت دیکھ کر نہیں دی جائے گی تمہاری خوبصورتی کو ہر کوئی کیش کرنا چاہے گا، میں معذرت چاہتا ہوں بیٹا مگر حقیقی رخ دکھانا تمہیں بے حد ضروری ہے، میری باتیں تلخ ہیں مگر یہی سچ ہے، میری کوئی بیٹی نہیں ہے اگر ہوتی تو تمہاری عمر کی ہوتی۔" انہوں نے کچھ دیر کو توقف کیا وہ بغور انہیں سن رہی تھی۔

"سیفی کا حوالہ محض اس مسئلے کا حل کے سوا کچھ نہ تھا میں تمہیں یا سیفی کو اس رشتے کو قائم رکھنے کے لئے کبھی مجبور نہیں کروں گا یہ میرا وعدہ ہے اس معاملے میں تم دونوں خود مختار ہو، میں نے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور میرے پاس تمہارے لئے تجویز ہے یا مشورہ سمجھ لو لیکن یہ محض مشورہ ہی ہے تم اس کے باوجود اپنے فیصلے کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہو۔" وہ کچھ لمحے کے لئے رکے۔

"جی انکل بتایئے۔" کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے اس نے کہا وہ اب صحیح نہج پر سوچ رہی تھی انہیں اطمینان ہوا۔

ان کی تجویز اس نے خاموشی سے سنی تھی اسے ان کی تجویز قبول تھی مگر ایک شرط پر جسے سن کر انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا مگر کچھ پس وپیش کے بعد وہ اپنی بات منوا چکی تھی۔

"دو دو ضدیوں سے پالا پڑ گیا ہے میرا تو۔" وہ بے بسی سے بولے تھے۔

"او کے ٹھیک ہے۔" اس کے سر پر دھیرے سے دست شفقت رکھتے ہوئے وہ اس کی بات قبول کر چکے تھے اور پھر وہ اس کے کمرے سے چلے گئے اور ماہ نم نے سینے سے ایک لمبی سانس خارج کی اور یونہی بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگی۔

☆☆☆

وہ کئی مرتبہ عاصم کا نمبر ٹرائی کر چکی تھی لیکن وہ ہر بار بند ہی جا رہا ہوتا تھا، عاصم کے رویے نے اسے بہت ہرٹ کیا تھا جو بھی بات تھی وہ ایک بار اس سے کہتا تو سہی بار بار اسے خیال آیا تھا کہ کہیں اس کے چچا نے ہی مشکل میں نہ ڈال دیا

ہو لیکن پھر اس نے ہی اپنے خیال کی تردید کر دی تھی کیونکہ وہ تو اول روز سے ہی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا چچا کو تو ابھی کچھ معلوم بھی نہیں ہوا تھا اگر اس وقت وہ کسی نہ کسی طرح سے سیفی کو فون کر سکتا تھا تو اسے کیوں نہیں اس سے تو اچھا سیفی تھا جس نے محض اس کا احسان اتارنے کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈالی اور پھر مفت میں گلے میں پڑنے والی آفت یعنی ماہ نم کی ذمہ داری بھی نبھائی ورنہ بیچ سڑک پر اتار کر چلتا بنتا تم جانو اور عاصم اس جانور میں تو پھر بھی انسانیت تھی ماہ نم دل سے اٹھنے والی آوازوں کو دبا کر بھی دبا نہ پائی تھی اور شدید ناپسندیدگی کے باوجود وہ سیفی کی مشکور تھی ورنہ اس وبال میں پھنس کر آج نہ جانے اس کا کیا حشر ہو چکا ہوتا۔

فجر کی نماز ادا کر کے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتی نیچے آئی نماز پڑھ کر اس نے خاص طور پر اپنے استحکام کی دعا کی، اس کا خیال تھا کہ ابھی شاید سبھی سوئے ہوں گے ماسوائے نوکروں کے صنف۔ بہت صبح سویرے اس کے کمرے میں آئی تھی وہ چاہ رہی تھی کہ اس سے گھر کے معمولات کے متعلق جانے لیکن سیفی اس وقت بلیک بنیان اور بلیک ٹراؤزر میں جاگنگ کر کے اندر آ رہا تھا جب وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی وہ اسے نظر انداز کیے کچن کی جانب چلا گیا وہ انگلیاں چٹخاتی ایک پل کو وہاں ٹھہر گئی کہ اب کیا کرے۔

''بٹیا رانی! اس وقت ناشتے کی تیاری ہو رہی ہے آپ آ جائیے ادھر کچن میں۔'' کاکا جان نے مودب انداز میں آ کر اسے مخاطب کیا اور اس کے داہنے جانب بنے کچن کی جانب اشارہ کیا یقیناً مختار صاحب کاکا جان کو اس کے اور اپنے درمیان ہوئی گفتگو سے آگاہ کر چکے تھے اسی لئے۔

''آپ اتنی صبح یہاں کیا کر رہی ہیں، یا کچھ چاہیے؟'' وغیرہ جیسے سوالات پوچھنے کی بجائے اصل بات کی تھی۔

وہ کچن کی جانب بڑھ گئی کتنا مشکل ہوتا ہے ان چاہی جگہ پر ایڈجسٹ کرنا جبکہ آپ بھی سب کے لئے غیر متوقع اور ان چاہے ہوں زندگی اس کے لئے ہر موڑ پر چیلنج لے کر آ رہی تھی اور اسے ہر چیلنج کو قبول کرنا تھا یہ وہ فیصلہ کر چکی تھی اسے اپنے مما پپا خاص طور پر پپا کی تربیت کو شرمندہ نہیں ہونے دینا تھا اسے اچھی طرح سے ادراک ہو چکا تھا کہ حویلی جو فرسودہ روایات میں جکڑی ہوئی تھی اور جہاں پر عورت کو پاؤں کی جوتی کا ہی درجہ دیا جاتا تھا جیسے خاندان سے ہٹ کر کتنی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے انہوں نے اسے تعلیم دلوائی تھی باشعور اور با اعتماد بنایا تھا اسے جینا تھا سر اٹھا کر زندگی سے اپنا حصہ لے کر۔

''صاحب لوگ تو ویک اینڈ پر ہی ادھر آتے ہیں جب دعوت وغیرہ ہو دوست احباب کی یا پھر آرام کرنے کے لئے لیکن یہاں پر نوکر کافی ہیں ان کے کوارٹرز بھی ہیں اور تین ٹائم کا کھانا ان کا یہیں پر بنتا ہے وہ لوگ صبح سویرے ہی اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں اس لئے ناشتہ بھی صبح سویرے بننا شروع ہو جاتا ہے صفیہ اور اس کا خاوند شکور بناتے ہیں کھانا میں گھر کے انتظامات دیکھتا ہوں۔'' کاکا جان نے اسے تفصیل سے بتایا، کچن کافی کشادہ اور انگلش طرز کا بنا ہوا تھا کچن سے متعلق ہر قسم کی جدید مشینری وہاں پر سیٹ ہوئی نظر آ رہی تھی فریج بھی کافی بڑی اور ڈبل ڈور تھی ہر چیز صاف ستھری اور سلیقے سے بھری ہوئی تھی نوکروں کے ہاتھ میں انتظام

ہونے کے باوجود کچن میں کسی قسم کی گندگی اور پھلاوے کا شائبہ تک موجود نہیں تھا۔

''سیفی بابا کو کھانا پکانے کا بے حد شوق ہے بلکہ جنون ہے وہ کسی بھی وقت آ کر کچھ نت نئی ڈشز ٹرائی کرتے رہتے ہیں اور کچن میں کسی بھی قسم کی گندگی یا بدسلیقگی ان کے مزاج کے خلاف ہے اس لئے یہ سب ہائی الرٹ رہتے ہوئے اس کا کونہ کونہ چمکا کر رکھتے ہیں۔'' چم چم کرتے کچن کو توصیفی نظروں سی دیکھتی ماہ نم کو کاکا جان نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی تھی جس پر وہ حیران ہوئے بنا رہ نہیں پائی تھی لیکن اپنی حیرت اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔

''آہستہ آہستہ آپ یہاں کے بارے میں سب کچھ جانتی جائیں گی ابھی آپ ڈائننگ ٹیبل کی طرف چلیے میں ناشتہ لگوا دیتا ہوں۔'' کاکا جان نے اسے خاموش کھڑے دیکھ کر کہا۔

''کیا آپ وہیں ناشتہ کرتے ہیں؟'' وہ نرمی سے مخاطب ہوئی تھی۔

''نہیں بٹیاں رانی، ہم تو یہیں پر۔'' کاکا جان نے مسکراتے ہوئے بتانا چاہا۔

''تو پھر میں بھی یہیں پر کروں گی۔'' ماہ نم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''ارے نہیں بٹیا رانی، صاحب نے مجھے رات کو آپ کے متعلق واضح حکم دیا تھا کہ آپ کی ضد کی وجہ سے وہ آپ کو گھر کے انتظامات دیکھنے کا مان چکے ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ یہاں کوئی ہاؤس کیپر وغیرہ ہیں، آپ ہم سب کے لئے محترم ہیں اور ہم میں سے کسی ایک کی بھی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی آپ گھر کے انتظامات جیسے مرضی سنبھالے کہیں سے بھی روک ٹوک کا سامنا نہیں ہوگا لیکن اگر آپ خود کو ایک ملازمہ کے طور پر یہ سب کریں گی تو ہمارے لئے دشوار ہوگا آپ ناشتہ، کھانا جو مرضی یہاں پر بنوائے یا پکائے لیکن کھانا آپ صاحب لوگوں کے ساتھ ہی کھایا کرے گی اس بات میں وہ مجھے حکم دے چکے ہیں۔'' کاکا جان نے فوراً اس کی خواہش کو رد کرتے ہوئے نرمی سے کہا اور ماہ نم بس چپ ہی رہی اس کا بحث کرنے کو دل نہیں چاہا۔

''کاکا جان! ناشتے میں کتنی دیر ہے؟'' باہر سے سیفی نے بلند آواز میں پوچھا تھا۔

''لا رہے ہیں سیفی بابا۔'' کاکا جان فوراً الرٹ ہوئے تھے شکور جو ناشتہ تیار کر چکا تھا اور ٹرالی میں سیٹ تھا جلدی سے کاکا جان کے اشارے پر ٹرالی گھسیٹتا باہر کی جانب چل پڑا کاکا جان اور ان کے پیچھے وہ بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چل پڑی۔

''السلام علیکم!'' مختار صاحب اور سیفی کو ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں پر بیٹھے دیکھ کر قدرے جھجک کر اس نے دھیرے سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! ارے آؤ بیٹا تم وہاں کیوں کھڑی ہو ناشتہ کرو آ کر۔'' مختار صاحب نے فوراً سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنی بائیں کرسی کی جانب اشارہ کیا جس کے ساتھ والی کرسی پر سیفی براجمان تھا وہ اس وقت وائٹ ٹی شرٹ اور جینز ملبوس کر رکھی تھی وہ ابھی ابھی نہا کر آیا تھا اس کے قدرے بڑھے فرنچ ہیئر کٹ بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا، اس نے انہیں برش نہیں کیا تھا بس انگلیوں سے سلجھا رکھا تھا اس کے بال کافی گھنے تھے اس نے ماہ نم کی موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا وہ کاکا جان کی مدد سے رکھے گئے ناشتے کی جانب پوری طرح سے متوجہ تھا، ماہ نم مختار صاحب کی دائیں جانب کی کرسی پر خاموشی سے جا بیٹھی، سیفی سے تمام عمر ایک فاصلہ بنائے رکھنے کا پختہ

ارادہ کر چکی تھی وہ۔

"سو یو آر اے ارلی رائزر (So you are a early riser) تو تم صبح سویرے اٹھنے کی عادی ہو۔" انہوں نے یونہی بات کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی سر فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مجھے نیند نہیں آتی اس لئے نماز پڑھ کر میں اپنی جاب کو جوائن کرنے آ گئی۔" اس نے دھیرے سے جواب اور کچھ واضح کرنا چاہا، سیفی نے جاب کا ذکر سن کر باپ کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ماہ نم کی ضد پر یہ جب تک یہاں پر ہے ہاؤس کیپر کی جاب کرے گی ورنہ انہیں یہاں رہنا کسی قیمت پر منظور نہیں اور یہ تمہاری طرح ہی ضدی ہے بات منوا کر دم لیتی ہے۔" انہوں نے سیفی کو جواب دیا۔

اس کا چہرہ سپاٹ رہا لیکن آنکھوں میں ابھرنے والی بے چینی کی لہر ان سے مخفی نہیں رہی تھی۔

"اور بیٹا آپ مجھے سر نہیں بلکہ انکل کہا کریں۔" انہوں نے ماہ نم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"دس از مائی آڈر (یہ میرا حکم ہے)۔" ماہ نم کے چہرے پر ابھرنے والی کشمکش و پیچ کی کیفیت دیکھ کر انہوں نے اگلا جملہ سنجیدگی اور دو ٹوک انداز میں ادا کیا۔

"جی سر! میرا مطلب ہے انکل۔" ان کے گھورنے پر وہ گڑبڑا کر جلدی سے بولی تھی۔

"عاصم کے گھر کے باہر میں نے ایک بندے کی ڈیوٹی لگا دی ہے جیسے ہی وہ لوگ آئیں گے ہمیں اطلاع مل جائے گی عاصم سے مل کر میں اس ذمہ داری کو اس کے حوالے کر کے خود بھی اس قید سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔" کسی کو بھی براہ راست نہ دیکھتے ہوئے ناشتے میں مصروف اس نے کہا تھا۔

"عاصم سے مجھے کوئی سروکار نہیں آپ کو یہ "ذمہ داری" اس کے حوالے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں چند مہینوں میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو میں خود ہی کسی وویمن ہاسٹل شفٹ ہو جاؤں گی، بیچ راستے میں چھوڑ جانے والے لوگ بزدل ہوتے ہیں اور مجھے بزدل لوگ بالکل پسند نہیں ایسوں کو میں اپنا دوست تو کیا، جاننے والا بھی نہیں مانتی۔" وہ پر اعتماد لہجے میں بولتی چلی گئی۔

"انکل اگر آپ کی اجازت ہو تو میں پورا گھر دیکھنا چاہوں گی تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہاں پر کس چیز کی ضرورت ہے۔" وہ نیپکن سے ہاتھ اور منہ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ان کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر پر اعتماد چال چلتی صفیہ کو کچن سے بلا کر اس کے ساتھ گھر دیکھنے کا ارادہ کرتی کچن کی جانب بڑھ گئی تھی۔

اس کی بات پر سیفی نے غصے سے نیپکن پٹخا تھا اور تیزی سے ناشتہ کرنے لگا تھا، سنانے کو تو وہ اس کو کھری کھری سنا سکتا تھا مگر نہ جانے کیوں خاموش ہی رہا، مختار صاحب نے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ کو چھپانے کے لئے انہوں نے جلدی سے فریش ایپل جوس کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔

"تم شیر ہو تو وہ شیرنی ہے بیٹا جی ٹکر کا مقابلہ رہے گا۔" دل میں وہ بگڑے موڈ کے ساتھ ناشتہ کرتے بیٹے سے مخاطب ہوئے تھے۔

☆☆☆

جسے وہ اندر سے ایک بڑی کوٹھی سمجھی تھی باہر سے دیکھ کر وہ حیران کھڑی رہ گئی تھی یہ تقریباً دو

ایکڑ میں پھیلا ہوا فارم ہاؤس تھا کوٹھی کے سامنے ایک بڑا سا باغ تھا جس کے درمیان سڑک جو گیٹ تک جاتی بنا کر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا ایک طرف پھل دار درخت لگے ہوئے تھے، امرود، کینو، جامن، لیچی اور آم وغیرہ جب دوسری طرف کا باغ بے حد خوبصورت اور رنگین پھولوں سے سجایا گیا تھا باغ کی ترتیب بے حد آرٹسٹک انداز کی تھی درمیان میں ایک فوارہ بھی لگا ہوا تھا ایک جل پری کے ہاتھ میں بڑی سی سیپ تھی جس سے پانی نکل رہا تھا فوارہ کے اندر کنول کے پھول تیرتے پھر رہے تھے اور راج ہنس کا ایک جوڑا بھی وہیں موجود تھا۔

ماہ نم کو وہ حسین منظر مبہوت کر گیا تھا، پھل دار باغ سے پرے اسے بارن رائیڈنگ کا میدان اور ساتھ میں اصطبل بنا بھی کسی حد تک نظر آ رہا تھا جبکہ دوسرے باغ کے کونے پر ایک سوئمنگ پول اور اس کے پاس ایک بڑا سا کمرہ بنا نظر آ رہا تھا جس کے دروازہ اور کھڑکیاں شیشے کی تھیں کمرہ تقریباً سامان کے بغیر نظر آ رہا تھا۔

''یہ جی سیفی بابا کا سٹوڈیو ہے۔'' صفیہ نے سٹوڈیو کو غلط تلفظ سے ادا کرتے ہوئے ماہ نم کو بتایا۔

''وہ جی یہاں پر تصویریں وغیرہ بناتے ہیں اور جب وہ اس کمرے میں ہوتے ہیں تو انہیں کوئی بھی جا کر ڈسٹرب نہیں کرتا بڑا ناراض ہوتے ہیں جی۔'' اس کے چہرے پر پھیلے سوال کا جواب صفیہ نے دیا تھا ماہ نم ایک بار پھر حیران ہوئی تھی یہ جان کر کہ سیفی ایک مصور بھی ہے۔

''اور جی گھوڑے پالنا بھی ان کا شوق ہے بڑے مہنگے اور قیمتی گھوڑے ہیں جی ان کے پاس ریس وغیرہ میں دوڑاتے ہیں۔'' صفیہ نے مزید اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''ہوں۔'' اس نے آگے جانے کے لئے قدم بڑھائے لیکن وہ اتنے بڑے احاطے کا ایک دن میں ہی سروے کرنے سے قاصر تھی صفیہ کے بتانے پر وہ کوٹھی کے پچھلے حصے کی جانب چلی آئی جہاں پر ایک چھوٹا سا چڑیا گھر موجود تھا کوٹھی تقریباً درمیان میں تعمیر کی گئی تھی اور اس کے چاروں طرف کچھ نہ کچھ بنا ہوا تھا ماہ نم وہاں پر ہرن، چکور، مور اور مختلف نسلوں کے طوطے دیکھ کر حیران اور خوش بھی ہوئی سٹوڈیو کے قریب ایک خوبصورت سا شفاف پانی سے بھرا سوئمنگ پول بھی بنا ہوا تھا ایک سائیڈ پر سبزیوں کے لئے جگہ مختص تھی اور کوارٹرز بھی بنے ہوئے تھے وہ بس دور سے دیکھ کر ہی واپس مڑ آئی تھی کافی وقت گزر چکا تھا باقی سروے اس نے کل پر ملتوی کر دیا تھا ابھی اس نے اندر بھی کمروں کی جانچ کرنی تھی، کاکا جان نے کہا تھا کہ یہاں پر آئے دن دعوتیں وغیرہ ہوتی رہتی ہیں مہمان گیسٹ روم میں بھی ایک دو دن گزارتے ہیں، اسے اگر کسی چیز کو تبدیل کرنے یا اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہو اس کی لسٹ بنا لے اور اس میں پیسے کی پرواہ نہ کرے وہ بہت خوش تھے ماہ نم کو یوں کام کرتا دیکھ کر بقول ان کے اب وہ بوڑھے ہو گئے اتنے بڑے گھر بلکہ فارم ہاؤس کا انتظام سنبھالنا انہیں اب مشکل لگنے لگا ہے اب وہ اس سلسلے میں ان کی مدد کرے گی تو انہیں بھی آرام ہو جائے گا لیکن ان کا رویہ اس کے ساتھ ایک ملازم کا سا تھا۔

''ان سب کاموں کے لئے بہت سارے نوکر ہوں گے؟'' اس نے واپس آتے ہوئے صفیہ سے پوچھا۔

''ہاں جی تقریباً پندرہ بیس تو بن ہی جاتے ہیں ان سب کو کاکا جان نبھاتے ہیں۔'' صفیہ نے جھٹ کہا، اسے یہ نازک سی لیکن پر اعتماد لڑکی

اچھی لگی تھی۔

"اور کاکا جان؟" کب سے ذہن میں گردش کرتے سوال کو اس نے پوچھا۔

"ہے تو وہ بھی نوکر جی لیکن بہت پرانے ہیں بڑے صاحب کے والد کے زمانے سے ہیں بہت اچھے نیک اور مالکوں کے وفادار ہیں شروع سے ہی سارا انتظام وہ سنبھالے ہوئے ہیں بڑے صاحب ان پر بہت اعتماد کرتے ہیں جی اور سیفی بابا کو تو انہوں نے ہی پالا ہے سیفی بابا ان کو بہت خاص درجہ دیتے ہیں انہیں کوئی بھی نوکر نہیں سمجھتا یاہ نم کو جتنی معلومات درکار تھیں وہ اسے مل چکی تھیں بلاوجہ کی کرید اور تجسس اسے پسند نہیں تھا اور نوکروں سے ذاتی سوال تو بالکل نہیں اس لئے وہ خاموشی سے اندر چلی آئی اس کا رخ کچن کی طرف تھا دوپہر میں کیا پک رہا ہے وہ جاننا اور دیکھنا چاہتی تھی۔"

وہ ابھی کچن کے دروازے میں داخل ہی ہوئی تھی کہ کچن سے باہر نکلتے تیزی سے سیفی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی وہ کافی عجلت میں لگ رہا تھا ایک سائیڈ سے ہو کر تیزی سے باہر نکل گیا لیکن اس کا کندھا پھر بھی اس کے بازو سے ٹکرایا تھا مگر وہ اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں تھا۔

"شام کو سیفی بابا کچھ دوستوں کی دعوت ہے کھانا وہ خود ہی بنائیں گے اس کے متعلق ہدایات دے کر گئے ہیں۔" سب کو کچن میں مصروف اور الرٹ دیکھ کر شکور نے جلدی سے انہیں بتایا۔

یہ سن کر ماہ نم اپنے بیڈ روم میں چلی آئی خواہ مخواہ وہاں پر رہنا اسے بیکار لگا تھا اور ویسے بھی ظہر کا وقت تھا وضو کر کے وہ نماز پڑھنے میں مگن ہو گئی عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہی وہ نیچے آئی تھی وہ اپنی جاب میں کوئی کوتاہی نہیں برتنا چاہتی تھی ویسے بھی وہ زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے والی لڑکی تھی زندگی جو اس کے لئے چیلنج لے کر آئی تھی وہ اسے قبول کر چکی تھی اور اس گھر میں اپنی حیثیت کا تعین بھی وہ ایک ہاؤس کیپر تھی اور بس اور ہاؤس کیپر کے کام ہوتے ہیں وہ اسے سر انجام دینے تھے قطعی اس نظر سے بالاتر ہو کر وہ اس گھر میں رہنے والے ایک شخص کو بالکل پسند نہیں کرتی۔

آوازیں چونکہ کچن کی جانب سے آ رہی تھیں وہ کاکا جان کو وہیں پر متوقع ہونے کی وجہ سے ادھر ہی چلی آئی لیکن کچن کا ماحول تو کافی دلچسپ بنا ہوا تھا۔

سیفی ایپرن پہنے نہایت مہارت سے سلائیڈ پر سبزیاں چوپ کر رہا تھا اس کے ہاتھ تیز چھری کے ساتھ برق رفتاری سے چل رہے تھے شکور سنک میں گوشت دھو رہا تھا اور چولہے کے اوپر دو عدد ہنڈیا دھری ہوئی تھیں اسے کچن میں داخل ہوتے دیکھ کر بس ایک نظر سیفی نے اسے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

(باقی اگلے ماہ)

یقیں ساحل گیا سمندر

رمشا احمد

"میرا خیال ہے، نواز ہاتی کے انٹرویو لنچ کے بعد کر لئے جائیں، اس لئے تم باہر بیٹھے ہوئے امیدواروں سے جا کر کہہ دو او کے۔" سرفراز یزدانی نے ہاتھ کا برش بالوں میں پھیرتے ہوئے تھکن سے بازوؤں کو ڈھیلا چھوڑا اور اپنے چپڑاسی سے مخاطب ہوا۔

"جی بہتر سر میں ابھی جا کر کہے دیتا ہوں۔" وہ حکم کا بندہ بجا آوری کے لئے فوراً اور مستعدی سے عمل پیرا ہونے کو اسی وقت آفس سے باہر نکلا۔

سرفراز یزدانی الاعظم ٹیکسٹائل ملز کا مالک تھا، آج وہ اپنی مل کے شعبہ ڈیزائننگ کے لئے دو مختلف آسامیاں کی خالی جگہ پر کرنے کے لئے آئے ہوئے امیدواروں کا انٹرویو کر رہا تھا۔

"اوہ لنچ کے بعد بھی میرا نمبر تو شاید شام سے پہلے نہیں آئے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آئے ہی نہیں، اب کیا ہو گا؟" اس نے دس پندرہ امیدواروں کی لائن کو دیکھ کر مایوسی اور بے بسی سے سوچا۔

ناولٹ

"مجھے تین بجے شاہی آنٹی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے اور اگر وقت پر نہ پہنچی تو پھر دوبارہ سے ڈاکٹر کے پیچھے خوار ہونا پڑے گا، تب کہیں جا کر وہ اپنے قیمتی وقت میں سے ہمیں ٹائم دے گا۔" کنزیا نے چپڑاسی کی زبانی صاحب کا فرمان سن کر اپنے ہونٹ کاٹے اور پریشانی سے سوچا اور اپنے اردگرد طائرانہ سی نظر ڈالی، تقریباً ہر امیدوار کی صورت پر کم و بیش ایسے ہی الجھن کے تاثرات تھے، مگر اس کے ساتھ بہرحال مسئلہ اور تھا، معاً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر صاحب کے آفس کے دروازے کے باہر اسٹول پر بیٹھے چپڑاسی کے پاس آئی۔

''سنیں آپ پلیز میری مدد کریں گے؟''
اس نے اس کے چہرے کو دیکھ کر گویا اجازت چاہی۔
''جی بی بی کیا مدد کروں میں آپ کی؟'' نواز نے اسے سر سے لے کر پیر تک گھورا اور قدرے شائستگی سے جواباً پوچھا۔
''آپ اپنے صاحب سے جا کر کہیں کہ وہ میرا انٹرویو ابھی کر لیں۔'' اس نے اپنی آواز کو حتی الوسع ملتجیانہ بنایا۔
''بی بی، صاحب اس وقت آرام کر رہا ہے، لنچ کے بعد ہی انٹرویو کرے گا۔'' اب کے چپڑاسی نے بمشکل خود کو نرمی سے بات کرنے پر آمادہ رکھا۔
''آپ انہیں کہہ کر تو دیکھیں پلیز؟'' اس نے دوبارہ منت کی، وہ اس وقت اپنی سی کوشش کر رہی تھی ورنہ دوسری صورت میں بغیر انٹرویو دیے ہی جانے کا سوچ لیا تھا اور اس وقت دروازے کی طرف منہ کیے دائیں جانب بیٹھے چپڑاسی سے گزارش کرنے میں مصروف تھی۔
''ایکسکیوزمی میڈم!'' کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا، دو تین قدموں کے فاصلے پر ایک خوش شکل مردانہ وجاہت سے بھرپور دراز قامت شخص کھڑا تھا۔
''آپ پلیز اندر جانے کا راستہ چھوڑ کر کھڑی ہوں۔'' اس کے مڑ کر دیکھنے پر اس نے مسکرا کر خوش اخلاقی سے کہا اور اچانک ہی کنزیا کے ذہن میں بجلی کا کوندا سا لپکا اور وہ ان ہی قدموں پر پوری مڑی اور اس کے مسکرانے سے حوصلہ پا کر اپنی گزارش کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔
''پلیز آپ ہی میری مدد کیجیے ناں۔'' اس نے معصومیت اور اپنائیت سے یوں کہا جیسے یہ امید کی آخری کرن ہو۔
''کیسی مدد؟'' وہ اجنبی اس انجان دوشیزہ کو حیرت سے دیکھنے لگا، جس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں التجا کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا اور لبوں پر امید بھری پکار۔
''آپ اندر جا رہے ہیں ناں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''جی ہاں۔'' وہ بغور اس کے سانولے سلونے پرکشش چہرے کو دیکھنے لگا۔
''آپ اندر جا کر سرفراز صاحب سے کہہ کر میرا انٹرویو ابھی کروالیں، کیونکہ لنچ کے بعد رکنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا، پلیز آپ کہہ دیں ناں۔'' کنزیا نے امید بھری نظروں سے دیکھ کر مان بھرے لہجے میں کہا۔
''اوہ تو یہ بات ہے۔'' وہ بات سمجھ کر مسکرایا۔
''آپ کا نام؟''
''کنزیا احمد۔'' اس نے جھٹ سے اپنا نام بتا دیا، کیونکہ اس نے بھی اندازہ لگایا کہ وہ یقیناً اس کی مدد ضرور کرے گا، جبھی نام پوچھ رہا ہے۔
''کنزیا احمد۔'' اس نے آہستگی سے اس کا نام دہرایا۔
''اوکے چند منٹ انتظار کریں۔'' کہہ کر وہ اس کے برابر سے نکل کر اندر کمرے میں چلا گیا، کنزیا امید وبیم کی کیفیت میں مبتلا واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس نے زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کا سوچا اور پھر ٹھیک دس منٹ بعد اسے اندر بلوا لیا گیا۔
ہلکے آسمانی سادہ سوٹ پر سادہ ململ کے بڑے سے دوپٹے میں اس کے چہرے کے تیکھے نقوش بڑی بڑی بادامی آنکھوں کے ساتھ آسمانی ہالے میں کافی پرکشش لگ رہے تھے، وہ تو پہلی

تفصیلی نظر ڈال کر جیسے ہٹانا بھول گیا، کنزیا نے کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا اور اشارہ ملتے ہی کرسی پر ٹک گئی۔

''مس کنزیا احمد۔'' سرفراز یزدانی نے اسے مخاطب کیا۔

''جی سر۔'' اس نے پر اعتماد انداز میں جواب دیا۔

''آپ کے ڈاکومینٹس؟'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر گلابی فائل اس کے ہاتھ سے لے لی اور کھول کر دیکھنے لگے۔

''بی ایس سی ہوم اکنامکس، ٹیکسٹائل ڈیزائننگ ڈپلوما و بیسٹ ریمارکس، گڈ۔'' سرفراز یزدانی نے فائل سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''مس کنزیا آپ یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہیں؟''

''اس لئے سر کہ میں نے تعلیم اسی شعبے کی مناسبت سے حاصل کی ہے۔'' کنزیا نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

''جاب آپ شوقیہ کرنا چاہتی ہیں یا؟'' سوال کر گیا۔

''جی نہیں سر ایک لڑکی کو گھر سے باہر نکل کر بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور یہ بہت کچھ صرف شوق کی خاطر برداشت کرنا کم از کم میرے لئے تو ناممکن ہی ہے۔''

اس نے مسلسل اپنی طرف گھورتے ہوئے اس اجنبی کو دیکھا کہ جس کی سفارش پر وہ اس وقت یہاں پر اجنان انٹرویو کا مرحلہ نپٹا رہی تھی، وہ میز کے بائیں طرف رکھے صوفے پر بیٹھا تھا، ایک دم سے گڑبڑا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور میز پر رکھی فائل کھول کر دیکھنے لگا، سرفراز یزدانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی، وہ کنزیا کی آنکھوں کا اشارہ اور اس کی بات سمجھ گئے۔

''مطلب یہ ہوا کہ آپ کا کام بادل نخواستہ کریں گی، آپ کی ذاتی دلچسپی اس میں شامل نہیں ہو گی۔'' انہوں نے اپنے کاروبار کے پوائنٹ آف ویو سے سوال کیا۔

''اس کے باوجود بھی سر ڈیزائننگ بہرحال میرا شوق ہے اور شوق کی بہتر تکمیل بغیر دلچسپی کے ناممکن ہوا کرتی ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''مس کنزیا اس سے پہلے کہیں جاب کی ہے آپ نے؟''

''نہیں۔''

''او کے آپ اپنا یہ آخری اور پہلا انٹرویو بھی کہہ سکتی ہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولے۔

''واقعی سر۔'' وہ خوشی سے بے قابو ہو کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

''مگر سر میرے پاس تجربہ تو بالکل بھی نہیں جب کہ آپ کو۔'' وہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی اور پھر سے بیٹھ گئی۔

''جی ہاں اس جاب کے لئے ہم نے تجربے کی شرط رکھی تھی مگر آپ کے ڈاکومینٹس دیکھنے کے بعد اور آپ کے خیالات سننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو آزمانے میں کوئی حرکت نہیں، نئے ٹیلنٹ جو جب تک کام کا موقع نہیں ملے گا تب تک انہیں تجربہ کہاں سے ہو گا، لہٰذا میں یہی سوچ کر آپ کو یہ جاب دے رہا ہوں، امید ہے کہ آپ میرے فیصلے کو درست ثابت کریں گی۔''

سرفراز یزدانی نے ایک نوجوان، بے روزگار کو محض تجربہ ہونے کی وجہ سے نہ ٹھکرا کر نئے ٹیلنٹ کو آگے بڑھانے کے لئے ایک اچھا قدم اٹھایا، وہ ذاتی طور پر اس موقف کے حامی تھے اور

آج انہیں اس پر عمل کرنے کا موقع ملا تھا۔
"تھینک یو سر انشاء اللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی، مجھے آپ کے خیال سے پورا اتفاق ہے کہ تجربہ کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے، بغیر کام کے تجربہ نہیں بلکہ جاب حاصل کرنے کے لئے دھکے کھانے کا تجربہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔"
اس نے آخری جملہ تلخی سے کہا، اس کی آنکھوں میں اپنے محلے کے چند بے روزگار نوجوانوں کے مسائل کا نقشہ گھوم گیا۔
"سر، اب مجھے اجازت ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"بالکل آپ کو تو غالباً ویسے بھی جلدی ہی جانا تھا۔"
"غالباً نہیں یقیناً سر۔" اس نے گھڑی پر نظر ڈالی دو بج رہے تھے، وقت پر پہنچا جا سکتا ہے، اس نے اپنا پرس سنبھالا اور کرسی کھسکا کر اٹھی۔
"آپ کا ڈبل شکریہ سر۔" اس نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔
"ڈبل میرا کیوں بھئی، ایک شکریہ میرا ادا کرو اور ایک شکریے کا حقدار تو یہ فیجان ہے، جس کے کہنے پر میں نے جلدی انٹرویو لیا ہے۔" سرفراز یزدانی نے بے تکلفی سے کہا اور اس اجنبی کی طرف اشارہ کیا۔
"جی سر میں کرنے ہی والی تھی۔" وہ ذرا سا شرمندہ ہو گئی اور شرمندگی مٹانے کو کہہ دیا، حالانکہ اس کا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا، وہ دو قدم چل کر مڑی۔
"آپ کا بھی شکریہ فیجان صاحب۔" پھر وہ خدا حافظ کہہ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔
چند لمحوں بعد ہی فیجان علی نے بھی سرفراز سے اجازت چاہی، تو وہ ناراض ہونے لگا۔
"ارے یار یہ کیا بات ہوئی؟ ابھی آئے ابھی چل دیے، بیٹھو تم ابھی تو میں نے چائے بھی نہیں پلوائی تمہیں اور تم بھاگنے کی کر رہے ہو۔" انہوں نے بیل بجا کر چپڑاسی کو بلوایا۔
"یار اس وقت تو معذرت قبول کرو ذرا جلدی میں ہوں۔" فیجان نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"فیجان ذرا ایک منٹ رکنا تو۔" سرفراز نے اسے بڑھتے دیکھ کر روکا۔
"یار کیا میں شکل سے تمہیں اتنا بے وقوف لگتا ہوں، جو تم مجھے بھی چکر دینے کے چکر میں ہو۔" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
"نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں، تم مان کیوں نہیں لیتے کہ میں نے اس لڑکی کو آج پہلی مرتبہ تمہارے آفس میں ہی دیکھا ہے۔" فیجان نے اس کی بات کا مطلب سمجھ کر وضاحت کی، دوسرے معنوں میں اپنی گلوخلاصی کرانا چاہی۔
"مگر تمہاری اس قدر پرزور سفارش شک میں مبتلا کر گئی ہے پیارے۔" وہ شرارت سے ہنسے۔
"بس یار اس نے کچھ اس انداز سے التجا کی تھی کہ میں رہ نہ کر سکا، ہو سکتا ہے اسے کسی مجبوری کی بنا پر ہی جلدی جانا ہو، یہی سوچ کر میں نے تم سے درخواست کی تھی، بس اتنی سی بات ہے اور تم بتنگڑ بنا رہے ہو۔" فیجان نے جان چھڑانے کو بیزاری سے کہا۔
"چلو مان لیا مگر اب یہ اس کے پیچھے جانے کی کیا عجلت ہے تمہیں۔" وہ شاکی نظروں سے دیکھنے لگا، اس کی طرف۔
"وہ یار دراصل میں مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا اس لئے جا رہا ہوں۔" فیجان نے بوکھلا کر جانے کو قدم بڑھایا۔
"جی نہیں، آپ جناب کہیں نہیں جا رہے

ہیں چلو بیٹھو آرام سے یہاں۔" سرفراز نے اسے دوبارہ صوفے پر دھکا دے کر بٹھا دیا اور خود گھوم کر اپنی نشست پر آ کر بیٹھا۔

"میں ابھی اچھی سی چائے اور اسنیکس منگواتا ہوں، کھاؤ گے ناں؟" سرفراز نے شرارت سے کہا اس نے منہ پھلا کر مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔

اور پھر سرفراز یزدانی نے فیضان علی کو منہ بناتے ہوئے دیکھ کر مسکراتے ہوئے نواز کو چائے لانے کے لئے کہا۔

☆☆☆

لمحہ لمحہ بیت چکا ہے اب جو تم پچھتاؤ تو کیا
بھولی بسری یادیں سب کے آگے بھی دہراؤ تو کیا
لمحہ ...... لمحہ ......

ٹینا ثانی کی خوبصورت آواز کمرے میں گونج رہی تھی وہ کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی تھیں، نگاہیں کھڑکی سے حد نظر آنے والے آسمان پر ٹکی تھیں اور کان ٹینا ثانی کی آواز کا رس اپنے اندر اتار رہے تھے، صبح سے لے کر کوئی پانچویں بار وہ ان ہی بولوں کو اس غزل کے خوبصورت اور پر معانی اشعار کو بار بار ریوائنڈ کر کے سن رہی تھیں، سوچیں الجھ رہی تھیں اور پرانی یادیں آنکھوں کو نم کر رہی تھیں۔

میں بھی تو پچھتاوؤں کے جنگل میں پھنس چکی ہوں مگر شاید میں نے اپنے لئے خود ہی یہ پچھتاوے چنے تھے، زندگی کی اس کٹھن راہگزر پر پاپیادہ چلنے کا یہ مشکل فیصلہ کیا تھا اور اب جو لمحے بیت چکے ان پر پچھتانے سے بھلا کیا حاصل؟ انہوں نے تاسف سے سوچا اور ہونٹ کاٹ ڈالے، وہ شفاف پانی کے قطرے گالوں پر لڑھک آئے۔

افسوس تو یہ ہے کہ میں نے اپنے ساتھ ایک اور زندگی کو بھی پچھتاوؤں کی نذر کر دیا، ایک مرد کی انا سے فیصلے کا بھیانک اور خطرناک کھیل کھیلا اسے زندگی کے سب سے اہم فیصلے کے غلط ہونے کا بڑھ بڑھ کر احساس دلایا، اس کی مردانگی کو بار ہا للکارا، اس سے اپنی ذات کا فخر چھین کر اسے بے وقعت کرنا چاہا، حالانکہ وہ میرا امان بن کر میری زندگی کو اپنی امان میں لینے آیا تھا اس نے اپنی عزت و چاہت سمجھ کر مجھے اپنی حیات میں شامل کیا تھا مگر شاید میں خود غرضی کے بھیانک اور اندھیرے غار میں گر کر روشنی کی کسی ایک کرن کو بھی نہ پا سکنے کی بدقسمتی کے چکر میں آ چکی تھی۔

اپنی خواہش کے حصار کی قیدی بن کر اپنا ہر جرم نظر انداز کرتی چلی گئی، مجھے صرف اور صرف اپنی آرزو ہی کیوں پیاری ہو گئی تھی، اس قدر کہ میں انجانے میں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار بیٹھی۔

انہوں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا، بے آواز آنسو چہرے کو دھو رہے تھے، یہ پچھتاوے کے آنسو تھے، اپنے ہاتھوں اپنی پونجی ضائع جائے تو انسان یونہی متاسف ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے، کسی اور سے کچھ کہہ کر اپنی بے عزتی کرنا ہوتی ہے۔

کون پرایا درد سمیٹے کون مسیحا کہلائے
اپنا درد ہے پیارے لوگوں کو دکھلاؤ تو کیا

کسی سے کچھ کہنے کا یارا بھی تو نہیں ہوتا، یہ تو صرف اپنے ذاتی عذاب ہیں جن کا نزول صرف خود ہی پر ہوتا ہے، انہوں نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا اور وال کلاک پر نظر ڈالی۔

"اور کنزیٰ بیٹا میں تمہیں بتاؤں بھی تو کیا؟ تم جو پوچھتی ہو کہ شاہی آنٹی آپ اتنا اداس کیوں رہتی ہیں؟ تو تمہیں میں ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتی ہوں، کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر بہلا دیتی ہوں، مگر

کنزیا جان سچ تو یہ ہے کہ تم ہی تو ہو جس نے میری زندگی کو، بے مقصد بننے نہیں دیا، بلکہ میں نے تم پر اپنی ممتا نچھاور کر کے انجانے میں اپنی ممتا پر خود سے ہی ہو جانے والے ظلم اور زیادتی کی تلافی کی ہے، مجھے تمہارے وجود نے سکون سے آشنا کیا ہے کنزیا، اب تو تم ہی میرا مان ہو، میری محبتوں کا مرکز حالانکہ۔" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر سر کرسی سے ٹیک دیا۔

"حالانکہ میں اپنی محبتوں کے حقیقی حقدار کو روتا بلکتا چھوڑ آنے کی مجرم ہوں، آہ اب تو پچھتاوے ہی میرے دل کے مکین ہو گئے ہیں، کنزیا بیٹی تمہاری شاہی آنٹی یونہی تو دل کی مریضہ نہیں ہوئی ہے ناں۔" وہ تلخی سے مسکرا پڑیں۔

"زندگی کو ہر احساس سے عاری ہو کر گزارنا بڑا ہی مشکل امر ہے اور تم کہتی ہو کہ شاہی آنٹی آپ کا مجھ پر کتنا بڑا احسان ہے کہ آپ نے مجھ کو اپنی محبتوں سے نوازا، میری پرورش کی، میری بہترین تربیت کی، تم کیا جانو کنزیا بیٹی کہ یہ سب تو میں اپنی زخمی ممتا پر پھاہے رکھنے کو کرتی رہی ہوں ماں کے گداز دل کو زندہ رکھنے کے لئے کہ شاید کبھی اپنے جگر گوشے سے سامنا ہو جائے تو میں تب بھی ممتا کے جذبے سے نا آشنا تو نہ ہوں، آہ یہ دل کے بہلاوے جنہیں چھوڑ آنے کے بعد پلٹ کر نہ دیکھا، ان سے دوبارہ ملنے کی آس بھی کتنی مضحکہ خیز ہے، اپنا ہی منہ چڑانے والی، زخموں پر خود ہی ہنسنے والی بات ہوئی یہ تو۔" انہوں نے بمشکل اپنے نڈھال وجود کو کرسی سے گھسیٹا۔

"دو بجنے والے ہیں ابھی آنے ہی والی ہو گی کنزیا اور آتے ہی شور مچائے گی کہ آپ تیار ہو کر کیوں نہیں بیٹھیں۔" وہ اٹھیں تا کہ مسلا ہوا اور ملگجا لباس بدل کر صاف ستھرے کپڑے پہن لیں، جانا تو بے شک ڈاکٹر کے پاس ہی تھا مگر حلیہ اچھا رکھنا بہر حال ضرور تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی کنزیا دروازے سے ہی جلدی جلدی کا راگ الاپتی گھر میں داخل ہوئی۔

"آنٹی پلیز جلدی کریں ٹائم ہو گیا ہے آپ تیار ہیں ناں ایک تو یہ ڈاکٹر بھی وقت کی پابندی کا مریض لگتا ہے، مجھے خواہ مخواہ دیر ہونے پر شکلیں بنائے گا اور میرا یوں بھاگم بھاگ آنا دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔" اس نے اپنا پرس اور فائل برآمدے میں رکھے تخت پر پٹخے اور دوپٹہ اتار کر پھیلا لیا، کمرے میں جھانکا تو شاہی آنٹی کو اپنا منتظر پایا۔

"آپ تیار ہیں ناں، میں ذرا منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤں، توبہ گھر سے باہر نکلو تو دھویں اور مٹی کی اڑتی ہوئی دھول یوں حملہ آور ہوئی ہے کہ جیسے چوہے پر بلی جھپٹتی ہے۔" وہ ہاتھ روم میں گھس گئی، منہ ہاتھ دھو کر ہاتھوں سے ہی بالوں کو ٹھیک کیا اور دوپٹہ اٹھا کر اس نے پرس اٹھایا تو آنٹی نے بھی اپنی چادر سنبھالی۔

اور پھر ٹھیک تین بجے وہ رضا کلینک میں موجود تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب میری آنٹی ہیں ذرا لاپروا اپنی صحت کے معاملے میں، میڈیسن وقت پر وہ بالکل نہیں لیتیں اور مقدار بھی کم کھاتی ہیں کہ اتنی مہنگی میڈیسن ہیں، اس طرح کچھ تو بچت ہو جایا کرے گی۔" وہ شاہی آنٹی کے گھورنے کی پروا کیے بغیر بولے جا رہی تھی۔

"آپ انہیں سخت قسم کی تاکید کریں کہ یہ لاپروائی چھوڑ دیں اور انہیں یہ بھی بتا دیں کہ یہ ان کی صحت کے لئے کتنی نقصان دہ ہے۔" ڈاکٹر اسرار رضا نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گئیں۔

"میرا خیال ہے مس احمد، آپ کچھ مبالغہ

آرائی سے کام لے رہی ہیں، ان کی صحت کے بارے میں آپ سے زیادہ میں واقف ہوں، انہوں نے کافی امپروو کیا ہے شوگر بھی صحیح ہے اور بلڈ پریشر بھی نارمل ہے جو شکایت آپ کو ہے، وہ ان کی عمر کا تقاضا ہے آپ ان کی دوا کا خیال رکھا کیجئے۔" ڈاکٹر نے اپنی مریضہ کی شرمندگی کم کرنے کو کہا۔

تیماردار کو تسلی سے نوازا، ساتھ ہی اپنے فرض کی حساسیت کا بھی احساس دلایا۔

"اور مجھے ان سے بھی امید ہے کہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گی۔"

"جی ڈاکٹر صاحب میں تو اب بھی ایسا ہی کرتی ہوں مگر کنزیا کو یوں ہی وہم ہو گیا ہے۔" آنٹی نے محبت سے کنزیا کو دیکھا۔

"او کے میرا خیال ہے کہ اب آپ مطمئن ہوں گی۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔" کنزیا مسکرا کر کھڑی ہو گئی اور پھر وہ دونوں ڈاکٹر کا شکریہ بمعہ فیس ادا کر کے کلینک سے باہر نکل آئیں۔

☆☆☆

انٹرویو دینے کے ٹھیک ایک ہفتے بعد اسے لیٹر مل گیا، جس میں اسے اگلے دن سے ڈیوٹی جوائن کرنے کا کہا گیا تھا، اس جاب کا ملنا اس کے لئے بے حد حیران کن تھا خصوصاً اس صورت میں جب کہ اس کے پاس تجربہ بالکل بھی نہیں تھا، وہ عملی طور پر بالکل کوری تھی، مگر پھر بھی خود پر اتنا اعتماد ضرور تھا کہ میں بہتر کام کر لوں گی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تجربہ اور مہارت دونوں حاصل ہو جائیں گے، اس مشہور و معروف اور بزنس کی دنیا میں اچھی ساکھ رکھنے والی ٹیکسٹائل مل میں بطور ڈیزائنر جاب مل جانا کنزیا احمد کو اپنی خوش نصیبی ہی لگی۔

یہ نوکری اس کی اشد ضرورت تھی، ہاں یہ علیحدہ بات تھی کہ اس شعبے میں اس کا شوق بھی جنون کی حد تک تھا، وہ خداداد صلاحیت سے مالا مال بھی تھی اور اس کا ذہن انتہائی آرٹسٹک تھا اور پھر ڈپلومہ حاصل کر کے جہاں اس نے اپنی صلاحیتوں کو پالش کیا تھا وہاں اس کی ذہانت اور صلاحیت کا کھلا اظہار بھی ہوا تھا، جس کا اعتراف ادارے نے اس کے ڈپلومے پر بیسٹ ریمارکس کا نوٹ لکھ کر کیا تھا یہی وجہ تھی کہ اب وہ پر اعتماد اور پر یقین تھی، شوق اور دلچسپی سے کیا جانے والا کام بہر حال اس سے کہیں زیادہ بہتر نتائج سامنے لاتا ہے جو بے دلی سے کیا گیا ہو۔

پیلے اور سفید پرنٹ کے کاٹن کے سوٹ پر پیلا کلف لگا سوتی دوپٹہ اوڑھ کر اس نے جانے سے پہلے آخری مرتبہ آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور مڑ کر سائیڈ ٹیبل سے اپنا پرس اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی، شاہی آنٹی نے بے شمار دعاؤں کو بطور محافظ ہمراہ کیا، آج وہ اپنی جاب جوائن کرنے جا رہی تھی، پہلا دن تھا مگر پھر بھی وہ ذرا نروس نہیں ہو رہی تھی۔

وہ وقت مقررہ پر آفس میں موجود تھی اور تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی سرفراز یزدانی نے اسے اپنے کمرے میں بلوا لیا۔

"السلام علیکم سر!" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام اینڈ ویلکم مس کنزیا احمد۔" انہوں نے مسکرا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تھینک یو سر۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"مس کنزیا ابھی کچھ دیر بعد آپ کو آپ کا کمرہ دکھایا جائے گا اور سیکرٹری آپ کو کام کی عملی

نوعیت وغیرہ سے آگاہ کردے گا۔"
"میں نئی ہوں اس فیلڈ میں مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت بہر حال رہے گی سر۔"
"وائے ناٹ آپ بلا جھجک مجھ سے اپنی پرابلمز کہہ سکتی ہیں۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا اور کھلے دل سے اپنی رہنمائی کا یقین دلایا۔
"تھینک یو سر۔" وہ مشکور سی ان کی طرف دیکھنے گئی۔
"ٹھیک ہے آپ جائیں اور کام اسٹارٹ کریں، متعلقہ فائل آپ کو ابھی بھجواتا ہوں میں اوکے وش یو بیسٹ آف لک۔" انہوں نے اسے جمال کے ہمراہ بھیج کر کہا اور وہ شکریہ ادا کر کے اس کے ہمراہ نکل گئی۔

☆☆☆

اگرچہ مرگ وفا بھی اک
سانحہ ہے لیکن یہ بے حسی
ہی سے بڑھ کر جانکاہ ہے
کہ جب ہم خود اپنے ہاتھوں
سے اپنی چاہت کو نامرادی
کے ریگ زاروں میں دفن
کر کے جدا ہوئے تو نہ
تیری پلکوں پہ کوئی آنسو
لرز رہا تھا نہ میرے ہونٹوں
پہ کوئی جاں سوز مرثیہ تھا۔

"اور شاید اصل دکھ بھی یہی ہے کہ میں نے تمہاری چاہت کو نہ اپنایا تو اور کسی نے میری محبت سے ہاتھ کھینچ لیا اور یہ سب میری ہی وجہ سے ہوا، یہی بنیادی پچھتاوا ہے کہ تم نے مجھے بھی کسی اور سے دور کر دیا اور خود بھی مجھ سے دور ہو گئے، نہ تمہیں کچھ ملا اور نہ مجھے ماسوائے گزرے لمحوں کے پچھتاؤں کے۔" انہوں نے تلخی سے سوچا اور احمد فراز کی کتاب کو بند کر دیا۔

"ان اذیت ناک دنوں اور لمحوں میں نہ تم جھکے اور نہ میں اور پھر ضد بن کر دوری ہم دونوں کے بیچ حائل ہو گئی اور آج کل سورج پچھتاوے کی آگ برسا رہا ہے اور چاند کی چاندنی نارسائی کے دکھوں میں اضافہ کر رہی ہے۔" انہوں نے بند پلکوں اور خاموش لبوں کے ساتھ سوچا۔
"شاہی آنٹی کہاں ہیں آپ؟ پلیز سامنے تو آئیں ناں۔" کنزیا انہیں ڈھونڈتی ان کے کمرے تک آ گئی۔
"اللہ آپ یہاں کمرے میں بند مطالعے میں مصروف ہیں جب کہ باہر بڑے غضب کا موسم ہو رہا ہے، ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی مست خرام ہوائیں اٹھکیلیاں کر رہی ہیں اور پتا ہے آنٹی ایسے میں میرا دل کیا کہہ رہا ہے۔" وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان سے لپٹ گئی۔
"کیا کہہ رہا ہے دل؟" انہوں نے اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرا۔
"آپ سے بہت ساری اچھی اچھی باتیں کروں، چٹ پٹے اور مزیدار پکوڑے کھاؤں، اسٹرونگ سی چائے پیوں اور...... اور۔" وہ اٹھی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر بولی۔
"اور اس بوندا باندی میں بھیگوں۔" اس نے چہرہ تھوڑا باہر نکال کر بوندوں کی بوچھاڑ کو چہرے پر آنے دیا۔
"تم یہ سب کرو مگر اس وقت میرا سر مت کھاؤ، کیونکہ میں تمہارے لئے چٹ پٹے پکوڑے اور اسٹرونگ سی چائے بنانے جا رہی ہوں۔" وہ مسکرا کر اپنے بیڈ سے اترنے لگیں۔
"نہیں آنٹی آپ کچن میں بالکل نہیں جائیں گی۔" کنزیا نے ان کو دوبارہ بستر پر بٹھا دیا۔

"پھر پکوڑے کیسے بنیں گے بھلا؟" وہ اس کو محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگیں۔
"میں نے منیر کو بھیجا ہے بازار۔" اس نے ان کی گود میں سر رکھ کر کہا۔
"اور چائے میں پکوڑے کھانے کے بعد خود ہی بناؤں گی اور آپ کو بھی پلاؤں گی۔" کنزیا نے لاڈ سے کہا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے رخسار سے لگا لیا تو انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔
"کنزیا بیٹا تم نے تو بالکل ہی نکما کر دیا ہے، سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہوں اور تم سارا کام بھی کرتی ہو اور آفس بھی جاتی ہو، کہیں بیمار ہی نہ پڑ جاؤ چندا۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔
"ٹھیک ہے جب بیمار پڑ جاؤں ناں تو آپ تیمارداری کر لیجئے گا خوب جی بھر کے بس۔" اس نے آنکھیں موند کر کہا۔
"اسی طرح شفقت اور محبت سے، میں فوراً ٹھیک ہو جاؤں گی۔"
"خدا نہ کرے جو تم بیمار پڑو، کل سے میرا یہ آرام اب ختم ہی سمجھو تم، حد ہو گئی میں تو سارا دن ہونقوں کی طرح بیٹھی رہوں اور تم گھن چکر بنی رہو، اپنی صحت کا تو تمہیں ذرا بھی خیال نہیں ہے بس کے مجھ بوڑھی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔" انہوں نے ذرا خفگی سے کہا۔
"شاہی آنٹی پلیز ایسا تو نہ کہیں میرے لئے تو آپ ہی سب کچھ ہیں، میں نے بچپن سے لے کر اب تک آپ ہی کے دم سے محبت کے وجود کو محسوس کیا ہے، آپ کی محبتیں مجھ پر رحمت خدا کی بارش کی طرح برسی ہیں، احسان ہیں مجھ پر اور اگر میں اپنی خوشی سے آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں تو آپ یوں کہہ کر میرا مان تو نہ توڑیں آنٹی۔"

کنزیا نے پرنم آنکھوں سے انہیں دیکھا تو انہیں بے ساختہ ہی اس پر پیار آ گیا۔
"میری جان، میری چندا بیٹی میرے لئے بھی تو تم ہی سب کچھ ہو، میں تمہارا مان بھلا کیسے توڑ سکتی ہوں، کیسے؟" آنٹی نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا، اسی وقت گھنٹی کی آواز آئی۔
"شاید منیر آ گیا ہے، آپ یہیں بیٹھی رہیئے گا میں پکوڑے لے کر ابھی آئی۔" وہ باہر کی طرف لپکی۔
جب سے شاہی آنٹی ریٹائر ہوئی تھیں اور شوگر اور دل کی مریضہ بنی تھیں کنزیا نے انہیں مکمل آرام کروا لیا تھا سارا کام وہ خود ہی کیا کرتی اور جاب ملنے کے ساتھ ہی اس نے صبح سے لے کر رات کے بیرونی کام کاج کے لئے ایک بے سہارا لڑکے کو رکھ لیا تھا، وہ رات کے وقت مسجد میں مولوی صاحب کے کمرے میں سونے کے لئے چلا جاتا تھا اور دن کے وقت کنزیا کی غیر موجودگی میں شاہی آنٹی کے چھوٹے موٹے کام نپٹاتا رہتا، دوپہر کا کھانا کنزیا رات کو ہی پکا کر رکھ دیتی تھی، یوں شاہی آنٹی سارا دن فارغ ہو کر سوچوں کی یلغار کے آگے بے بس ہو جایا کرتیں۔
"لیجئے آنٹی گرم گرم پکوڑے اور مزیدار سی چٹنی۔" کنزیا پلیٹ لئے کمرے میں آئی اور پھر اس نے منیر کو بھی کمرے میں بلا لیا، تینوں نے ادھر اُدھر کی دلچسپ باتوں کے دوران چائے پی۔

☆☆☆

کنزیا پابندی سے آفس جاتی رہی، شروع کے چند دن تو عملی کام کا طریقہ کار سمجھنے میں لگ گئے اور خود کو دفتر کے ماحول میں ایڈجسٹ کرنا بھی شروع شروع میں بڑا اہم ہوتا ہے، دفتر کا ماحول صاف ستھرا تھا، سرفراز یزدانی کی ذاتی توجہ

اور حسن سلوک کی بنا پر تمام اسٹاف ایک دوسرے سے دوستانہ رویہ رکھتا تھا اور پھر کام کی نوعیت کے لحاظ سے بھی مل جل کر اور خوشگوار ماحول میں کام کرنے کا نتیجہ اچھا اور سود مند نکلتا تھا، یہی وجہ تھی کہ کام کو بوجھ سمجھے بغیر کیا جاتا۔

''مے آئی کم ان سر؟'' کنزیا نے دروازے پر دستک دی۔

''یس کم آن۔'' سرفراز یزدانی نے اسے بلایا اور اشارے سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

وہ فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھے کنزیا ان کے فارغ ہونے کی منتظر تھی، نظریں جھکائے دونوں ہاتھ گود میں رکھے وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ میز کے دائیں طرف رکھے صوفے پر بیٹھا فنجان علی مسکراتے ہوئے اس کو مسلسل اپنی گہری نظروں کے حصار میں رکھے ہوئے ہے، چند لمحوں بعد اس نے یونہی میز کے دائیں طرف گردن گھما کر نظریں اٹھائیں تو وہ فنجان کی پرشوق انداز اور دلچسپی سے دیکھتی آنکھوں سے ٹکرائیں۔

کنزیا نے اس اچانک تصادم سے گھبرا کر جلدی سے نگاہیں جھکالیں، اس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی بوندیں ابھر آئیں، مگر اس نے اپنی گھبراہٹ عیاں ہونے کے ڈر سے انہیں یوں ہی رہنے دیا، فنجان کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

''ہاں مس کنزیا کیسے آنا ہوا؟'' سرفراز فارغ ہو کر اس طرف متوجہ ہوئے۔

''سر یہ فائل ایک نظر آپ اسے دیکھ لیں اور اوکے کردیں اس میں کلر اسکیمنگ کے نئے شیڈز ہیں۔'' اس نے ایک دم سنبھل کر کہا اور کہنیاں میز پر ٹکا کر فائل ان کی طرف بڑھائی۔

''اوکے میں فائل دیکھ کر کچھ ہی دیر میں آپ کے پاس بھجواتا ہوں، ضرورت ہوئی تو آپ کو بلوالوں گا، ٹھیک۔'' انہوں نے فائل لے کر اس پر سرسری نظر ڈالی۔

''جی بہتر سر۔'' وہ کرسی کھسکا کر اٹھی، بے ساختہ اور سرسری سی نظر اس نے فنجان پر ڈالی اور تیزی سے مڑ کر کمرے سے نکل گئی فنجان اس کی جلدی کو اور تیزی کو دیکھ کر کھل کر مسکرا دیا۔

''توبہ نظر باز ہے سر کا دوست تو، کس طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔'' اس کی آنکھوں میں یہ اپنائیت کا کیسا احساس تھا جو مجھے بھی بوکھلا گیا۔

اور پھر ہر دوسرے تیسرے دن فنجان اسے سرفراز کے کمرے میں نظر آنے لگا، اسی طرح خود پر چپکی اس کی وہ اپنائیت کے احساس سے بھری کچھ کہتی نگاہیں کبھی کبھی کنزیا کو سخت ڈسٹرب کردیا کرتی تھیں، ورنہ اکثر وہ انہیں اور ان کے مخصوص انداز کو نظر انداز ہی کردیا کرتی بہرحال وہ پہلے دن سے ہی فنجان کی عزت کرتی تھی کہ اس نے وقت پر اس کے کام آکر اپنی وقعت متعین کردی تھی، وہ اس صورت میں اس کی حرکات کو نظر انداز کردینا ہی بہتر سمجھتی تھی۔

''آپ بھلے تو جگ بھلا۔'' وہ اس مقولے کی قائل بھی تھی اور اس پر عمل پیرا بھی۔

☆☆☆

تیری آہٹ
سلگتی دوپہر کو ایک پل میں شام کرتی ہے
اتری ہے سواد ہجر میں کچھ اس طرح جیسے
صدائے آشنا کوئی
گھنے، گہرے، اندھیرے جنگلوں کی بے یقینی میں
رخ منزل دکھاتی ہے
روشنی کا کام کرتی ہے

''ہاں کنزیا احمد تم ہی وہ صدائے آشنا ہو میرے لئے جو رخ منزل دکھاتی اور روشنی کا کام

کرتی ہے، تم ہی وہ بادل ہو جسے میری بے خبر زندگی پر برسنا ہے، اسے ہرا بھرا بنانا ہے، کنزیا احمد تم میرا وہ خواب ہو جو میں نے سدا کھلی آنکھوں سے دیکھا اور جس کا اعادہ بند آنکھوں نے بھی بار بار کیا ہے۔" فیجان اپنے بڑے سارے بنگلے کے لاؤنج میں بیٹھا مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے اس کی زندگی اور سوچ کو جھنجھوڑ کر بدل ڈالا تھا۔

اچانک ہی اس کے کانوں میں قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"ہاہا...... ہاہا فیجان علی یہ سب تم کہہ رہے ہو، ہاہا تم ڈال ڈال منڈلانے والے بھنورے، ہر چہرے کو اپنی منزل کہنے والے فریبی، تم فیجان علی کہاں ہو اتنے قابل اعتبار کہ ایک سادہ دل اور معصوم صورت لڑکی تمہارے لئے بے لوث وفاؤں اور پرخلوص عنایتوں کے دیے جلائے، تم فیجان علی خوبصورت چہرہ رکھنے والے ظالم اور بے رحم دل کے مالک ہو، کہاں ہو تم اتنے معتبر، چہ چہ تمہاری یہ خواہش ہاہا۔" اور پھر یہ قہقہوں اور استہزائیہ ہنسی کی آوازیں اس کے دماغ پر ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگیں، اس نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو سختی سے بند کرلیا۔

"نہیں اس میں میرا قصور نہیں ہوتا تھا، میں بھٹک جاتا تھا، بلکہ وہ میرے اندر کی آگ بھڑکا کرتی تھی، میری محرومی مجھے در در بھٹکایا کرتی تھی، میرا انتقام مجھے رسوا کرتا تھا، وہ میں نہیں تھا، وہ فیجان علی نہیں تھا، نہیں نہیں۔" وہ اسی طرح چیختے چلاتے ہوئے بڑے سارے لاؤنج میں اِدھر سے اُدھر وحشیانہ انداز میں چکراتا رہا اور پھر اسی طرح چلتے چلتے وہ میز کے پائے سے الجھ کر گر پڑا تو اسے اپنا کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

"ہیلو سرفراز بیٹا میں فضل کاکا بول رہا ہوں۔"

"نہیں بیٹا خیرت ہی تو نہیں ہے، تم فوراً یہاں پہنچو، فیجان کی حالت بہت خراب ہے۔"

"ہاں ڈاکٹر آچکا ہے تم بھی پہنچو۔" دس منٹ بعد ہی وہ فیجان کے کمرے میں تھے۔

"ڈاکٹر صاحب کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے ناں میرا مطلب ہے ہسپتال میں تو ایڈمٹ کرنے کی، ضرورت نہیں۔" سرفراز پریشانی اور تشویش سے پوچھنے لگے۔

"نہیں سرفراز صاحب ایسی کوئی ضرورت نہیں ان کا بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا اور گرنے کی وجہ سے یہ بے ہوش ہو گئے تھے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" ڈاکٹر اسرار رضا نے تسلی دی۔

"کم از کم کچھ عرصہ مکمل بیڈ ریسٹ کروائیں، دوائیں میں نے لکھ دی ہیں او کے اگر کوئی پرابلم ہو تو مجھے کال کر لیجئے گا۔" ڈاکٹر رضا دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔" وہ ان کے ساتھ ہی باہر نکلے۔

"فیجان مجھے بھی کچھ نہیں بتاؤ گے؟۔" اگلے دن وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔

"کیا یار؟" فیجان نے نقاہت سے پوچھا۔

"اپنے ٹینشن کا سبب؟" وہ بغور اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھنے لگے۔

"کیا کرو گے سن کر؟" اس نے گہرا سانس لیا۔

"شاید کچھ کر ہی لوں۔" انہوں نے اگلوانا چاہا۔

"اچھا۔" وہ بے اختیار ہی ہنس دیا اور آنکھیں موند لیں، چھم سے کنزیا کی شبیہ ابھر آئی، (مجھے کنزیا چاہیے سرفراز؟)

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" سرفراز نے حیرانی سے کہا۔

"یوں ہنسنے کی کیا تک ہے؟"

"ہاں شاید ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔" یوں ہی وہ آنکھیں موندے موندے بولا اور مسکرا دیا۔

"فیضان پلیز یار لگتا ہے تم مجھے پاگل کرنے پر تلے ہوئے ہو۔" وہ خفگی سے اسے گھورنے لگے۔

"ارے نہیں یار، یہ کس نے کہہ دیا ہے تم سے۔" فیضان نے بات اڑانا چاہی۔

"میری چھٹی حس نے۔" وہ پیچھا چھوڑنے پر آمادہ ہی نہ تھے۔

"کمال کرتے ہو یار، وہ کہاں سے آ گئی ہے تمہارے پاس۔" انہوں نے بیزاری سے کہا۔

"ارے ہاں کہاں سے آ گئی پر یاد آیا تمہارے کہنے پر ایک لڑکی سلیکٹ کی تھی نا مس کنزیا احمد یاد آیا تمہیں۔" وہ اس کے جواب کے لئے رکے۔

"ہاں کچھ کچھ، خیریت کیا ہوا اسے۔" اس دل کا شور اور اس کے نام کی ہونے والی گردان کو بمشکل روک کر کہا (وہ مجھے بھولی ہی کب سے میرے یار؟)۔

"یار وہ بہت ذہین اور محنتی لڑکی ہے، میں تو اس کے کام سے بے حد متاثر ہوا ہوں، دیکھنا اس سیزن میں ہمارے پرنٹس کتنے پاپولر ہوتے ہیں۔" وہ خوشی سے بتانے لگے۔

"اچھا یہ تو تمہارے بزنس کے لئے خوش آئندہ بات ہوگی۔" فیضان نے اپنی خوشی چھپا کر پوچھا، وہ کنزیا کی تعریف سن کر اپنے دل میں مزید اس کی طلب کا جوار بھاٹا اٹھتا محسوس کرتا تھا۔

"آف کورس اور مس کنزیا احمد کے انتخاب کے لئے تو میں تمہارا مشکور ہوں، اگر اس دن تم ان کا انٹرویو جلدی لینے کا نہ کہتے تو بہت ممکن تھا کہ وہ بغیر مجھ سے ملے واپس چلی جاتیں۔" وہ واقعی کنزیا کے کام سے مطمئن لگ رہے تھے اور خوش بھی۔

"پھر اس خدمت کا کیا انعام مل رہا ہے مجھے۔"

"جو تم مانگو ہم یاروں کے یار ہیں پیارے مانگو، کیا مانگتے ہو؟" سرفراز نے حاتم طائی کی تقلید کر ڈالی۔

"اس وقت تو وہ تم نہیں دے سکتے، وقت آنے پر مانگ لوں گا، بس یاد رکھنا، مکر مت جانا۔" فیضان نے ان کی پیش کش پر کہا۔

"اچھا مگر ایسی کیا شے ہے؟" انہیں تجسس ہوا۔

"اونہوں آگے کوئی اندازہ مت لگانا غلط بات ہو جائے گی، اس کے لئے وقت کا انتظار کرو۔" فیضان نے انہیں مزید کسی قیاس آرائی سے روکا۔

"او کے جیسا تم پسند کرو۔" وہ ایک دم سے اٹھے۔

"یار اب چلتا ہوں گھر پر بے چینی سے انتظار ہو رہا ہوگا، کافی لیٹ ہو گیا ہوں۔" اور پھر وہ اسے آرام کی تلقین کرتے رخصت ہو گئے۔

وقت کا پہیہ محو گردش رہا اور اسی چکر میں تقریباً ایک مہینہ گزرا جو فیضان نے آرام کرتے ہوئے اور کنزیا کے ساتھ کے خواب اور سپنے دیکھتے ہوئے گزارا، جب کہ کنزیا اپنی جاب کے لئے شوق و ذوق سے مصروف عمل رہی اور سرفراز یزدانی۔

"یار فیضان پھر کب سے جوائن کر رہے ہو آفس، سچ میں تو گھن چکر بن گیا ہوں، ایک

جاؤں اپنے آفس میں ہے تو دوسرا تمہارے پاس، خدا کے بندے کچھ مجھ غریب پر بھی ترس کھاؤ بہت کرلیا آرام اب۔" وہ دہائی دینے لگا۔

"تمہارا اسٹاف تمہارا شدت سے منتظر ہے۔"

"اور تمہارا اسٹاف؟" بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکلا مگر جلدی وہ بات سنبھال گیا، مبادا سرفراز بال کی کھال نکالنے اور ادھیڑنے نہ بیٹھ جائے۔

"واقعی سارا کام تم اکیلے پر آپڑا ہے، میں انشاء اللہ ہفتے کے دن سے دفتر جاؤں گا، کام کا حرج بھی ہو رہا ہوگا اور تمہیں الگ تکلیف اٹھانا پڑتی ہے ریئلی سوناٸس آف یو۔" فیضان نے تشکر اور محبت سے انہیں دیکھا، وہ تہہ دل سے ان کی دوستی پر فخر کرتا تھا۔

"یار صرف تمہارے لئے ورنہ شہلا کے دل سے پوچھو جا کر سخت برا لگنے لگا ہوں اسے ہر وقت موڈ آف کیے رہتے ہے، رقیب روسیاہ بن گیا ہے تمہارا ریسٹ اس کا۔" سرفراز ہنس کر بتانے لگے۔

"اچھا مگر یار بھابھی تو بہت نرم دل ہیں مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"تو میں کون سا جلاد یا ہلاکو خان کہہ رہا ہوں، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یار کہ میں اسے جو ٹائم دیا کرتا تھا وہ اب نہیں دے پاتا، کچھ کام کی زیادتی اور کچھ تمہارے پاس زیادہ آنے لگا ہوں، بس اس بھلی مانس کو یہی شکایت ہے۔" انہوں نے بیوی کی حمایت برائے شکایت کہہ سنائی۔

"اچھا تو یوں کہو نا یار ایسے تو میں بھابھی کا مجرم ہوا، چلو بھئی میں خود بہ نفس نفیس ان کے معافی کا خواستگار ہو جاؤں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا فیضان میں اب چلتا ہوں، اب تم فضل کاکا کے ساتھ گپ شپ کرو۔" سرفراز نے کمرے میں داخل ہوتے بوڑھے فضل کاکا کو دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے فیضان سے ہاتھ ملایا۔

"خدا حافظ فضل کاکا۔" کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

فیضان نے سر بیڈ کی پشت سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں، حسب معمول کنزیٰ کا تصور اس کی بند پلکوں میں اتر آیا اور سوچ ہی سوچ میں وہ اس سے مخاطب ہوا۔

ذرا دیر بعد اس نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں اور فضل کاکا کی طرف دیکھا جو اس کے بیڈ پر اس کے قریب ہی بیٹھے تسبیح پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکیں مار رہے تھے۔

"فضل کاکا۔" فیضان نے بڑی عقیدت سے انہیں پکارا ایک انہی کا وجود تو میری صحرا زندگی میں گلستان کا احساس جگاتا ہے، اس نے خلوص سے سوچا۔

"جی بیٹا۔" انہوں نے محبت و شفقت سے لبریز شہد آگیں لہجے میں جواب دیا تو اس کی روح میں تشنگی کا احساس کچھ اور بڑھ گیا، محرومی ہڑ بڑا کر اٹھی۔

"کاکا میری ماں اتنی ظالم کیوں بن گئی تھیں انہیں ذرا بھی میرا خیال نہیں آیا کہ میں ان کے بغیر کیسے رہ سکوں گا، بتائے کاکا، آپ نے بھی انہیں نہیں روکا، کیوں جانے دیا انہیں، کیوں کاکا؟" وہ آگے بڑھ کر ان کے گلے سے لگ کر رندھی آواز میں بولا۔

"فیضان بیٹا۔" فضل کاکا نے اپنے بوڑھے ہاتھ کی کمزور اور پتلی پتلی انگلیاں اس کے بالوں میں پھیریں۔

"بیٹا میں با اختیار سہی مگر تھا تو اس گھر کا ملازم

ہی، مگر پھر بھی میں نے اپنے طور پر اپنی حدود میں رہ کر تمہارے ابو اور امی دونوں کو ہی بہت سمجھایا تھا۔" انہوں نے سانس بھرا۔

"مگر بیٹا انہوں نے وہی کیا جو ان کے دل میں آیا اور وہ دماغ میں سما گیا، تمہارے دادا اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اگر وہ حیات ہوتے تو یقیناً حالات اتنے نہ بگڑتے، مصلحت کی کوئی راہ نکل آتی۔"

"پھر بھی کاکا اگر دونوں میں سے کوئی ایک مصلحت کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا تو آج میری زندگی تپتا صحرا نہ ہوتی تو میں یوں بوند بوند محبت کو نہ ترس رہا ہوتا۔" اس نے حسرت سے کہہ کر اپنا سر کاکا کی گود میں رکھ لیا۔

"کاکا مجھ سے تو شاید کسی کو بھی محبت تھی ہی نہیں ورنہ امی یا ابو کوئی ایک تو مجھے اپنی پناہوں میں رکھتا، اپنی محبتوں اور شفقتوں کے دامن میں سمیٹ لیتا، ایسا کیوں کیا انہوں نے کیوں؟" وہ سراپا سوال تھا۔

"فیضان بیٹا حوصلہ مت ہارو بہادر بنو خود ان گزری حقیقتوں کے پہاڑ سے مت ٹکراؤ، یہ اسی طرح ایستادہ رہیں گے اور تمہیں زخمی کر دیں گے، انہوں نے جس خود غرضی سے تمہارے حق کو نہیں پہچانا، اس کی سزا قدرت نے انہیں اسی دنیا میں ضرور دی ہو گی، کچی خوشی اور سکون کے لئے وہ بھی ترسے ہوں گے، مگر بیٹا یہ ان کو معاف کر کے خود کو پرسکون کر سکتے ہو، بھول جاؤ کہ تمہارے ماں باپ نے تمہارے ساتھ یہ اذیت بھرا سلوک کیا۔" انہوں نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

"کاکا آپ میرے بزرگ ہیں میرے لئے سکون کی دعا کیا کریں۔" اس نے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لئے۔

"میری تو دعاؤں کا مرکز ہی تم ہو فیضان بیٹا، تمہارے لئے تو میری یہ ناتواں جان حاضر ہے بیٹا۔" انہوں نے گلوگیر لہجے میں اور جھک کر اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے۔

"فیضان بیٹا۔"

"جی کاکا۔"

"بیٹا میری ایک بات مانو گے تم؟" انہوں نے مان سے کہا۔

"کون سی بات کاکا؟" فیضان نے بھی دلار سے پوچھا۔

"بیٹا تم شادی کر لو مجھے یقین ہے کہ ایک محبت کرنے والی خدمت گزار بیوی ہی تمہارے اس ذہنی انتشار اور محرومی کو کم کر سکتی ہے، نئی زندگی کے نئے رنگ پرانی تلخ یادوں کے بدرنگ دھبوں کو ڈھک دیں گے۔" انہوں نے محبت اور شفقت سے کہا۔

"مگر کاکا کون دے گا مجھے اپنی بیٹی؟" وہ استہزائیہ ہنسا (ہاں کنزیٰ احمد اب تو تمہاری موہنی صورت ہی ہر لمحہ میری آنکھوں کے آگے لہرانے لگی ہے، یوں جیسے واہمی تصور کے ہر منظر میں تم ہی ہو، مگر کیا خبر میری زندگی کے حقیقی منظر میں تم آنا پسند بھی کروں گی یا) اس نے الجھ کر سوچا۔

"خدا تمہیں نیک ہدایت دے تم تو ہیرا ہو بیٹے، قسمت کی ستم ظریفی کی دھول میں اٹ گئے ہو، میں خود ڈھونڈوں گا اپنے بیٹے کے لئے لڑکی، تم ہامی تو بھرو۔" انہوں نے محبت پاش نگاہیں اس کے چہرے پر ڈالیں۔

"مگر کاکا مجھے تو اب کوئی بھی اپنی بیٹی نہیں دے گا، میں نے جو کچھ حنا اور وردہ کے ساتھ کیا ہے اس کے بعد تو سب لڑکیاں میرا نام سن کر ہی کانوں کو ہاتھ لگاتی ہیں، توبہ توبہ کرتی ہیں۔" اس نے اپنے کانوں کو چھو کر شوخی سے کہا، (کیا تم

بھی کنزیا احمد ایسا ہی کرو گی؟) دل کے خدشے کو اس نے دھیان سے جیسے سنا ہی نہیں، یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا اور ہنس کر اپنے گزشتہ کارناموں کا حوالہ دیا۔

"جانتا ہوں بیٹا مگر اب تمہاری براہ راست شادی ہی کرواؤں گا میں، پہلے سب تم نے اپنی مرضی سے کیا تھا مگر اب تم مجھے اپنی مرضی کرنے کی اجازت دو۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کاکا اجازت مانگ کر شرمندہ تو نہ کریں، میں اپنی پہلے کی گستاخیوں پر آج بھی شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔" فنجان نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

"بیٹا جو اپنی غلطی پر نادم ہو آنے والے کل میں اس سے بڑھ کر اچھا کوئی ثابت نہیں رہتا، یہ احساس شرمندگی کے حوالے سے نہیں، بلکہ سبق اور تجربے کے حوالے سے سدا یاد رکھنا تاکہ آئندہ زندگی کی مشکلیں خود بخود سہل ہو جائیں۔" انہوں نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"واہ کاکا آپ تو بڑے پتے کی باتیں کرنے لگے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"وقت بہت کچھ سکھا پڑھا جاتا ہے بیٹا سب ذائقے چکھنے کے بعد ہی یہ حال ہے کہ قبل از وقت ہی بتا دیتا ہوں کہ اس چیز کا سودا کیسا ہوگا، تاثیر سرد ہو گی یا گرم پھر بیٹا کیا کہتے ہو میں تمہارے لئے لڑکی۔" انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے کاکا آپ تو سنجیدہ لگ رہے ہیں مجھے۔" وہ ان کے برابر دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرا دیا۔

"ہاں بیٹا اور اب تم بھی سنجیدہ ہو جاؤ، تمہارے سنبھلنے کا صحیح وقت یہی ہے، اگر اب بھی تم نے دیر کر دی ناں تو میری بوڑھی آنکھیں خدانہ کرے جو ایسا ہو تمہاری بکھری شخصیت اور ناکام زندگی دیکھ نہ سکیں گی۔" انہوں نے افسردگی سے کہا، ان کے لہجے میں فنجان کے لئے محبت اور خلوص کی نرماہٹ تھی۔

"آپ کی محبتیں اور دعائیں یونہی ہمراہ رہیں تو اب ایسا نہیں ہوگا کاکا۔" اس نے آگے جھک کر ان کے ہاتھ تھام لئے۔

"آپ مجھے تھوڑی مہلت دیں، میں آپ کو لڑکی کا نام وہ پتہ خود ہی بتا دوں گا پھر آپ باقی کی کارروائی کر لیجئے گا۔" اس نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ دھیرے سے کہا تو فضل کاکا مسکرا دیئے۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔"

"جی کاکا۔" فنجان کا سر مزید جھک گیا (اور اگر کنزیا نے مایوس کر دیا تو؟)

"ٹھیک ہے بیٹا مجھے انتظار رہے گا۔" انہوں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"اب میں چلتا ہوں تم بھی اب سو جاؤ، کافی رات ہو گئی ہے۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"شب بخیر کاکا۔" فنجان ان کے کمرے سے نکلتے ہی اپنے بستر پر آ گیا۔

☆☆☆

سلیمان علی نیازی اپنے والدین کی اکیلی اولاد تھے، بچپن سے ہی نہایت فرماں بردار اور ہر بات سمجھ لینے فوراً مان لینے والے، اس قدر عیش و عشرت اور ناز و نعم میں پلنے کے باوجود کبھی کوئی غلط یا بے جا ضد نہیں کی اور اگر کبھی کی بھی تو بڑوں کے سمجھانے سے سمجھ کر اسے چھوڑ دیا، ان کی عمر کا ہر دور تعلیمی لحاظ سے تو شاندار تھا ہی مگر ان کے کردار کی خوبیوں کے حوالے سے بھی قابل ذکر رہا۔

انہوں نے ایم بی اے کر کے نوجوانی میں

ہی اپنے والد کا کاروبار سنبھال لیا اور مختصر سے عرصے میں ہی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا کر ماں باپ کے دلوں کو خوش کر دیا، بلاشبہ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ والدین جن کا اتنا لائق، خوش شکل اور فرماں بردار بیٹا ہو۔

جب سلیمان علی نے اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے سنبھال لی تو ان کی والدہ کو ہر ماں کی طرح بیٹے کے سر پر سہرے کے پھول کھلانے کا ارمان پورا کرنے کا شوق ہوا، سلیمان علی کی کوئی پسند نہ تھی لہٰذا انہوں نے اس انتخاب کا کلی اختیار اپنی ماں کو دے کر ان کا دل شانت اور من سرشار کر دیا۔

اور پھر بڑی ہی دھوم دھام سے شہنائی کی گونج اور خوشیوں کے قہقہوں کے درمیان شہینہ ان کی زندگی میں اولین بہار بن کر آ گئی، شروع کے کچھ ماہ تو خوشی خوشی پلک جھپکتے میں گزر گئے، مگر جب یہ نئی نویلی مصروفیات کچھ کم ہوئیں اور زندگی کے معمولات کا آغاز ہوا تو سلیمان علی پر عقدہ کھلا کہ شہینہ ایک آزاد خیال وسوچ کی حامل لڑکی ہے جو اپنے کسی بھی فعل میں کسی بھی حتیٰ کہ اپنے شوہر کی بھی دخل اندازی برداشت کرنے کی روادار نہ تھی، اس کی آزادی ہر کسی سے میل ملاقات سلیمان علی کو سخت ناپسند تھی، مگر شہینہ کے نزدیک یہی اصل زندگی تھی اور اس سوشل لائف کو چھوڑنا اس کو منظور نہ تھا، سلیمان علی اسے ایک خاتون خانہ کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے مگر وہ اسے گھر کی چار دیواری میں قید ہو جانا تصور کرتی۔

غرض کہ ان دونوں کی سوچ اور زندگی گزارنے کے فلسفے میں بڑا واضح فرق تھا، آج کل کے عام الفاظ میں مس انڈر اسٹینڈنگ کا شاخسانہ کہا جا سکتا ہے، ذہنی ہم آہنگی کا یہ فقدان ان کی رفاقت کی گاڑی کو ڈانواں ڈول کرنے لگا، توازن قائم نہ ہو تو پھر روانی اور آسانی کا تصور ہی احمقانہ لگا کرتا ہے اور شاید مسئلہ بھی تو پسند ناپسند کا ہی تھا ان دونوں کے بیچ، جس کی خبر اس کشمکش کے دوران سلیمان علی کو ہوئی۔

شہینہ اپنے کزن مبشر احمد کو پسند کرتی تھی مگر سلیمان علی کی شاندار شخصیت اور مالدار حیثیت کا پلہ بھاری ہونے کی وجہ سے اس کے والدین نے اسے بمشکل راضی کیا اور اسے سلیمان کے شاندار اور روشن مستقبل کے بارے میں بتایا جس کے مقابلے میں مبشر احمد کا مستقبل کوئی خاص تابناک نظر نہیں آتا تھا، بہر حال وہ بمشکل راضی تو ہو گئی اور سلیمان علی کی زندگی میں آ گئی مگر پھر بھی وہ اپنے دل کو سدا راضی برضا رہنے پر تیار نہ کر سکی اور مشکل کو آسان بنانے کے لئے کچھ دشواریاں بہر حال سہنا پڑتی ہیں جس کا حوصلہ شہینہ خود میں پیدا نہ کر سکی۔

دوسرے کی پسند بننے کے لئے اور دوسرے کو اپنی پسند بنانے کے لئے کچھ تبدیلیاں اپنے روز و شب اور سوچ و فکر میں لانا اشد ضروری ہوتا ہے، یہ اصول لاگو ہوتا تو دونوں ہی فریقین پر ہے، مگر یہاں پسند ناپسند کا مسئلہ صرف شہینہ کو درپیش تھا وگرنہ وہ تو سلیمان علی کی پسند بن ہی چکی تھی، بہر حال خود کو اس تبدیلی کے عمل سے گزارنے کا ظرف شہینہ میں نہ آ سکا، سفر یہ تھا تو بہر حال کٹھن اور پھر جب شہینہ نے کسی طور بھی اس کو آسان کرنا نہ چاہا تو وہ کٹھن ترین عمل بن گیا۔

سلیمان علی نے اپنے والدین کی حیات تک اپنی انا پر لگی چوٹ کو برداشت کیا، ان کی شادی کے چھ ماہ بعد جب اچانک ان کی حادثاتی موت واقع ہوئی تو یہ صدمہ سلیمان علی کے لئے بہت

جا نکاہ تھا، کئی لمحوں بعد وہ سنبھلے تو ان کی مردانہ زخمی انا تڑپ اٹھی۔

''کیا نہیں میسر ہے شہینہ کو، ایک وجیہہ ذہین اور قابل بزنس مین کی بیوی ہے وہ اونچے خاندان کی اکلوتی بہو بن کر شان سے رہ رہی ہے وہ، اسے شوہر اور ساس سسر کا پیار بھی ملا اور اب ایک نئی خوشی کا پھول بھی کچھ ہی عرصے بعد اس کے آنگن میں کھلنے والا ہے، پھر بھی وہ ناشکری کیسے بن گئی؟ کیا کچھ نہیں ملا اسے میری رفاقت میں، جو اسے بشیر احمد کے ہمراہ مل جاتا، بلکہ اب تو وہ اس سے بڑھ کر ہی اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہے، کیوں سکڑ رہا ہے اس کی طلب کا دامن؟ میری مردانگی کو للکارا ہے، میری بیوی ہو کر بھی کسی اور کی محبت کا اقرار کیا ہے؟ اور اب شہینہ بیگم تمہیں میری انا پر لگنے والی چوٹ کی پوری پوری قیمت ادا کرنا پڑے گی، ہاں یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے اور شاید اپنی زندگی سے متعلق بھی اپنا پہلا اور آخری فیصلہ، مجھے اپنے ماں باپ کی فرمانبرداری اس معاملے میں راس نہ آئی، مگر تمہیں تمہاری خود غرضی کی سزا ضرور دوں گا شہینہ ضرور دوں گا۔'' سلیمان علی راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے سوچوں کے تانے بانے میں الجھ رہے تھے۔

''فضل کاکا۔'' انہوں نے اپنے خاندانی اور دیرینہ ملازم کو آواز دی۔

''جی سرکار۔'' وہ مودب ہو کر پوچھنے لگا۔

''کاکا شہینہ کہاں ہے؟ اسے بلا کر لاؤ یہیں پر۔'' وہ سخت لہجے میں بولے۔

''جی بہتر۔'' وہ کہہ کر چلا گیا اور پھر انہوں نے شہینہ کے کمرے میں آتے ہی اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''شہینہ میں تمہیں طلاق دے کر آزاد کر دوں گا، یہ خیال دل سے نکال دو، ہاں البتہ میں تمہیں آج اور ابھی اپنی زندگی سے نکال رہا ہوں، چلی جاؤ میرے گھر سے اور جا کر وہ زندگی گزارو جس کی خواہش تمہیں ہے، میں اپنی آنکھوں سے تمہارے یہ رنگ ڈھنگ اب مزید برداشت نہیں کر سکوں گا۔'' وہ سخت برہم لہجے میں بولے۔

''ٹھیک ہے اگر آپ طلاق نہیں دیں گے تو میں خلع کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی۔'' شہینہ نے بھی اسی انداز میں گفتگو کو اپنایا۔

''کر لینا تم یہ بھی مگر میں اپنے جیتے جی تمہارا یہ خواب پورا نہیں ہونے دوں گا، سمجھیں تم۔'' غضب ناک ہو کر دھاڑے۔

''یہ تو وقت کا فیصلہ ہو گا سلیمان علی، جو تمہیں قبول کرنا ہی پڑے گا، اگر تم بار سوخ ہو تو کم اثر میں بھی نہیں یہ یاد رکھنا۔'' شہینہ نے بھی چیخ کر کہا۔

''شہینہ آگے ایک لفظ مت کہنا دفع ہو جاؤ میری نظروں سے ابھی اور اسی وقت۔'' وہ بھی اس سے زیادہ زور سے چیخے۔

''میں اس حالت میں تمہارے گھر کی دہلیز پار نہیں کروں گی سلیمان، تمہیں تمہاری اولاد کا تحفہ دے کر ہی جاؤں گی میں، اس سے پہلے ہرگز نہیں۔'' اس نے قطعیت سے کہا اور زہر خند نظروں سے انہیں دیکھا، وہ ہونٹ بھینچے کھڑے تھے اور چند لمحے کڑوی نگاہوں سے اسے دیکھنے کے بعد وہ جھپاک سے کمرے سے نکل گئی اور باہر کھڑے فضل کاکا نے نم ہوتی آنکھوں سے شہینہ کو سلیمان علی کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا۔

فیضان علی کے دنیا میں آتے ہی اس کی ماں نے ممتا سے نگاہیں چرا لیں، اپنے قدرتی فرض

سے منہ پھیر لیا، اس کے دل میں اپنی کوکھ سے جنم دینے والے بیٹے کے لئے محبت کی کوئی کونپل نہ پھوٹی اور ننھے فیضان کو آپا کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کو بھی نہ سوچا، وہ خود غرضی کے بھالے کی انی ممتا کے سینے میں گھونپ کر ہمیشہ کے لئے ان کی زندگیوں سے نکل گئی، اس معصوم بچے کو تنہا چھوڑ گئی، جس نے ابھی چند دن پہلے ہی اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی، جسے ابھی اس کی مٹھاس کا ذائقہ چکھنا تھا، اس کے وجود کی اہمیت کو تسلیم کرنا تھا۔

اس کی ممتا کا بھروسا بنا تھا مگر شہینہ نے تو ایک لمحے کو بھی ماں بن کر نہ سوچا تھا، پھر بھلا اسے یہ احساس کیونکر ہوتا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے اور پھر اس نے اپنے کزن مبشر احمد کی مدد سے بہت کوششیں کیں کہ سلیمان علی اسے آزاد کر دے اپنے نکاح کے پنجرے کی قید سے، مگر سلیمان علی نے اپنا اثر و رسوخ اور تعلقات آزما کر اور پیسہ خرچ کر کے اس کیس کو عدالت میں لمبا ہی کھنچوا دیا یہاں تک کہ مبشر احمد جھنجلا اٹھا۔

''شہینہ تم نے بہت بڑی غلطی کی جو اصل بات سلیمان علی کو پہلے سے ہی بتا دی، آخر تم اس سے کسی اور بہانے سے بھی تو طلاق حاصل کر سکتی تھی۔'' اس کے لہجے میں حد درجہ بیزاری سمٹ آئی تھی۔

''میں نے تو اسے طیش دلانے کی کوشش ہی کی تھی مگر اس نے انتقام کا یہ راستہ نکال لیا، جس کا مجھے گمان تک بھی نہ تھا۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''بہر حال شہینہ اب کیس مزید جانے کتنا وقت لے گا اس کے بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا، میں اور کتنا تمہارا انتظار کروں دو سال کا وقت بہت ہوتا ہے شہینہ۔'' مبشر نے بالآخر کہہ ہی دیا، جو وہ کئی دنوں سے کہنا چاہ رہا تھا اس سے۔

''مبشر!'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تم مجھے یوں بیچ بھنور میں چھوڑ دو گے؟'' اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''دیکھو شہینہ سلیمان علی تمہیں اپنے جیتے جی طلاق نہیں دے گا یہ وہ تم سے کہہ چکا ہے اور اس کی عمر کتنی دراز ہے یہ ہم دونوں کو ہی علم نہیں، میں اس کے مرنے کا انتظار بہر حال نہیں کر سکوں گا، لہٰذا میرے لئے اب اپنی زندگی کے لئے کچھ اور سوچنا ناگزیر ہو چکا ہے۔''

وہ ایک ہی سانس میں سپاٹ سے لہجے میں کہتا اسے پتھرا کر چلا گیا اور وہ اس کو اپنی بربادی کا ذمہ دار بھی نہ کہہ سکی، دوست نما دشمن کا خطاب بھی نہ دے سکی۔

''مگر شاید اپنی بربادی کی ذمہ دار میں خود ہی تھی اور ہوں۔'' وہ آنسو اس کی ساکت آنکھوں سے نکلے اور گالوں پر بہنے لگے۔

مبشر احمد کی شادی میں شہینہ نے زمانے بھر کی تمسخرانہ نگاہوں کا بدقت مقابلہ کیا، کیا اب اسے اپنی آئندہ زندگی میں شاید ان ہی طنزیہ بولتی نگاہوں کو برداشت کرنا تھا، اس کے والدین نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا اور وہ اپنی رسوائیوں اور بربادیوں سمیت اپنے چچا کے گھر میں رہنے پر مجبور تھی، اپنی زندگی تباہ کر کے مبشر احمد اور فضیلہ کی خوشیوں بھری رفاقت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دھواں بھرنے لگتا اور پچھتاوے کے پتھر اس پر ایک ایک کر کے برسنا شروع ہو جاتے۔

''میں اب چاہوں بھی تو تمہارے در پر دستک نہیں دے سکتی سلیمان علی کہ میں تمہاری ہی نہیں اپنی نظروں سے بھی گر چکی ہوں اور اپنی نظروں سے گر کر میں کبھی دوبارہ تمہارا سامنا نہیں

کر سکوں گی، ہاں یہ پچھتاوا البتہ یہ افسوس رہے گا سلیمان علی کہ کیا ہوتا جو میں تمہاری ہمراہی کو دل سے بھی قبول کر لیتی۔" وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتی۔

پھر اس نے خلع حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اس نے جاب کر لی تاکہ مفت کی روٹیاں توڑنے کے طعنے سے خود کو بچا سکے۔

ادھر سلیمان علی نے اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی کے بعد سے خود کو بزنس میں حد درجہ مصروف کر لیا اور ان ہی مصروفیات نے ان کو باپ ہونے کی ذمہ داریوں سے غافل کر دیا، فیجان ماں کی ممتا، محبت اور باپ کی شفقت سے محروم آیا اور فضل کاکا کے ہاتھوں میں پلنے لگا، وہ نعمتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان سے بے فیض اور اپنی عمر کی سوچ کے حساب سے ان محرومیوں کو محسوس کرنے لگا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ بچپن سے ہی بے حد حساس دل اور نازک سوچ سر کھنے والا بن گیا، اس کی شخصیت کی صحیح تربیت نہ ہو سکی اور وہ حساس ہونے کے ساتھ ہی ایک ضدی اور ہٹ دھرم لڑکا بھی بن گیا، اس کی شخصیت دوہری ہو گئی ایک طرف تو وہ انتہائی حساس تھا، دوسری طرف صرف اپنی منوانے والا ضدی۔

والدین کی ناکام و نامراد ازدواجی زندگی نے اس کی ذات کو پنپنے ہی نہ دیا، وہ ہمیشہ ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہا اس کی شخصیت کا کوئی ایک رخ مستحکم نہ ہو سکا، وہ جب انٹر کا طالب علم تھا تو اسے حنا عابدی سے منگنی کر لی، مگر دو سال بعد ہی اسے وردہ خان اپنی نیلی آنکھوں سمیت بہت اچھی لگنے لگی تو اس نے بے دھڑک بھری محفل میں حنا عابدی سے منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا اور وہی انگوٹھی وردہ خان کی انگلی میں مسکراتے ہوئے پہنا دی۔

سلیمان علی کے لئے بیٹے کا یہ رویہ ناقابل برداشت تھا، وہ اپنی برباد زندگی کی رسوائی تو سہہ گئے تھے مگر بیٹے کی زندگی کی تباہی کے آثار دیکھ کر ہی ڈھے سے گئے اور تب انہیں پہلا اٹیک ہوا جو موت کا بہانہ بن گیا۔

قسمت کی ایک اور نامہربانی تھی جو فیجان کے ساتھ روا ہوئی، اب اسے اپنی محرومی کی آگ میں اپنے سمیت سب کچھ جلا کر خاکستر کرنے سے روکنے والا کوئی نہ تھا، گو کہ اس نے بھی سلیمان علی کی بھی نہ مانی تھی، کچھ بھی تھا وہ ان کے کمل قرب کے کچھ دنوں اور شفقت کے چند مظاہروں سے فیض یاب ہوا تو تھا اور یہ اس کی خوش نصیبی ہی تو تھی کہ وہ باپ کی شفقت کے ان چند مظاہروں کی خوبصورت یاد اپنے دل و دماغ میں محفوظ رکھے ہوئے تھا، وگرنہ اس کی زندگی تو بچپن سے ہی ان حقیقی رشتوں کے حیات ہوتے ہوئے بھی ان سے محرومی کی دھوپ میں جلتے ہوئے گزری تھی، حقیقی اور سچے رشتے کے کسی بھی حوالے سے مبرا اور خالی۔

☆☆☆

"مس کنزیٰ احمد پلیز آپ ذرا میرے آفس میں آیئے گا۔" سرفراز یزدانی نے انٹر کام پر اسے آنے کو کہا۔

"یار فیجان تم نے مجھے ڈال تو مشکل میں دیا ہے اب دیکھو تمہاری قسمت ویسے کنزیٰ ہے ذرا مختلف لڑکی یار کہیں لینے کے دینے ہی نہ پڑ جائیں، ذرا دھیان رکھنا ریپوٹیشن کا معاملہ ہے ڈیئر۔" انہوں نے فیجان کی طرف دیکھا جو وال ٹو وال گلاس ونڈو کے پاس کھڑا باہر کے شور وغل سے پر منظر کو دیکھ رہا تھا، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کی طرف رخ موڑا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ اسی لئے مختلف لڑکی

ثابت ہو گی کہ میری بات کا برا مانے بغیر اسے سنے گی ضرور۔"

"ہونہہ متفق ہوں تم سے۔" سرفراز نے تائید کی۔

"آیئے مس کنزیا پلیز تشریف رکھئے۔" انہوں نے کمرے میں داخل ہوتی کنزیا کو دیکھا ہلکے فیروزی کاٹن کے اسٹائلش سوٹ میں سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔

"جی سر فرمایئے۔" اس نے بیٹھتے ہی وجہ دریافت کی۔

"مس کنزیا آپ کے خیال میں، میں کیسا آدمی ہوں؟" انہوں نے فائل بند کر کے ایک طرف کھسکائی، (عجیب مصیبت میں ڈال دیا ہے مجھے یعنی کہ حد ہو گئی اپنی شرافت کے لئے اب گواہیاں اکٹھا کرنی پڑ رہی ہیں) واہ دوست کیا نرالا مطالبہ کر ڈالا ہے تم نے)۔

"جی سر۔" اس نے حیرت سے ان کی شکل دیکھی۔

"میں سمجھی نہیں آپ کی بات؟"

"میرا مطلب ہے کہ۔" وہ ہونق بنے بغلیں جھانکنے لگے۔

"مطلب یہ ہے مس کنزیا کہ میں بحیثیت انسان آپ کی نظر میں کیسا ہوں؟"

"سر آپ میرے باس ہیں اور ایک اچھے اور تعاون کرنے والے انسان ہیں۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر بالآخر ان کی مشکل آسان کر دی۔

"مس کنزیا دراصل اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ میں آپ کا تعارف اپنے دوست کم بھائی سے کروانا چاہتا ہوں۔" انہوں نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

"یہ میرا واحد بہترین دوست ہے فیجان علی، علی گروپ آف کمپنیز کا ایم ڈی، آپ ان سے پہلے بھی مل چکی ہیں مگر بغیر تعارف کے۔"

"جی سر۔" کنزیا نے غایت درجہ حیرانی اور قدرے پریشانی سے سرفراز یزدانی کو دیکھا، (لگتا ہے آج سر کی طبیعت ٹھکانے نہیں)۔

"پلیز مس کنزیا آپ سے درخواست ہے کہ آپ فیجان علی کی طرف سے چائے کی آفر قبول کر لیں، یہ آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔" انہوں نے از حد کڑی آزمائش سے خود کو گزارا۔

"مگر سر آخر یہ مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں؟" وہ خاصے تیکھے انداز میں بولتے ہوئے ہاتھ ٹیبل پر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

"مس کنزیا یہ تو آپ کو مجھے سن کر ہی پتا چل سکے گا ناں۔" فیجان کرسی کے ہتھے پر زور ڈال کر کھڑا ہو گیا، سرفراز نے اپنی گلو خلاصی ہونے پر شکرانے کا ٹھنڈا سانس بھرا، (اب خود بچو)۔

"جی فرمایئے میں سن رہی ہوں۔" اس نے بیٹھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"یہاں نہیں پلیز آپ میرے ساتھ آیئے۔" فیجان نے نرمی سے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

"جی۔" اس نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"کسی اوپن ائیر ریسٹورنٹ میں جہاں چائے کی پیالی کے ہمراہ میں آپ کو اپنی بات بہ آسانی سمجھا سکوں۔" فیجان نے نرم مسکراہٹ کے درمیان کہا۔

"سوری مسٹر فیجان علی، میں آپ کے ساتھ یوں باہر جا کر کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتی، آپ کو جو بھی بات کہنا ہے یہیں مسٹر فراز کے سامنے کیجئے۔" اس نے ترشی سے کہا۔

"مگر مس کنزیا میرے خیال میں تو اس میں

کوئی حرج نہیں۔"

"میرے اور آپ کے خیال میں اور زمانے کی سوچ میں بہت فرق ہے بہتر یہی ہے کہ ہم بھی کھلے دل سے اس فرق کو تسلیم کریں، اس میں بھی تو کوئی حرج نہیں؟" اس کا ٹھوس لہجہ اور مضبوط دلیل فیجان کے ساتھ ساتھ سرفراز یزدانی کے دل میں بھی ترازو ہوگئی۔

"ٹھیک ہے یار فیجان تم بیٹھ کر آرام سے بات کر لو میں اپنے کام میں مصروف ہوں۔" انہوں نے انٹرکام پر ڈسٹرب نہ کرنے کا کہہ دیا اور فائل کھول لی۔

فیجان نے چند لمحے آنکھیں موند کر اپنے منتشر خیالات کو یکجا کیا، کچھ لمحے خود کو بات کے آغاز کے لیے تیار کیا اور پھر کنزیا کے آپس میں الجھے ہوئے ہاتھوں کی حرکات وسکنات سے اس کی گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔

"مس کنزیا ہو سکتا ہے کہ آپ کو میری یہ جسارت ناگوار گزری ہو، مگر میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا آپ تک اپنی بات پہنچانے کا، میں اصل بات کرنے سے پہلے اپنے ماضی کے بارے میں آپ کو کچھ حقائق بتانا چاہوں گا جو بہر حال میرے کل کا حصہ رہے ہیں اور جو آپ کسی کی بھی زبانی آج نہیں تو کل سن سکتی ہیں۔"

"چلو بھئی قصہ مختصر کیا اسٹارٹ لیا ہے یار تو نے؟" سرفراز نے مایوسی سے سر ہلایا اور فائل پر کچھ مزید جھک گئے۔

"مس کنزیا میری سچائی کی یہی دلیل ہے کہ میں آپ کو صرف اپنی خامیوں سے آگاہ کروں گا۔" اس کے لہجے کی سچائی متاثر کن تھی۔

"(جہاں ہاں تاکہ وہ آدھی بات سن کر ہی تم پر لعنت بھیج دے)۔" انہوں نے جل کر اسے کن انکھیوں سے گھورا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ میری مکمل بات سن کر اگر آپ مجھے کسی قابل سمجھیں گی تو میری خوبیاں بھی آپ پر ضرور عیاں ہو جائیں گی۔" وہ دل میں اتر جانے والے انداز اپنائے ہوئے تھا۔

(گویا ابھی عقل نے مکمل ساتھ نہیں چھوڑا)، وہ تبصرہ دل ہی دل میں جاری رکھے ہوئے تھا اور پھر اس نے اپنے والدین کی ناکام زندگی کی چیدہ چیدہ باتیں اسے بتائیں اور اس کے اپنی ذاتی زندگی پر اثرات اور پھر اس کے نتیجے میں ہونے والے ردعمل کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

"مجھے حنا عابدی اور وردہ خان سے محبت ہوتی تو یقیناً میں اپنے دل کا ایک ایک زخم ان کے سامنے کھول دیتا، مگر مجھے ان میں مسیحائی کا کوئی ہنر بھی دکھائی نہیں دیا، کئی ملاقاتوں کے بعد بھی اور مس کنزیا آپ سے دو ملاقاتوں کے بعد مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا ہے کہ آپ زخموں پر مرہم رکھنے کا فن جانتی ہیں، آپ کی رواداری ظاہر کرتی ہے کہ آپ کو پرورش محبت اور ممتا کی آغوش میں بہترین تربیت کے ساتھ ہوئی ہے اور آپ کی یہی بات مجھے اپنی خوش نصیبی کا نشان راہ لگتی ہے، روشنی کی کرن بن کر میرے تاریک دل کو روشن کرتی ہے۔" فیجان نے بغور سنتی ہوئی کنزیا کو دیکھا۔

"مس کنزیا میں نے اپنے ماضی کے ہر ورق کو آپ کے سامنے الٹ دیا ہے اسے کھول کر آپ کو سنایا ہے، اس میں وہ سزا بھی ہے جو مجھے اپنے والدین کے غلط فیصلے کی وجہ سے ملی اور اس میں وہ غلطیاں بھی ہیں جو میں نے کیں اور جن پر اب میں شرمندہ ہوں، آپ کا فیصلہ مجھے ان کی معافی یا سزا کی صورت میں ملے گا۔"

''جی کیسا فیصلہ؟'' اس نے بڑبڑا کر، بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں آپ کو پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''جی۔'' اس نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

''مس کنزیا اس سب کے آخر میں میں پوری سچائی سے کہتا ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے، مجھے محبت ملی تو نہیں مگر آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ مجھے محبت ہو گئی ہے تو ایک یہ مجھے مل بھی جائے گی۔'' فیجان نے آہستگی سے کہہ کر سر کرسی کی پشت سے ٹیک دیا اور نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

کنزیا پتھر کی مورت بنی ساکت و جامد بیٹھی رہ گئی۔

''سرفراز یار آج چائے نہیں پلواؤ گے؟''

''کیوں نہیں ابھی آجاتی ہے۔'' انہوں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

''سوری سر میں اب مزید یہاں نہیں رک سکتی۔'' وہ تیزی سے اٹھی اور بغیر کسی طرف دیکھے کمرے سے نکل گئی اور وہ دونوں دیکھتے ہی رہ گئے۔

☆☆☆

سوچوں کا سلسلہ لامتناہی اس وقت ہو جاتا ہے جب آپ کے سامنے تمام حقائق بھی بے نقاب ہوں اور آپ کی اپنی خوبیاں اور خامیاں بھی۔

کنزیا احمد کے لئے بھی فیجان علی کا پرپوز کرنا ایسی ہی سوچوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اپنے ساتھ لایا تھا، وہ کشمکش میں تھی، وہ متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی بھی نہ تھی کہ ایک امیر نوجوان کی دولت و امارت سے مرعوب ہو جاتی، اس کے والدین کا شمار بھی اچھے خاصے امیروں میں ہوتا تھا گو کہ یہ بات ماضی کی تھی مگر پھر بھی اس کا بچپن اور لڑکپن اسی ماحول میں گزارا تھا، وہ نا آشنائے آسائش نہ تھی۔

فیجان علی کی باتوں پر دل ایمان تو لے آیا تھا مگر ابھی اس کا یقین کامل حاصل ہونا باقی تھا، جبکہ عقل و دل میں ایک سرد جنگ چھڑی ہوئی تھی، اس کے لہجے کی سچائی اس کی آنکھوں کی محرومی اور اداسی، یہ سب ایک ساتھ جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا، سوچوں کے ان ہی مدوجزر کے ساتھ وہ بہتی جا رہی تھی، مگر ابھی اس کا یقین کامل حاصلہ کو نا باقی تھا۔

''انجو چندا کیا بات ہے آج آفس نہیں جانا؟'' شاہی آنٹی نے بیڈ کے سرہانے سر ٹیک لگائے اسے ست بیٹھے ہوئے دیکھا۔

''آپ کو یاد ہے میرے ممی پاپا کا جب انتقال ہوا تب میری عمر کیا تھی؟'' اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ پر بٹھا دیا۔

''یہ سوال کیوں کیا آج؟''

''یونہی ذرا خیال سا آ گیا تھا۔'' اس نے نظریں چرائیں اور انہیں اس کا معصوم بچپن یاد آ گیا۔

وہ دن ان کی نگاہوں کے سامنے پھر گیا جب مبشر احمد اور فضیلہ نے چار سالہ کنزیا کو ان کے حوالے کر کے اپنے دوستوں کی فیملیز کے ساتھ ہاکس بے جانے کا پروگرام بنایا تھا اور پھر اس دن کی ڈھلتی ہوئی شب ان کے سپرد سمندر ہو جانے کی روح کو لرزا دینے والی خبر کے ساتھ تمام ہوئی تھی۔

''آنٹی کیا سوچنے لگیں آپ؟''

''کچھ نہیں۔'' انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

''آنٹی ایک بات پوچھوں؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپ اپنے ماضی کو بھولتی بھی نہیں ہیں اور اپنے دکھ شیئر بھی نہیں کرتیں، آخر انسان کا کوئی تو ایک دوست ایسا ہونا چاہیے ناں جس سے وہ اپنے غم، اپنے ملال کہہ سکے، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔''

''ہاں بیٹا ایسا دوست ہونا تو چاہیے، مگر ایسے دوست ملنا کمال درجہ خوش قسمتی سے ہی ممکن ہوسکتا ہے، ورنہ تو ہم بندے اپنے ذرا سے مفاد کی خاطر اپنی چھوٹی سی ضد کو پورا کرنے کی کوشش میں بعض اوقات اپنی ایسی خوش نصیبی کو بھی کھو دیتے ہیں اور پھر بیٹا محبت خلوص کے بغیر ایسا پھول ہوتی ہے جس کی خوشبو اڑ چکی ہو، ایک ایسی بے رنگ تتلی جو کسی بے رحم ہتھیلی پر اپنے رنگ چھوڑنے پر مجبور ہوگئی ہو۔'' ان کے لہجے میں دکھ کی لہریں دھیمے دھیمے اٹھ رہی تھیں۔

''مگر آنٹی یہ پہچان کیسے ہو کہ یہ محبت خلوص سے پُر ہے یا خالی؟'' کنزیا نے اپنی سوچ کے الجھے ریشم کا جیسے سرا ہاتھ میں کرنا چاہا۔

''شاید تسخیر کا کوئی ایک لمحہ یہ یقین دے جاتا ہے یا پھر وقت کا کچھ دورانیہ اس پرکھ کو عقل کی کسوٹی پر پورا اتارتا ہے، دل کے دروازے پر ہونے والی ہر دستک پر دروازہ نہیں کھولنا چاہیے کیونکہ بعض اوقات تیز ہواؤں سے بھی تو در بجنے لگتے ہیں اور دستک کا گمان ہوتا ہے اور اس گمان کو یقین کے روپ میں دیکھنے کی آرزو کرنے والا، پچھتاوے کا زہر ہی پیتا رہ جاتا ہے، قطرہ قطرہ کر کے۔''

وہ پھر سے اپنے اندر بھڑکتی ہوئی ملال کی آگ میں ننگے پاؤں چلنے لگیں۔

''آنٹی آپ رو رہی ہیں؟'' کنزیا نے ان کے آنسو صاف کیے۔

''اچھا مجھے پتا بھی نہیں چلا۔'' وہ مسکرا کر اس کے ہاتھ ہٹانے لگیں۔

''کن خوامخواہ کی باتوں میں الجھا دیا تم نے ناشتہ تو وہیں پڑے پڑے ٹھنڈا ہوگیا ہوگا، چلو اٹھو جلدی سے ناشتہ کرو...... آؤ۔'' وہ عجلت سے بولتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھیں کہیں وہ پھر سے ان بے معانی باتوں میں نہ الجھا دے۔

''گویا کہ اب مجھے اس گھڑی کا انتظار کرنا ہے فیضان علی جب مجھے آپ کی محبت کا مجسم یقین ملنے کا لمحہ تسخیر کرے گا یا پھر وقت کا کچھ دورانیہ ابھی اور گزارنا ہے جب تک کہ دل دروازے پر ہونے والی یہ دستک اپنے بار بار ہونے سے کوئی احساس نہیں جگاتی۔'' اس نے اپنے منتشر دماغ کی بکھری سوچوں کو یکجا کر کے دل میں عزم سے سوچا۔

☆☆☆

''سر آپ یہ کلر میچنگ دیکھ کر او کے کر دیجیے تاکہ میں اس کی ڈیزائننگ کا کام اسٹارٹ کر دوں آج ہی۔'' وہ ڈھیر سارے کارڈ پکڑے کھڑی تھی۔

''سر یہ دو اور تین شیڈز کلر اسکیم ہے، آپ کو ضرور پسند آئے گی اور سر مارکیٹ کے لئے یہ بالکل نیا آئیڈیا ہے اور یقیناً یقیناً ویلیو ایبل بھی ہو گا۔'' اس نے کارڈز میز پر پھیلائے۔

''مس کنزیا آئی ایم سوری اس وقت مجھے ضروری جانا ہے یہ سبجیکٹ کل ڈسکس کر لیں گے۔'' سرفراز یزدانی نے کارڈز ایک طرف کر دیئے۔

''سر خیریت تو ہے آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں؟'' اس نے اخلاقاً پوچھا۔

''ٹھیک سمجھا آپ نے دراصل مجھے ابھی ہسپتال جانے کی جلدی ہے، فیضان کے پاس۔'' انہوں نے دو فائلوں کو باہم ملا کر باسکٹ میں

رکھا۔
"میں اس کی وجہ سے سخت اپ سیٹ ہوں۔" انہوں نے کار کی چابیاں میز پر تلاش کیں۔
"اوہ۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"سر کیا ہوا انہیں؟"
"اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا، چار دنوں میں ہی برسوں کا بیمار لگنے لگا ہے وہ، سچی خوشی کی طلب رکھنے والے یوں ہی بے اعتبار ہوتے ہیں، یہی سوچ اس کے ڈپریشن کا سبب بنی اور پھر تو یہ نتیجہ ہی نکلنا تھا۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
"اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" کنزیا نے ہونٹ کاٹے وہ ان کا اشارہ سمجھ رہی تھی۔
"بہتر ہے پہلے سے۔" وہ چابی اٹھا کر کرسی سے اٹھے اور بغور اس کی طرف دیکھا۔
"مس کنزیا ایک بات کہوں؟" وہ لمحہ بھر کو رکے اس کا ردعمل دیکھنے کے لئے ہمہ تن گوش تھی۔
"آپ اسے میرا مشورہ سمجھیں یا کچھ اور بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ جو شخص اپنے منہ سے اپنی وہ خامیاں جو فی الوقت آپ کی نظروں سے اوجھل بھی ہوں اور عین ممکن تھا کہ اس کی آپ کے علم میں نہ آسکتیں وہ سب حرف بحرف بتا دے تو اس سے بڑھ کر سچائی اور خلوص کی دلیل کیا ہو گی اور ایسی دلیل دینا کم از کم آج کے دور میں تو ناممکن ہی ہے میں اس وقت کی اس کی باتوں کا امین اور گواہ بھی ہوں، اسی لئے یہ سب کہہ بیٹھا ہوں، ہو سکے تو ایک بار پھر اس بات پر غور کر لیجئے گا۔"
سرفراز نے ٹھہرے ہوئے انداز سے کہا اور اس کے پیچھے گھوم کر دروازے کی طرف بڑھے اور کنزیا بھی گم صم سی ان کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے نکلی۔

☆☆☆

"کنزیا جان کیا بات ہے کل سے تم بہت الجھی ہوئی لگ رہی ہو؟" شاہی آنٹی نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
"ہاں آنٹی میں واقعی الجھ گئی ہوں۔" اس نے چونک کر کہا۔
"مجھے بھی کچھ نہیں بتاؤ گی کیا؟" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر بیڈ تک لائیں اور دونوں برابر برابر بیٹھ گئیں۔
"ابھی بتانے لگی ہوں آنٹی۔" اس نے اداسی سے مسکرا کر کہا اور ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔
"آنٹی ایک شخص ہے جس نے اپنے بچپن سے لے کر اب تک سچی محبت اور حقیقی خوشی کی اصل شکل کبھی نہیں دیکھی وہ محرومیوں اور نارسائیوں میں گھر ا رہا، یوں سمجھے آنٹی کہ۔"

اس اکیلی چٹان نے
سمندر کے ہمراہ
تنہائی کا زہر اتنا پیا ہے
کہ اس کا شہر بدن نیلا پڑنے لگا ہے اور

آنٹی اس نے میرے ساتھ کو وہ تریاق محسوس کیا ہے جو اس کی تنہائیوں کا اثر زائل کر سکتا ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں جذب سے بتایا اور پھر ان کے مزید اصرار پر وہ سب کچھ لفظ بہ لفظ بتا دیا جو اسے فیضان نے اپنے والدین اور اپنی زندگی کی گزری اذیتوں کے بارے میں بتایا تھا، وہ یہ سب سن کر ساکت سی رہ گئی تھیں، کنزیا کے سر میں گردش کرتی انگلیاں ٹھہر گئی تھیں اور اچانک ہی ان کا سر بیڈ کی پشت پر لڑھک گیا۔
"آنٹی...... آنٹی کیا ہوا آپ کو پلیز لیٹ

جائیں آپ۔'' اسے جب ان کی حالت کا احساس ہوا تو گھبرا گئی، انہیں آرام سے لٹا کر ان کی زبان کے نیچے ٹیبلٹ رکھی۔

''آنٹی میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔'' اس نے منیر کو آنٹی کے پاس روکا اور خود باہر نکل گئی۔

رکشے سے اتر کر وہ اس تیزی سے ڈاکٹر اسرار رضا کے کلینک میں داخل ہوئی کہ اسے وہاں سے باہر نکلتا فنجان علی بھی نظر نہ آیا، وہ اسے دیکھ چکا تھا اس کی عجلت اور پریشان شکل اسے بھی پریشان کر گئی، وہ الٹے قدموں مڑا۔

''پلیز ڈاکٹر صاحب جلدی کیجئے ان کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے پسینے میں شرابور ہوگئی ہیں پورا وجود برف ہوگیا ہے، پلیز ڈاکٹر رضا۔'' وہ التجائیہ کہہ رہی تھی۔

''مگر مس احمد میں آپ کے ساتھ کیسے چلوں کنوینس ہے آپ کے پاس؟'' ڈاکٹر اسرار نے بالآخر وجہ بتا ہی دی۔

''پہلے ہی میں بڑی مشکلوں سے یہاں پہنچی ہوں، ڈاکٹر صاحب بس آپ چلئے میرے ساتھ میں ٹیکسی کر لیتی ہوں اور آپ کی فیس ادا کر دوں گی جو ہے جتنی بھی ہے، پلیز جلدی کریں۔'' اس نے ان کی تمام شرائط مان کر کہا اور تیزی سے مڑی، تو کچھ ہی فاصلے پر کھڑے فنجان کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

''آیئے کنزیا میری گاڑی ہے ناں ڈاکٹر رضا کو لے کر فوراً ہی چلتے ہیں۔''

وہ اس کا مسئلہ سن چکا تھا، اپنائیت سے بولا تو جانے کیوں کنزیا کو شرمندگی نے آگھیرا، وہ بہر حال اس کے خلوص کو نہ سمجھنے کی خطاوار تھی۔

اور پھر پندرہ منٹ کے بعد ہی وہ ڈاکٹر رضا اور فنجان سمیت شاہی آنٹی کے پاس پہنچ گئی، ڈاکٹر صاحب نے فوراً ہی انجکشن لگایا، وہ ہوش میں تھیں، کنزیا کے ساتھ کھڑے فنجان کو دیکھ کر اشارے سے اس کے بارے میں پوچھا، تو کنزیا نے ان کے سرہانے بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے بتایا۔

''آنٹی یہ فنجان علی ہیں۔''

''فنجان بیٹا۔'' ان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اگلے ہی لمحے پانیوں سے بھر گئیں، اشارے سے اپنے قریب بلایا اور اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر رکھا، وہ مزید جھک کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

''جیتے رہو بیٹا۔'' انہوں نے بمشکل کہا اور اس کے سر کو مزید نیچے کر کے اس کی پیشانی چوم لی۔

''بیٹا میری کنزیا کا خیال رکھنا، یہ اب تمہاری ہے میری نہیں۔'' الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے، وہ ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود بول رہی تھیں اور اپنے جسم کو حرکت بھی دے رہی تھیں، اسی لئے ان کا سانس اکھڑنے لگا، دوسرا اٹیک ہوا تھا انہیں۔

''کنزیا پلیز حوصلہ رکھیں۔'' فنجان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ اس کا وہی ہاتھ پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

وقت کا پہیہ اسی رفتار سے گھومنے میں مگن رہتا ہے اور دنیا کے کام دھندے وہی روش روا رکھتے ہیں، شاہی آنٹی کے چہلم کے بعد کنزیا کو شہلا (سرفراز یزدانی کی بیگم) اپنے ہمراہ سرفراز ولا لے گئیں اور پھر وہیں سے رخصت ہو کر وہ سلیمان ولا کی بہو اور فنجان کی دلہن بن کر آ گئی، یہاں فضل کاکا نے ان دونوں کا پرتپاک اور پر خلوص استقبال کیا۔

فیجان کنزیا کو پا کر بے حد مسرور تھا اور کنزیا بھی مطمئن تھی کہ اس نے وقت اور قسمت کے فیصلے کو قبول کر کے کوئی غلطی نہ کی تھی اور پھر شاہی آنٹی نے اسے خود اپنی دعاؤں کا زادراہ دیا تھا، وہ کیوں کر غیر مطمئن ہوتی؟

اکثر شاہی آنٹی سے متعلق اپنے عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار فیجان کے سامنے ہی کر دیا کرتی اور وہ بھی دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا اور پھر ان حوالوں کے پس منظر میں اپنی محرومی کی جھلک دیکھ کر اداس ہو جاتا اور جیسے اپنی محرومیوں کو نئے سرے سے محسوس کرنے لگتا ایسے میں کنزیا اسے سنبھالتی اور اس کا دل بہلانے کو ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتی اور وہ اس کا موڈ خوشگوار کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی کیونکہ فیجان بھی اپنے تلخ ماضی کو فراموش کرنا چاہتا تھا مگر جب بھی وہ اس کے راستے میں آتا تو وہ پھر سے بکھرنے لگتا۔

''فیجان آپ نے کبھی اپنے امی ابو کی تصویریں نہیں دکھائیں، البم تو ہوگی ناں؟'' کنزیا نے اس سے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھوگی؟''

''ہاں کیوں نہیں۔'' اس نے سر اثبات میں ہلا کر زبان سے بھی کہا۔

فیجان اسی وقت اٹھ کر البم لے آیا، پہلے صفحے پر اس کے والد سلیمان علی کی نوجوانی کی تصویر تھی۔

''یہ تو بالکل آپ لگ رہے ہیں بس آپ کی آنکھوں کا رنگ براؤن ہے اور ان کی کالی آنکھیں ہیں۔'' وہ حیرت سے اس کی تصویر دیکھتی رہی، فیجان اس کی حیرت پر مسکرا دیا۔

''آگے بھی تو دیکھو۔'' اور دوسرے صفحے پر ان کے والدین کی شادی کی تصویر تھی، کنزیا ایک دم سے کھڑی ہوگئی۔

''یہ...... یہ فیجان یہ آپ کی امی ہیں؟'' اس نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں صرف جنم دینے والی امی۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''فیجان یہ تو شاہی آنٹی ہیں، ان کی طرف اکیلی تصویر یہی دلہن والی، میں نے ان کے البم میں بھی دیکھی تھی۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''کیا؟'' فیجان نے اسے کندھوں سے تھام کر کہا۔

''ہاں فیجان یہ شاہی آنٹی ہیں آپ کی امی، میری آنٹی۔'' کنزیا نے آہستگی سے کہا۔

''سچ کہہ رہی ہو کنزیا؟'' اس کا لہجہ سپاٹ اور بے تاثر ہے۔

''ہاں۔''

''پھر تو یہ تمہاری امی اور میری آنٹی ہوئیں ناں۔'' وہ استہزائیہ ہنسا اور اس کے کندھوں پر سے ہاتھ ہٹا دیئے، کنزیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''فیجان پلیز ایسا تو نہ کہیے۔''

''پھر کیسا کہوں؟'' انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔

''کنزیا احمد تم نے ان کی محبتوں کا ذائقہ چکھا ہے، ان کی شفقتوں کے لمس کو محسوس کیا ہے مگر میں نے۔'' اس نے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر ٹہلنا شروع کر دیا۔

''میں نے تو اپنی آنکھوں سے پہلی بار دیکھا بھی تو پہچان نہ سکا کہ وہ میری ماں ہیں، انہوں نے میری پیشانی چومی بھی تو تمہارے حوالے سے، اپنا بیٹا سمجھ کر نہیں کنزیا، انہوں نے مجھے اپنا بیٹا سمجھا ہوتا تو وہ مجھے بلکتا ہوا نہ چھوڑ جاتیں، وہ میری ماں صرف اس لئے تھیں کہ انہوں نے مجھے جنم دے کر اپنے فرض کو اتار پھینکا تھا۔'' وہ

کھردرے اور سپاٹ لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔
''فیجان ہوسکتا ہے اس دن انہوں نے آپ کو پہچان لیا ہو، کیونکہ؟'' کنزیا کی بات اس نے کاٹ دی۔
''پلیز کنزیا بچکانہ باتیں مت کرو، انہیں تو میرے بچپن کے نقوش تک یاد نہ ہوں گے کیونکہ انہوں نے مجھے سات دنوں میں بھی کہاں اتنا بغور دیکھا ہوگا، کجا کہ اتنے سالوں بعد۔'' وہ طنزاً ہنسا۔
''فیجان جس دن آنٹی کی طبیعت خراب ہوئی تھی اس دن میں نے ان کو آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور یہ سب کچھ سن کر ہی ان کی حالت خراب ہوگئی تھی۔'' کنزیا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
''وہ اکثر پچھتاوؤں کا بھی ذکر کیا کرتی تھیں، فیجان آپ کی شکل اپنے ابو کے ساتھ کس قدر ملتی ہے اور پھر میں نے آپ کے ابو کا نام بھی بتایا تھا، مجھے پورا یقین ہے کہ آنٹی نے آپ کو پہچان لیا تھا۔'' کڑی سے کڑی ملتی گئی تو کنزیا کو اپنے گمان پر یقین آتا چلا گیا، فیجان بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کے خاموش ہوتے ہی مڑا اور تیزی سے لاؤنج سے نکل گیا، کنزیا ہکا بکا کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

''فیجان بخدا مجھے میرا قصور تو بتایئے یوں کس بات کی سزا دے رہے ہیں آپ مجھے؟'' چار دن کمرے میں بند رہنے کے بعد آج وہ باہر نکلا اور اس کے سامنے آیا تو وہ ہاتھ جوڑ کر رو پڑی، چار دنوں سے وہ اس کی بے اعتنائی کا دکھ سہہ رہی تھی۔
''مت بہاؤ یہ آنسو تم کنزیا میری وہ دشمن ہو جو میری محبت بن کر میری زندگی میں زہر گھولنے کے لئے آگئی ہو ہر قدم پر مجھے یہ احساس دلانے کے لئے، دیکھو فیجان علی تمہاری ماں ہو کر بھی اپنی محبت کے خزانے سے نالاں، تمہارے حصے کا پیار بھی مجھ پر لٹایا، مجھے بھی اپنی سگی اولاد سمجھا، حالانکہ کنزیا احمد۔'' وہ غصے سے کانپتا ہوا اس کے قریب آگیا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔
''حالانکہ وہ میری سگی ماں تھیں، مجھے جنم دیا تھا انہوں نے، ان سب محبتوں پر میرا حق تھا جن سے تم لطف اندوز ہوتی رہی ہو۔'' وہ وحشیانہ انداز میں چیخا اور جھٹکے سے اس کے کندھوں کو چھوڑ دیا، وہ گرتے گرتے بمشکل خود کو سنبھال پائی۔
''چلی جاؤ میری نظروں سے دور کنزیا، میں ہر پل اس اذیت میں نہیں گزار سکتا کہ تم میری محبتوں پر ڈاکہ ڈالتی رہی ہو اور میں بھی تم پر ہی اپنی چاہت کے موتی لٹاتا رہا ہوں۔'' وہ اس وقت کہیں سے بھی انسانیت کے جامے میں نہیں لگ رہا تھا، مگر کنزیا کو یوں لگا کہ اگر آج کے لمحے بغیر اپنے منطقی نتیجے کے گزر گئے تو وہ پھر شاید یہ تمام زندگی کا احاطہ کر لیں گے اور شاید میں پھر بھی کچھ نہ کر سکوں گی۔
''فیجان مجھے اعتراف ہے کہ شاہی آنٹی میری سگی ماں نہ تھیں مگر انہوں نے مجھے کبھی اپنے سگے والدین کی کمی محسوس نہ ہونے دی، مجھے محبت کی محرومی سے بچا کر اعتماد کی دولت اور اعلیٰ تربیت سے مالا مال کیا، میں نے ان کی محبتوں کو کبھی اپنا حق سمجھ کر وصول نہیں کیا بلکہ شعور کے آتے ہی ان کے احسان کو تمام تر شدتوں کے ساتھ محسوس کیا اور ان کی احسان مند بن گئی۔'' کنزیا نے خاموش برستی آنکھوں سے دھیرے دھیرے کہا، فیجان آنکھیں بند کیے لیٹنے کے انداز

میں ٹانگیں پھیلائے صوفے پر بیٹھا تھا۔
"تو کیا کنزیٰ؟ میں نے تم سے زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔"
"فیجان۔" کنزیٰ نے اپنے آنسو صاف کیے اور اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔
"احسانوں کے بوجھ تلے دبا انسان ہمیشہ اسے چکانے کی فکر میں رہتا ہے اور وہ ان کا بدلہ یوں اتارنا چاہتا ہے کہ احسان کرنے والے کو خبر تک نہ ہو۔" اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"میں آپ کی مجرم ہوں تو مجھے ضرور سزا دیجیے تاکہ آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو اور آپ کے انتقام کو تسکین ملے، مگر فیجان علی میری ایک درخواست ہے کہ سزا کے بعد مجھے کم از کم اتنی مہلت ضرور دیجیے گا کہ میں شاہی آنٹی کی محبتوں کا کچھ قرض تو چکا سکوں، ان کے احسانوں کا تھوڑا ہی سہی بدلہ تو اتار دوں۔" وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی، آنسوؤں کی لڑیاں پھر سے ٹوٹ کر گرنے لگی تھیں۔
"تم اور میں دونوں ہی بے قصور رہے ہیں، ہاں یہ سب قسمت کے چکر ہیں کنزیٰ۔"
"فیجان مجھے آنٹی نے محبت کا گر سکھایا تھا، مجھے آپ سے بے حد محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی آخری سانسوں تک، مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجیے گا فیجان اور میں زیادہ عرصہ جی نہ سکوں گی۔" وہ ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر سسکی۔
"میرا سب کچھ آپ ہیں صرف آپ۔"
"کنزیٰ تم محبتوں کا قرض اتارنا چاہتی ہو ناں۔" فیجان نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔
"ہاں۔" اس نے سرخ متورم چہرہ اٹھایا۔
"مگر اب تمہیں یہ قرض بمعہ سود ادا کرنا ہو گا، کہو منظور ہے۔" فیجان نے شوخی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"کیا مطلب؟" وہ روئی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مسکرا پڑی۔
"قرض والی محبت کا کھاتہ الگ رکھنا ہو گا اور وہ جو تمہیں مجھ سے محبت ہے ناں وہ بالکل علیحدہ ہو گی۔" اس نے لگاوٹ سے اسے دیکھا اور اس کے آنسو صاف کیے تو وہ کھل کر ہنس دی، فیجان کو یوں لگا جیسے بارش رکنے کے بعد نکھرے اور صاف آسمان پر دھنک کے ساتوں رنگ نکھر گئے ہوں۔
"کہو منظور ہے؟" فیجان نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔
"آپ فیجان میری زندگی ہیں، میرے حبیب ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔
"مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے سوائے۔" آخر میں وہ ایک دم شوخی سے بولی۔
"سوائے......؟" فیجان نے اس کی چوٹی پکڑلی۔
"سوائے مجھے اپنا دشمن سمجھنے والی بات کے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
"اونہوں دشمن نہیں تم جان من ہو میری۔" فیجان نے بڑی لگاوٹ سے کہا تو اس کا سر مارے شرم کے اور اس کا دل اس کی وسیع القلبی اور بے پایاں محبتوں کے آگے جھک گیا اور دو آنسو تشکر کے گالوں تک آہستگی سے لڑھک آئے جنہیں فیجان نے اپنی پوروں پر چن لیا اور مسکراہٹوں کے سدا بہار پھول چاروں طرف کھل اٹھے۔

☆☆☆

نایاب جیلانی

ایک چمکیلے دن کی شروعات ہو رہی تھی۔

آفتابی کرنوں نے انگڑائی لے کر کروٹ بدلتے ہوئے اپنی بیداری کا واضح ثبوت پیش کیا تھا، کچی کچی سی گلابی، سنہری دھوپ پگھل پگھل کر قطرہ قطرہ گر رہی تھی، سورج کی نخوت سے سر اٹھاتے ہی نرم خوسی صبح کا ملگجا اندھیرا سمٹتا ہوا کہیں دور بہت دور تحلیل ہو گیا تھا، ہر طرف اٹھلاتی کرنوں کی جلوہ افروزی تھی، صبح نوخیز اپنے جوبن کی انتہا پہ تھی، سرما کی سویر کا بڑا دل افروز آغاز تھا۔

نئی نکور چمکتی پراڈو سیاہ تارکول پہ پھسل رہی تھی۔

حویلیاں سے آگے پہاڑی سلسلے تھے، سرسبز درختوں کے حصار میں بل کھاتا ایک خوبصورت راستہ ''وادی ہزارہ'' کے انتہائی دلکش اور صحت افزا مقام ایبٹ آباد تک جاتا تھا، چاروں اور سے پرکشش پہاڑوں میں گھرا یہ شہر جہاں اپنے حسن و جمال میں لاثانی تھا وہاں اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بھی ایک منفرد حیثیت کا حامل تھا، اس کے گردونواح میں بے شمار ایسے مقامات تھے جن کی جاذبیت ہر سال سینکڑوں سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی ان میں ٹھنڈیانی، شملہ پہاڑی، کالا باغ اور نتھیا گلی قابل ذکر تھے۔

ایبٹ آباد سے پچیس کلو میٹر کی دوری پر ''مانسہرہ'' کا خوبصورت شہر واقع تھا، یہاں سے دو مختلف راستے ''دیامر'' کی طرف جاتے تھے، ایک وادی ''کاغان'' میں ''درہ بابوسر'' سے ہوتا ہوا دیامر کی طرف جاتا تھا جبکہ دوسرا اشنکیاری، بٹ گرام، بشام اور کوہستان کے علاقوں سے گزرتا ہوا چلاس سے جا ملتا تھا، اسے چلاس سے آگے بیال تک جانا تھا۔

دنیا کے آٹھویں عجوبے، شاہراہ قراقرم پہ چلتی پراڈو میں سفر کرنا بھی بڑا عجیب تجربہ تھا، پاکستان اور عوامی جمہوریہ چین کے اشتراک سے بننے والے اس عظیم شاہکار نے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا اور اس وقت سیاحت پاکستان کے یہ چھ آفیسرز اور جوان شاہراہ قراقرم کی دونوں جانب پھیلی "وادی سرن" کے دلپذیر خطے کو دیکھ کر مبہوت ہو رہے تھے، اس وادی میں ہر سمت نظر آنے والی ہریالی نے جہاں آنکھوں کو طراوت و تازگی بخشی تھی وہاں دل کو بھی فرحت و شادمانی سے ہمکنار کیا تھا، "شنکیاری" کے قریب جہاں چائے کے وسیع باغات دیکھ کر پروجیکٹ آفیسر قاسم اور اسسٹنٹ سروئیر زونیہ نے چائے چائے کی گردان پڑھی وہیں سبز گھاس سے مزین پہاڑی ڈھلوانوں پر ہرے بھرے درختوں کی دلربائی کو دیکھتا، مبہوت ہوتا امام فرید ے شاہ دونوں کو بری طرح گھورتا پھر سے فطرت کی رعنائیوں میں گم ہو چکا تھا۔

اس وقت وہ بھول ہی چکا تھا کہ ہیڈ آفس سے آنے والی ہنگامی کال کے بعد بہت ارجنٹ ڈیلی گیشن کو لے کر سروئیر ٹیم کے ہمراہ نادرن ایریاز پہنچنے سے پہلے گھر میں اطلاع کرنا یا کم از کم ایک پیغام چھوڑ دینا اس کا خاندانی ہی نہیں، اخلاقی بھی فرض تھا۔

اور اب جبکہ وہ اپنے اداس شہر اسلام آباد کو بہت پیچھے چھوڑ کر آیا تھا، اسلام آباد کی مصروفیات کے بعد یہاں وقت تھما ہوا لگ رہا تھا، یہاں پہ اسلام آباد کی طرح مال روڈ نہیں تھے، نہ ہی برطانوی راج کے آخری دنوں کا لمبا ہوتا سایہ افسردہ کرتا تھا، پھر بھی سبز پہاڑوں سے سجی ان وادیوں میں اپنائیت اور عجیب سی غمزدگی اور اداسیت پھیلتی نظر آتی تھی، جانے ان روح پرور مناظر میں ایسا کیا تھا جو دل یک بارگی افسردگی کی لپیٹ میں بند ہوتا چلا گیا تھا، جیسے پیاز کی پرتوں اور تہوں میں گھستا چلا گیا تھا، یا جیسے لحوں میں تہہ بہ تہہ ڈوبتا چلا گیا تھا۔

اس کے دل پہ اچانک خزاں کا موسم ٹھہر گیا تھا، جانے اسے ہوا کیا تھا؟ یک بارگی آرام دہ پراڈو کی پرحدت فضا میں گھٹن بھرنے لگی تھی، جس گھٹنے لگا تھا، یوں کہ امام فرید ے شاہ ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا شیشہ نیچے گرا دیا، باہر سے تیز سرد اور برفیلی ہوا کا جھونکا آیا اور لحوں میں پراڈو کی گرمائش ٹھنڈک میں بدل گئی، اندر موجود لوگوں نے لمبی سی پھریری لی اور گھٹی گھٹی آواز میں چیخ پڑے۔

"شیشہ چڑھا دیں۔"

"ٹھنڈک آ رہی۔"

"اوف میں مر ہی......" زیادہ آواز زونیہ کی آ رہی تھی اور وہ باقاعدہ تھر تھر کانپ بھی رہی تھی، حالانکہ آؤٹ فٹر کی ریشمی فروالی "ہڈ" میں سردی کا سوال ہی نہیں تھا، لیکن یہ ان لڑکیوں کی نزاکتیں، اف توبہ ہائے، زونیہ کی چیخ و پکار پر امام کو ایکشن لے کر ونڈو کا شیشہ گرانا ہی پڑا تھا، زونیہ کی اس بے کار کوشش کا اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ امام کے دل میں اترتی عجیب سی وحشت اسی ٹھنڈک کے حصار میں گرفتار ہو کر پراڈو کے ماحول سے نکل کر برف زاروں میں گم ہو گئی تھی، اب وہ گہرا سانس کھینچ کر مشتاق ڈرائیور کو رستہ سمجھا رہا تھا۔

پراڈو تھاکوٹ نامی قصبے سے گزر رہی تھی، جس کے نیچے دریائے سندھ بہہ رہا تھا، ایک خطرناک طویل پل کو عبور کرتے ہوئے زونیہ نے پھر سے بھیانک "ہائے اوئے" مچائی تھی،

حالانکہ دریا کے نیلے شفاف پانی پہ تیرتی ایک کہانی زونیہ کے خوف سے بھی زیادہ بھیانک تھی، کبھی ابھرتی، کبھی ڈوبتی، کبھی تیرتی، کسی صاحب نظر کی منتظر، صدیوں سے تنہا اداس اور بھٹکتی ترستی، بہت Oppresed، امام کی سوچ، خیال اور Supposition سے بھی بڑھ کر، گمان کی حدود سے شروع ہو کر قیاس کی ہر انتہا تک اس نے گہرا سانس کھینچ کر گاڑی کے اندرونی ماحول کا جائزہ لیا تھا، قاسم ڈرائیور سے دریائے سندھ کی تاریخ، پوچھ رہا تھا، زونیہ ونڈو کے مرر سے ناک چپکا کر پر وحشت آنکھوں میں ہیبت بھرے طویل پل کے نیچے ٹھاٹھیں مارتے دریائے سندھ کو دیکھ رہی تھی جسے مقامی زبان میں ''اباسین'' یعنی دریاؤں کا باپ کہا جاتا تھا، برصغیر کے قدیم نام ''ہند'' کا ماخذ بھی تھا، یہ لفظ سندھ سے بگڑ کر بنا تھا، اسے تاریخ سے شغف نہیں تھا ورنہ غور ضرور کرتا، امام کو صرف اتنا پتا تھا کہ یہ دریا پہاڑوں، میدانوں اور ریگزاروں سے گزرتا ہوا بحیرہ عرب میں جا گرتا تھا، یہی خوفناک اباسین جس کی لہروں پہ کوئی ستم رسیدہ کہانی سسک سسک کر رو رہی تھی، کسی صاحب نظر کی تلاش میں تھی جو اتنا جری اور دلیر ہوتا جو اباسین کی گہرائیوں میں بے خوف اتر کر سکتی، بھٹکتی، تڑپتی اس کہانی کے گیلے اوراق نکال لاتا، اس پہ مٹے مٹے اداس لفظوں کو سمجھ لیتا، پڑھ لیتا، غور کر لیتا، اس کہانی کے ہر ستم رسیدہ کردار کی زندگی کے درد جان لیتا، غم دیکھ لیتا، کرب سمجھ لیتا۔

امام کے اندر پھر سے عجیب سی اذیت کی کرچیاں ٹوٹنے لگی تھیں، وہ پانی کیفیات سمجھنے سے قطعاً قاصر تھا، بس اسے اتنا محسوس ہو رہا تھا کوئی درد کا تیز خنجر اندر ہی اندر سکون کی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر اسے بے سکون کر رہا تھا، اس کی آنکھوں میں اضطراب کی لہریں بکھرنے لگی تھیں، اس نے بے چینی کے عالم میں سر کو سیٹ کی پشت سے ٹکایا تھا، معاً پراڈو کو ایک جھٹکا لگا اور ٹائر بری طرح چرچرا کر رک گئے تھے۔

امام کو اذیت کے اس فسوں سے بالآخر نکلنا ہی پڑا تھا، پراڈو بشام کے پررونق بازار میں کھڑی تھی، ڈرائیور طعام کا انتظام کرنے نیچے اتر گیا تھا، کچھ دیر بعد دم کباب اور گرما گرم خمیری روٹی سے خوب سیر ہو کر آگے کا سفر شروع ہوا تھا، منزل گو کہ ابھی دور تھی پھر بھی گاڑی کے ماحول میں کام کے حوالے سے مختصر ڈسکشن شروع ہو چکی تھی۔

''بزانف پروجیکٹ ہے۔'' قاسم نے خیال آرائی کی تھی۔

''قبائلیوں میں رہ کر کام کرنے کا تجربہ خاصا خوفناک ہوگا۔'' زونیہ نے بھی جھرجھری لی تھی، اسے ویسے بھی ہراس پھیلانے کی عادت تھی۔

''میں تو اس کاروائی، پروسیس اور ایکشن کے پہلے ہی خلاف تھا۔'' زونیہ کے ہراس کا پہلا لفٹک عاشر پہ ہوا تھا اس نے آٹھویں مرتبہ مرے مرے لہجے میں اپنی بات دوہرائی تھی، ویسے بھی وہ فطرتاً ڈرپوک تھا۔

''چیف کو اس پنگے کے لئے ہم ہی ملے تھے۔'' وقاص نے بھی جلے دل کا پھپھولا پھوڑا تھا، تب قاسم نے لب کشائی کر کے سب کو گویا تسلی دی تھی۔

''ڈونٹ وری دوستو! امام کی پالیسی بڑی اسٹرونگ ہے، فکر کی کوئی بات نہیں۔'' قاسم کی مسکراہٹ پہ زونیہ کو فوراً ڈھارس ملی تھی، اس نے مسکراہٹ خوب پھیلا کر فخریہ کہا۔

''امام کی لیڈنگ پہ ہمیں بھروسہ ہے۔'' زونیہ کا انداز بہت تعریفی تھا، وہ ویسے بھی امام کے پروانے متاثرین میں سے تھی، قاسم اس کی طوطا چشمی پہ بھنا کر رہ گیا تھا، پل میں بیان بدل لیتی تھی، حالانکہ ہیڈ آفس کی ہنگامی میٹنگ کے بعد جب امام نئے پروجیکٹ کا لائحہ عمل لے کر آیا تھا تب پر خطر قبائلی علاقوں کے وزٹ کا سن کر زونیہ نے سب سے پہلے مخالفت کی تھی، گو کہ اس کی مخالفت کو کوئی خاطر میں نہیں لایا تھا اور وزٹنگ ٹیم میں زونیہ کا نام بھی آ گیا تھا اور اس کو بھی نوکری بچانے کے لئے ان پر خطر علاقوں میں سفر کرنا پڑا تھا، اسلام آباد میں وہ امام کے خوب خلاف بھول رہی تھی، نہ وہ ٹیم کی قیادت کرتا، نہ دشوار گزار علاقوں میں آنے کی حامی بھرتا اور نہ زونیہ وغیرہ کو اس کے انڈر ہونے کی وجہ سے خوار ہونا پڑتا، لیکن اب اس نے حسب معمول اپنا بیان بدل لیا تھا، ایک تو فطرتی حسن مبہوت کر رہا تھا، دوسرے وہ بھور بن مری کے اطراف تک محدود لڑکی فطرت کے وسیع و عریض مناظر دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھی، جس نے بس مال کے کباب، رابعہ بازار کی کڑھائی، پشاور موڑ کے چھتر کباب اور صدر کی تجبین پی رکھی تھی، ان پہاڑوں کے لذیذ پکوان، کابلی پلاؤ، نمکین مچھلی، روغنی روٹی اور دیسی چرغے کی شیدائی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دوبیر سے گزرتے ہوئے پہاڑ کی بلندی سے بہہ کر آنے والے چشمے کے شیشے کی مانند شفاف پانی نے ایک مرتبہ پھر پوری ٹیم کو مبہوت کر دیا تھا، دوبیر سے داسو تک وادی کوہستان کا یہ علاقہ دریائے سندھ کی دونوں جانب فلک بوس پہاڑوں پر مشتمل تھا، رستے میں بے شمار اندھی کھائیوں نے دل دہلایا تھا، ہر کھائی پہ زندگی کو سخت خطرہ محسوس ہوا تھا۔

داسو باقاعدہ سیاحتی مرکز نہیں تھا سو یہاں بس وہی لوگ دکھائی دے رہے تھے جو بس ہنزہ اور گلگت جاتے ہوئے یہاں رک گئے تھے، شام کے قریب داسو کا ہی منظر سرمئی چادر کی لپیٹ میں چھپ گیا تھا، پہاڑی ڈھلوانوں پر موجود گھروں میں بجلی کے بلب روشن ہو چکے تھے، برفیلی ہوا کے تند جھونکے اپنی جنوں خیزی کا بھرپور مظاہرہ کر رہے تھے، آسمان پہ اختر انی شب کی بجائے بادلوں کی فوج خیمہ زن تھی۔

کمیلہ بازار کی طرف بڑھتے ہوئے دریائے سندھ پر واقع پل کے حفاظتی جنگلے کے پہلو سے گزرتے ہوئے دریا کی متلاطم موجوں کی طرف اس نے دیکھا تو لحظہ بھر کے لئے دھک سے رہ گیا تھا، یوں لگا دریا کی مقناطیسی لہریں اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں، گویا پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔

''آؤ ہمارے پاس آؤ، اترو، ہمارے اندر اترو، دیکھو، ہمیں جانو، یوں گریز مت برتو، ہم صدیوں سے تمہاری منتظر ہیں۔''

لہروں کی شوریدہ سری پہ اس نے مضطرب ہو کر پلکوں کو دھیرے سے موند لیا تھا، ہر منظر پلکوں کی نوکیلی باڑ میں چھپ کر دبک گیا، اب لاشعوری آنکھ سے گزر چکے عکس اپنا چہرہ بنا رہے تھے، اسے اچانک پلوشہ خالہ اور رحمان کا خیال آیا تھا، وہ ان دونوں کو بغیر اطلاع دیئے خاموشی سے چلا آیا تھا، پھر اس کی چھوٹی بہن گومے جو امام کے ساتھ بے پناہ اٹیچ تھی، جو امام کی غیر موجودگی میں صبح کے ناشتے کو گول کر کے چپکے سے کالج بھاگ جاتی تھی اور جسے امام کے علاوہ کوئی اور صبح کا ناشتہ

کروانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، وہ اپنے پیاروں کو بنا اطلاع دیئے فرض شناسی کے جذبات سے لبریز اوپر سے آرڈر ملتے ہی مطلوبہ جگہ اور علاقے کا سروے کرنے پہنچ گیا تھا، کیونکہ عنقریب ڈیڑھ سال کی مدت کے لئے اسے انہی علاقوں میں ٹرانسفر کیا جا رہا تھا، چارج لینے سے پہلے وہ اپنی ٹیم کے ہمراہ وزٹ کرنے آیا تھا۔

اور اب اس پر خطر دشوار گزار حسین وادیوں سے گزرتے ہوئے امام فریدے شاہ سوچ رہا تھا اگر کسی اندھی کھائی کا شکار یہ پراڈو ہو جاتی، وہ لقمہ اجل بن جاتا تو اس کے پیاروں اور جانثاروں پہ کیا قیامت گزرتی؟ اس سوچ نے امام خاصا ڈسٹرب کر دیا تھا، تبھی اس نے جیکٹ کی جیب سے اپنا اسمارٹ موبائل نکالا اور کوے کا نمبر ٹرائی کیا، لیکن یہاں سروس پرابلم کے باعث کوئیکٹ میں پرابلمز آ رہے تھے، اس نے چڑ کر موبائل آف کر دیا تھا، معاً قاسم نے اس کا کندھا ہلا کر پوچھا۔

''ہم لوگ سردار کبیر بٹو کے علاقے میں جا رہے ہیں؟'' اس کی آواز میں خاصی سنجیدگی تھی، کیونکہ داسو میں مقامی حضرات سے قاسم نے کافی انفارمیشن اکٹھی کر لی تھیں، جس کا لب لباب کوئی قابل فخر یا قابل تسلی نہیں تھا، پھر بھی اس نے زونیہ کے ''ہراس'' کی وجہ سے لہجے کو انتہائی سرسری بنا کر پوچھا تھا۔

''ہاں۔'' امام نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن وہ تو بڑا خطرناک آدمی ہے۔'' وقاص نے پھیکے لہجے میں کہا، زونیہ کی رنگت پل میں زرد پڑ گئی جیسے سرسوں کا کوئی پھول ہو، اس نے گھبرا کر قاسم اور امام کی طرف دیکھا تھا۔

''انسان نہیں کھاتا سردار، ایسا بھی خطرناک نہیں۔'' امام نے جیسے سب کو تسلی دی تھی، تاہم اس کے کانوں میں چیف کی سنجیدہ آواز اب بھی سوراخ کر رہی تھی۔

''جنگل کا شیر ہے سردار بٹو، اپنی پالیسی پہ کار بند رہنا، کوئی رکاوٹ سر نہیں اٹھائے گی۔'' چیف نے دوسرے معنوں میں امام کو سمجھا دیا تھا کہ اسے بڑے خطرناک محاذ پر لڑنا ہے، سردار بٹو سے پنگا لینا ہے اور بٹو خاندان کوئی معمولی خاندان نہیں تھا، بہت بڑی اسٹیٹ کا مالک تھا، بڑا امیر کبیر آدمی تھا، اس پورے علاقے میں ''بٹو'' کا طوطی بولتا تھا، لوگ اس نام سے خوف کھاتے اور بدک جاتے تھے، اسے سرکاری، نیم سرکاری، نجی ہر زمین، پلاٹ، قطعے اور خطے پہ ناجائز قبضہ کرنے میں کمال حاصل تھا، اس نے بے شمار اراضی اکٹھی کر رکھی تھی، سرکاری زمین پہ ہر ایکٹر میں بٹو کی فصل تیار تھی اور یہ سراسر غیر قانونی اور ناجائز تسلط تھا، سرکاری زمین پر ذاتی طور پر کاشت کاری کرنا قانوناً جرم تھا، لیکن علاقے کے مجسٹریٹ کی بھی بٹو کے سامنے دال نہیں گلتی تھی۔

پچھلے ڈیڑھ سال سے سردار کبیر بٹو، ڈائریکٹر جنرل آف پاکستان کی ہاٹ لسٹ پہ تھا، کافی مہینوں کی ریسرچ اور ان تھک ٹیم ورک کے بعد بے شمار معلومات اکٹھی کر کے ذخیرہ معلومات کی روشنی میں رپورٹ کی گئی تھی کہ سردار بٹو لاکھوں ایکڑ اراضی اپنی طاقت کے بل بوتے پہ ضبط کر چکا ہے، علاوہ ازیں اس نے سرکاری قبرستان (وہ زمین جس کو سرکار نے قبرستان کے لئے مختص کیا تھا) اس کو ناجائز طور پر اپنی زمین سے ملا لیا تھا، وہاں پہ فصل بھی کاشت کر لی گئی تھی اور سب سے بڑا پرابلم یہ تھا اس نے سرکاری راہ کو بھی بلاک کر دیا تھا جس پہ نقشے کے تحت ڈبل کار تول تعمیر کی جانی

تھی، گورنمنٹ کے الاٹ شدہ رستے پہ ایک "شیڈ" تعمیر کرلیا گیا تھا، شیڈ کی عظیم الشان عمارت نے علاقہ مکینوں کو ایک عذاب مسلسل میں مبتلا کردیا تھا کیونکہ بیرونی اور اندرونی آمد و رفت کا آخری قریب اور آسان ترین رستہ بلاک ہو چکا تھا، پچھلے ایک سال سے شکایات تو موصول ہو رہی تھیں تاہم بڑو کا نام بیچ میں آرہا تھا سو کوئی بھی آفیسر سروے کے لئے تیار نہیں تھا، یہ تو امام فریدے شاہ جیسا "جی دار" تھا جس کے پاس ڈسٹرکٹ دیامر سے آنے والی شکایت کی لسٹ بڑھی تو اس نے چیف سے مشورہ کرنے کے بعد فوری ایکشن کا فیصلہ کرلیا تھا، قریب دو مہینے پہلے اسے ایک خاتون کا خط ملا تھا، وہ خط جس کے ضمن میں یہ کاروائی کی جارہی تھی ابھی بھی امام فریدے شاہ کی جیکٹ کے اندر کہیں تہوں میں موجود تھا۔

اور آج مساحت پاکستان کی یہ ذہین آفیسرز پہ مشتمل پوری ٹیم ڈسٹرکٹ دیامر کے مخصوص علاقوں کا سروے کرنے جارہی تھی۔

اس وقت پورے علاقے کو مہیب اندھیرے نے اپنے غلاف میں لپیٹ لیا تھا۔

گاڑی میں موجود قاسم، عاشر، زونیہ، ناصر، وقاص دن بھر کے سفر سے نڈھال اونگھ رہے تھے، ڈرائیور ابھی بھی مشاقی سے ڈرائیو کررہا تھا، وہ پہلے سے زیادہ چوکنا اور ہوشیار تھا۔

باہر اچانک موسلادھار بارش شروع ہو چکی تھی، غروب آفتاب کے بعد دوکانوں کو تالے لگ چکے تھے، ماحول پہ عجیب سا ہراس پھیل رہا تھا۔

وہ بے خوابی کے ایسے صحرا میں جا گھسا تھا جہاں نیند کا کوئی ہلکا سا سایہ تک نہیں تھا، آنکھ کے نشیمن سے پرواز کر جانے والا نیند کا پنچھی بہت اونچی اڑان بھر چکا تھا، جس کی واپسی کا آج کی رات تک کم از کم گمان نہیں تھا، اس نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلیئر آن کرلیا، فیض احمد فیض کی آواز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

چشم نم جان شوریدہ کافی نہیں
تہمت عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابہ جولاں چلو
نشط افشاں چلو
مست ورقصاں چلو
خاک برسر چلو
خوں بہ داماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو
حاکم شہر بھی
مجمع عام بھی
تیر الزام بھی
سنگ دشنام بھی
صبح ناشاد بھی

روز نا کام بھی
ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہر جاناں میں اب باصفا کون ہے
دست قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رخت دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہم ہی قتل ہو آئیں یارو چلو

اسے آواز کے ردھم میں ایک پکار سنائی دی تھی، جیسے فلک بوس یہ وادیاں آہ وفغاں کر رہی تھیں، برف زاروں کی تتلیاں نیم جاں ہو رہی تھیں، کوئی اسے پکار پکار کر بتا رہا تھا، التجا کر رہا تھا۔

''امام فرید ے شاہ! یہاں کیوں چلے آئے؟ کیا قتل کرنے چلے آئے یا قتل ہونے چلے آئے؟'' ضلع دیامر کی حدود میں داخل ہوتے ہی کسی نے بڑے درد اور سوز بھرے لہجے میں بڑی اداسی سے کہا تھا، امام کو لمحہ بھر کے لئے یوں لگا، وادی کا ہر رنگ لہو رنگ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شادمان کی محدود زندگی واقعی بہت محدود تھی۔

اتنی مختصر کہ جہاں سے شروع ہوئی اور وہاں پہ ختم ہو گئی، نہ دن نکلتا دیکھنا نصیب ہوتا تھا اور نہ سورج ڈوبتا کبھی دکھائی دیا تھا، بہار کب آتی تھی، خزاں کب جاتی تھی، سرما کے رنگ کیسے تھے، موسموں میں بدلاؤ کب آتے تھے، کم از کم نشرہ احسان اتنی ہی انجان تھی جس قدر انجان ایک یتیم و یسیر لڑکی کو ہونا چاہیے تھا جو کہ قدرت کی ستم ظریفی سے کسی اور کے در پہ پڑی زندگی کو سسک سسک کر گھسیٹ رہی تھی، دیکھا جائے تو در بھی کسی اور کا نہیں تھا، بدقسمتی سے سلیمان اس کا اکلوتا تایا تھا، نوازش اکلوتا چچا تھا، دونوں اوپر نیچے ''احسان منزل'' میں رہائش پذیر تھے اور نشرہ ان دونوں بھائیوں کی آل اولاد کے لئے فل ٹائم مخصوص خادمہ موجود تھی، کبھی اوپر والے پورشن سے آواز آتی، کبھی نیچے والے چیخ چیخ کر ''نشرہ نشرہ'' پکارتے تھے۔

نشرہ کا ایک پیر اوپر اور ایک پیر نیچے ہوا کرتا تھا، اوپر نیچے کے ان چکروں میں اللہ کی کرنی ایسی ہوئی کہ ماربل کی چکنی سیڑھیوں پہ اس کا پاؤں عجیب انداز میں رپٹا تھا، دوسرے ہی پل وہ پھسلتی ہوئی نچلے پورشن کے فرش پہ دھڑام سے آ گری تھی، سر پہ چوٹ لگی تھی یا پیر پہ؟ اس وقت و نشرہ کو خبر نہیں ہو سکی تھی، لیکن جب عینی کی ہنسی کا فوارہ پھوٹا اور نومی نے اونچا سا بلند قہقہہ لگایا تب نشرہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ریلا سا پھوٹ پڑا تھا، سوجے ہوئے ٹخنے اور مڑے ہوئے پیر کا درد اچانک امڈ امڈ آیا تھا، سر کے پچھلی طرف گردن کے جوڑ میں بھی اذیت کی لمبی لمبی لہریں سی اٹھی تھیں، ریڑھ کی ہڈی الگ سے سنسنا رہی تھی۔

مجموعی طور پر جسم کا ریشہ ریشہ درد کر رہا تھا، اوپر سے عینی کی ہنسی اور نومی کی بکواس نشرہ کے دل کو چار چوٹیں لگا رہی تھی، اس نے آنسو بھری آنکھوں کو مل مل کر اٹھنا چاہا تھا، لیکن ہڈیوں کے انجر پنجر نے چیخ چیخ کر اٹھنے سے انکار کر دیا تھا، وہ بے بسی کے احساس تلے دب کر نڈھال ہو گئی تھی، لیکن ان دو کشور بہن بھائی کو ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا، احساس ہوتا بھی کیسے؟ وہ دونوں ہی

صائمہ تائی جیسی سنگ دل خاتون کے جگر گوشے تھے، اپنی ماں کی طرح ہی کٹھور، سنگ دل، بے حس۔

عینی اور نومی سے کسی اچھائی کی توقع ہی عبث تھی، نشرہ کو شرمندگی کے احساس سے نکل کر خود ہی ہمت اور جوانمردی سے اٹھنا تھا، سو وہ گھٹنوں پہ دباؤ ڈال کر اٹھنے کی کوشش میں پھر سے کراہ کر رہ گئی تھی، معاً سیڑھیوں سے اترتا ولید نیچے چلا آیا، آخری سیڑھی کے سرے پہ نشرہ گٹھڑی سی بنی پڑی تھی، ولید پہلے تو چونکا تھا پھر ٹھٹک کر صورتحال سمجھنے کے بعد نشرہ کے قریب جھک آیا، تبھی عینی کی کسلتی آواز نے ولید کو ذرا چونکا دیا تھا۔

''اب اٹھ بھی جاؤ نشرہ! ایسی بھی کیا اداکاری؟'' عینی کے طنز نے نشرہ کو درد بھلا کر اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔

وہ فقط ''اداکاری'' پر بھونچکی رہ گئی تھی، کیا وہ ڈرامہ کر رہی تھی؟ اسے رونا سا آ گیا تھا۔

''اتنی چوٹ نہیں لگی، جس قدر ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔'' عینی نے پھر سے لب کشائی کی، ولید کا نشرہ کے پاس کھڑے ہونا اور ہمدردی سے اسے دیکھنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جو وہ برداشت سے کام لے کر خاموش ہو جاتی۔

''ہنگامہ؟'' اب کہ ولید بولے بنا رہ نہیں سکا تھا، اسے عینی کا طنز بہت برا لگا تھا، ویسے بھی ولید اتنا بیبا نہیں تھا جو خاموشی سے عینی کے طنز سہہ جاتا، جبکہ وہ جانتا بھی تھا، اس کی ہمدردی کے باعث عینی کٹ کھنی ہو رہی تھی۔

''نشرہ نے کون سا ہنگامہ کھڑا کیا ہے؟'' اس نے ایک بھوں اچکا کر پوچھ ہی لیا۔

''میں تو اسے خاموش دیکھ رہا ہوں۔''

''خاموشی میں بھی قیامت کے شور ہوتے ہیں۔'' نومی نے بھی ایک آنکھ میچ کر انتہائی فضول انداز میں انٹری ماری تھی، ولید نے قطعاً ناگواری سے نومی کی طرف دیکھا تھا، اسے اپنے بڑے ماموں کا یہ پیس ذرا پسند نہیں تھا، وہ بہت کم نومی کو منہ لگاتا تھا، اس کی کمپنی اور گفتگو برداشت کرنا بڑی ہمت کا معاملہ تھا، ولید جب سے یہاں آیا تھا اس نے نومی کو عموماً ویلا فارغ اور نکما ہی دیکھا تھا، وہ عام روٹین میں بھی نچلے برآمدے کے تخت پہ لیٹا ہوا پایا جاتا تھا، یا کمپیوٹر پہ فلمیں دیکھتا تھا یا موبائل پہ چیٹنگ کرتا یا پھر آوارہ دوستوں کے ساتھ گھومنے نکل جاتا، عرف عام میں نومی انتہائی ہڈ حرام تھا گھر میں ہوتا تو باپ سے جوتے کھاتا، باہر نکلتا تو پڑوسیوں سے چھترول کرواتا، یہی دو بہترین مشغلے نومی کے تھے، جنہیں وہ خاصا انجوائے بھی کرتا تھا۔

ولید اس کی بکواس کو نظر انداز کر کے نشرہ کی تکلیف کو محسوس کر رہا تھا، وہ اب بھی سر جھکا کر گھٹی گھٹی آواز میں رو رہی تھی۔

''نشرہ! زیادہ تکلیف ہے؟ آؤ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔'' وہ جھک کر اس کے پیر کا جائزہ لیتا خاصا متفکر نظر آ رہا تھا، پاؤں کے ٹخنے پہ گہری سویلنگ تھی، تین انچ لمبا کیل بھی پڑ گیا تھا، نشرہ دائیں کلائی بھی دبا رہی تھی، جانے اسے اور بھی کہاں کہاں چوٹیں آئی تھیں، ولید بہت متفکر تھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے سسکاری دبا کر بمشکل ضبط سے کہا، ولید نے نفی میں سر دائیں بائیں ہلایا تھا۔

''مجھے کیوں نہیں لگ رہی؟'' وہ اب بھی متفکر تھا اور بڑی باریک بینی سے پاؤں کا جائزہ لے رہا تھا، عینی سے اس کا انہماک دیکھا نہیں گیا تھا، وہ اندر تک سلگ چکی تھی۔

''بہتر ہے، ذرا سا پاؤں مڑ گیا تھا ولید، تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔'' اس نے سلگن دبا کر بمشکل ملائمت کا مظاہرہ کیا تھا، حالانکہ دل تو چاہ رہا تھا چھڑی گھما کر نشرہ کو ولید کی نظروں سے دور کر دے، لیکن چونکہ کچھ خواہشیں پوری نہیں ہوتیں سو وہ بھی دل مسوس کر رہ گئی تھی، وہ نشرہ کو ولید کی نگاہوں سے دور کرنے کی اتھارٹی نہیں رکھتی تھی۔

''تکلیف نشرہ کو ہے تمہیں نہیں، سو تم چپ ہی رہو۔'' ولید نے ناگواری دبا کر کہا، عینی کو شدید توہین کا احساس ہوا تھا، اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ پڑ گیا تھا، وہ لب بھینچ کر اندر آتی ماں کو دیکھنے لگی تھی جنہیں صورتحال سمجھنے میں لمحہ بھی نہیں لگا تھا، پھر ولید کو نشرہ کے قریب دیکھ کر انہیں دو سو والٹ کا کرنٹ لگا، وہ تیزی سے ولید تک آئیں۔

''تمہیں آفس سے دیر نہیں ہو رہی؟'' صائمہ تائی کا بس نہیں چل رہا تھا ولید کو بازو سے پکڑ کر باہر کی راہ دکھا دیتیں۔

''نشرہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔'' اس نے نشرہ کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا اور اٹھایا، صائمہ تائی دھک سے رہ گئی تھیں، انہوں نے آگے بڑھ کر ولید کو روکا۔

''میں دیکھتی ہوں نشرہ کو، تم آرام سے دفتر جاؤ۔'' عینی کی آنکھ کا اشارہ سمجھ کر صائمہ تائی نے بڑی ملائمت سے کہا تھا، ولید کچھ متذبذب ہوا، کبھی وہ صائمہ تائی کو دیکھتا اور کبھی نشرہ کے تکلیف سے زرد پڑتے چہرے کو دیکھتا، نشرہ اس کے تذبذب کو محسوس کر چکی تھی، تبھی دھیمی پر نم آواز میں بولی۔

''ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے صائمہ تائی کو دیکھتے ہوئے کہا تھا جن کا چہرہ لمحوں میں پرسکون ہو گیا تھا، پھر وہ ولید سے ہاتھ چھڑوا کر بمشکل لنگڑاتے ہوئے اندر کی طرف بڑھی تھی، ولید بھی اس کے پیچھے چلا آیا، عینی اور صائمہ تائی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا تھا، پھر ولید نے مڑ کر عینی سے کہا۔

''تم کوئی پین کلر گرم دودھ کے ساتھ لے آؤ عینی۔'' وہ اسے ہدایت دیتا نشرہ کے لئے مخصوص سٹور روم میں چلا آیا تھا، نشرہ جو پلنگ پر نڈھال لیٹ رہی تھی، ولید کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی، ولید پہلی مرتبہ اس کے کمرے میں آیا تھا، یہ کاٹھ کباڑ سے بھرا سٹور روم تھا، جس کے ایک کونے میں نواڑ کا پلنگ رکھا تھا ایک لوہے کے ٹرنک میں نشرہ کے دو چار کپڑے پڑے تھے، اس کمرے میں شدید گھٹن اور حبس تھا، ولید کا دم الجھنے لگا، نجانے نشرہ کیسے اس کمرے میں بچپن سے رہ رہی تھی، ولید کو ترس آنے لگا، یہ ڈربا کسی انسان کے رہنے سونے اور آرام کرنے کے قابل نہیں تھا، اس کی آنکھوں کا تاثر پڑھ کر نشرہ شرمندہ ہو گئی تھی۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا تھا، کچھ سردی کی شدت سے اور کچھ

گھبراہٹ میں نشرہ کے دانت بج رہے تھے، معا اسے خیال آیا، وہ تو چھت پہ مشین لگا کر آئی تھی اور اب تو مشین کا بزر بج بج کر خاموش ہو چکا تھا اور نشرہ کی آنکھوں کے سامنے کپڑوں کی اونچی پہاڑی اندھیرا لا رہی تھی، گدھے کی طرح سارا دن بوجھ ڈھونے، کام کرنے، کولہوں کے بیل کی طرح جتے رہنے کا صلہ تو کیا، کبھی حوصلہ افزائی کا ایک جملہ نصیب نہیں ہوا تھا، اوپر سے کام میں دیر سویر ہونے کی صورت میں سب کی جھڑکیاں الگ سے سننے کو ملتی تھیں اور اب نشرہ کے پیر مڑنے کی وجہ سے دو گھروں کے گندے کپڑوں کا ڈھیر ٹب میں پڑا تھا اور اسے پورا یقین تھا ولید کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی اس کا کیا حشر ہونے والا تھا اور وہ ولید کی موجودگی میں لمحہ بھر کے لئے سکون حاصل کرنے کے چکر میں آنکھیں موند گئی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ولید نے زبردستی عینی سے ہلدی ملا دودھ منگوایا تھا، عینی کو بین کلر بھی لانا پڑی تھی اور یہ کام کرتے ہوئے عینی کا ہزار مرتبہ دل چاہا تھا کہ کچن بورڈ کے ریک میں پھنسی چھری نکال کر نشرہ کے حلق پر پھیر دے، اب عینی پہ اتنا برا وقت بھی آنا تھا اس دو ٹکے کی لڑکی کو سر آنکھوں پہ بٹھانا پڑ رہا تھا، اس کی تیمارداری کی جا رہی تھی، وہ جلتے بھنتے ولید کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی، صائمہ تائی کو لاڈلی بیٹی کا نشرہ کی جی حضوری کرنا سخت گراں گزر رہا تھا پھر بھی ولید کی خاطر اچھائی کی ملمع سازی بہت ضروری تھی۔

''اب تم آرام کرو نشرہ، ہلنا بھی مت، تمہارے پاؤں پہ عینی پالش کے بعد پٹی باندھ دے گی۔'' ولید نے زبردستی پین کلر اور دودھ پلا کر اسے آیوڈیکس منگوائی تھی، عینی کو مجبوراً آیوڈیکس بھی لانا پڑی تھی، تاہم مالش کا سن کر وہ ساری مروت بالائے طاق رکھ کر بے ساختہ چیخ پڑی۔

''میں اس کے پیروں کو ہاتھ کیوں لگاؤں؟ تمہارا دماغ ٹھیک ہے ولید، میرے ہاتھ خراب ہوتے ہیں۔'' عینی اپنے سفید ہاتھوں کو دیکھ کر ساری شائستگی کو ایک طرف رکھے بدتمیزی سے بولی تھی یوں کہ ولید بھی چونک گیا تھا۔

''تمہارے ہاتھ مسیحائی سے خراب نہیں ہوں گے۔'' اس نے ملائمت سے کہا۔

''میں اس کی نوکر نہیں ہوں۔'' عینی ماتھے پہ بل ڈال کر بگڑ کر رہ گئی تھی۔

''نشرہ بھی تم لوگوں کی نوکر نہیں ہے، پھر بھی تم سب کے کام کرتی ہے، کسی اپنے کی ہمدردی کرنے سے کوئی نوکر نہیں بن جاتا۔'' ولید کا انداز ناصحانہ تھا، صائمہ تائی جز بز سی پہلو بدلنے لگیں، دل چاہ رہا تھا اس بالشت بھر کی لڑکی کو دو جھانپڑ لگا دے جو اس وقت ولید کی ساری توجہ سمیٹ کر پلنگ پر محو آرام تھی۔

''لاؤ ولید! میں لگا دیتی ہوں۔'' موقع کی نزاکت سمجھ کر صائمہ تائی نے دانت پیس لئے تھے پھر آیوڈیکس ولید کے ہاتھ سے پکڑ کر نشرہ کے پاؤں کو جھٹکا دے کر دو انگلیوں سے ہلکی سی مالش کر کے فرض نبھا دیا تھا، پھر پٹی باندھتے ہوئے انہوں نے بہت زور سے نشرہ کے پیر کو جھٹکا دیا تھا وہ درد کی شدت سے کراہ اٹھی تھی، ولید فوراً آگے بڑھا تھا، پھر اس نے بے ساختہ صائمہ تائی کو جتلایا۔

''دھیان سے مامی اسے تکلیف ہو رہی ہے۔''

''ایسی بھی نازک نہیں۔'' صائمہ تائی نے دانت پیس کر کہا تھا، پھر گردن موڑ کر نشرہ سے مخاطب ہوئیں۔

''نشرہ بیٹا! اب تم آرام کرو، جلدی افاقہ ہوگا۔'' ان کے لہجے سے مصنوعی شہد ٹپک رہا تھا، نشرہ کے دل میں پھانس سی اٹکی تھی، وہ جانتی تھی یہ سب ولید کو دکھانے کی اداکاری تھی، ابھی ولید کے جاتے ہی صائمہ تائی نے اپنا چولا اتار پھینکنا تھا۔

ولید کے آنے سے پہلے وہ جس زبوں حالی کا شکار تھی اب بھی حالات کچھ مختلف نہیں تھے، پھر بھی پہلے سے بہت بہتر تھے، کیونکہ ولید جب سے یہاں آیا تھا عالیہ چچی اور صائمہ تائی کے مزاج میں بہت تبدیلی آئی تھی، کم از کم ولید کی موجودگی میں وہ دونوں نشرہ کے ساتھ انسانی سلوک ہی روا رکھتی تھیں، ورنہ ان دو خواتین نے نشرہ کو انسانوں کی کیٹیگری میں کبھی شمار نہیں کیا تھا۔

اگر وہ پیدائشی یتیم تھی تو ان دونوں کی بلا سے، کیا یہ کم تھا شوہروں کی یتیم بھتیجی کو اپنی اپنی چھت کا آسرا دے رکھا تھا، دو وقت وہ اوپر کھانا کھاتی تھی، دو وقت وہ نیچے کھانا کھاتی تھی، کام دونوں گھروں کا برابر کرتی تھی، ایک دن اوپر والوں کا ناشتہ بناتی، ایک دن نیچے والوں کا، اسی طرح دوپہر اور رات کے کھانے کی تیاری کے لئے بھی باری بنی ہوئی تھی، ہفتہ کے دن اوپر والوں کے کپڑے دھوتی تھی، اتوار کو نیچے والوں کے لئے مشین لگاتی تھی، صفائی کا کام اضافی تھا، دونوں تایا کی مہربانی سے اس نے ریگولر بی اے تک تعلیم حاصل کر لی تھی، یہی اس کے قناعت پسند دل کے لئے بہت کافی عیاشی تھی، آگے صرف بیٹی کو پڑھنے کی اجازت تھی سو وہ یونیورسٹی جا رہی تھی، نشرہ عموماً گھر تک محدود ہو چکی تھی، کیونکہ آگے پڑھنے کا خیال تک صائمہ تائی کو گوارا نہیں تھا۔

وقت مشکل ہی سہی، تاہم گزر ضرور رہا تھا، اس پرسکون وقت کی ندی میں پہلا کنکر تب گرا تھا جب دوبئی سے ولید آفیشل کام کے سلسلے میں پاکستان آیا تھا، ریذیڈنسی کے لئے اس نے اپنے ننھیال کا انتخاب کیا تھا، سو دونوں مامیوں کی چاندی ہو گئی تھی، اکلوتی نند کے اکلوتے بیٹے کو پھانسنے کا بڑا سنہرا موقع ملا تھا سو دونوں ہی اسے گنوانا نہیں چاہتی تھیں، یہ اور بات تھی کہ دوبئی پلٹ انتہائی ڈیسنٹ اور لائق ولید ابھی تک ان کے دام میں نہیں آیا تھا، پھر بھی ہی دونوں اپنی اپنی سعی میں ہلکان ضرور ہو رہی تھیں کیونکہ کہا ضرور جاتا ہے امید پہ دنیا جو قائم ہے اسی امید کے تنکے کا سہارا لے کر صائمہ تائی اور عالیہ چاچی بے خطر اس دریا میں کود پڑی تھیں، اب دیکھنا یہ تھا کہ وقت کی تیز موجیں انہیں کنارے پہ لگاتی ہیں یا پھر بیچ منجدھار میں ڈبو ڈالتی ہیں، ابھی تک تو وہ دونوں ہی پر یقین تھیں، فی الوقت ولید کو ٹالنا بہت ضروری تھا، لیکن برا ہو ولید کی مستقل مزاجی کا، وہ بھی آسانی کے ساتھ ٹلنے والا نہیں تھا، اوپر سے دوپہر کا وقت قریب آ رہا تھا، کھانے کی تیاری بھی کرنا تھی، صائمہ تائی کو پھر سے لہجے میں مٹھاس بھر کر کہنا پڑا۔

''ولید بیٹے! اب تمہاری تسلی ہو گئی ہے تو جاؤ تم، یہاں نشرہ کا خیال رکھنے والے بہت لوگ موجود ہیں۔'' تائی کا میٹھا لہجہ نشرہ کے اندر تک کڑواہٹ بھر گیا تھا، وہ جانتی تھی ولید کے جاتے ہی کون سا خیال اور کیسا خیال کے مصداق نشرہ کا حشر ہونے کے قریب تھا، سو لمحاتی طور پہ یہ معمولی سی عیاشی نشرہ کے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں، آپ سب نشرہ کا بہت خیال رکھتے ہیں، رات کو ممی بھی پوچھ رہی تھیں۔'' ولید کا انداز بلا کا معنی خیز ہو گیا تھا، صائمہ تائی بے ساختہ ٹھٹک گئیں۔

''تو تم نے فرح کو کیا بتایا؟'' انہوں نے بے ساختہ گڑبڑا کر پوچھا، ولید کے ہونٹوں پہ بے ساختہ معنی خیز سا تبسم پھیل گیا تھا، اس نے گہرا سانس کھینچ کر بتایا۔

''میں نے جو دیکھا وہی بتایا۔'' وہ اب بھی مسکرا رہا تھا، نشرہ کا چہرہ لحاف میں چھپا تھا، وہ ولید کی مسکراہٹ دیکھ نہیں سکی تھی تاہم اس کا مسکراتا لہجہ بتا رہا تھا کہ تائی کی پتلی حالت اسے کتنا مزہ دے رہی تھی، کاش کے نشرہ بھی اس دلفریب منظر سے لطف اندوز ہو سکتی، کیونکہ ہی موقع بھی کبھی نصیب سے ملتا تھا۔

''تم نے کیا دیکھا؟'' تائی لمحوں میں ہونق پن کی انتہا کر گئی تھیں، ولید کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''جو آپ نے اب تک دکھایا ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا۔

''اچھی دے چلتا ہوں، امید ہے آپ نشرہ کا خیال رکھیں گی۔'' ولید مسکراتا ہوا اسٹور روم سے باہر نکل گیا تھا، اس کے جانے کی تسلی کر کے صائمہ تائی نے گھور کر لحاف میں دبکی نشرہ کو دیکھا تھا پھر وہ جارحانہ تیور لیے اری پلنگ کے قریب پہنچی ہی تھیں جب اوپر سے عالیہ چاچی شعلہ جوالہ بنی دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئیں۔

''کہاں ہے وہ نواب زادی؟ انتہا کی ست اور کاہل لڑکی ہے، ٹب لینے کے بہانے نیچے آ گئی، اوپر مشین کا بزر بج بج کر باؤلا ہو گیا تھا، کپڑوں کا پہاڑ الگ سے رو رہا ہے، اوپر سے موسم کے تیور بگڑتے دیر نہیں لگتی، کبھی دھند اور کبھی دھوپ، ہونہہ سرما کے دن ہیں، یوں آئے اور یوں گزرے، کپڑوں کا ماؤنٹ ایورسٹ کیا تمہارا باپ قبر سے نکل کر دھوئے گا؟ میں کہتی ہوں کہاں ہے وہ کام چور ہڈ حرام لڑکی؟۔'' عالیہ کی پاٹ دار آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی، وہ تیز تیز بولتے ہوئے کبھی کچن اور کبھی دیگر کمرے بھی تاک رہی تھیں، گویا نشرہ کو کسی کمرے سے دریافت کرنے کا ارادہ تھا۔

''جب بھی میرے کام کی باری آتی ہے اس لڑکی کے مزاج نہیں ملتے، پچھلے ہفتے بھی میرے کپڑوں کے ساتھ اس نے یہی حشر کیا تھا، جیسے تیسے دھو تو دیئے تھے لیکن نہ الگنی سے اتارے اور نہ سنبھالے، برا ہوا اس طوفانی بارش کا، آدھے کپڑے دھول مٹی ہوتے اور آدھے طوفان لے اڑا، حمرہ کا ساڑھے تین ہزار کا سوٹ بھی غائب ہو گیا تھا، بعد میں ہفتوں حمرہ نے سوگ منایا، یہ منحوس ماری صرف نقصان کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی، زندگی اجیرن کر دی۔'' چاچی کو اچانک حمرہ کا قیمتی سوٹ یاد آ گیا تھا، جس کے غائب ہونے اور لقمہ طوفان بن جانے کے بعد چاچی کا بس نہیں چل رہا تھا، نشرہ کو قینچی کے ساتھ دھجی دھجی کتر دیں، اب بھی چاچی کی پاٹ دار آواز سن کر نشرہ نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے لحاف چہرے سے ہٹا دیا تھا، اس کے آرام اور عیاشی کا مختصر پریڈ اختتام کو پہنچ گیا تھا، اب اسے گرم لحاف کو چھوڑ کر پیر کے درد کو بھلائے عالیہ چاچی کے ماؤنٹ ایورسٹ کو دھونا تھا، نیچے والوں کا کھانا پکانا تھا، پھر دھلے ہوئے کپڑے استری کرنے کے بعد کھانے لگانے تھے، اگر

ٹائم بچ جاتا تو گندم بھی صاف کرنا تھی، کاموں کی طویل فہرست اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا بھر رہی تھی۔

''کہاں دفعان ہوئی ہے نشرہ، مجال ہے اس لڑکی کے کان پر جوں تک رینگی ہو کب سے بکواس کر رہی ہوں۔'' عالیہ چاچی منہ پھاڑ کر چیخی تھی، تب عینی نے ناگواری سے سٹور کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''اپنے محل سرا میں آرام فرما رہی ہے۔'' اس کا انداز بھی بلا کا جلا کٹا تھا، ابھی تک ولید کا بی ہو ئیر اندر تک سلگن بھر رہا تھا، اس کلموہی کے لئے ولید کی توجہ برداشت سے باہر تھی۔

''کیا؟'' چاچی کو تو نشرہ کے آرام کا سن کر ہارٹ اٹیک ہونے لگا تھا، تب قصہ مختصر عینی نے چاچی کو ساری کاروائی بتا دی تھی، عالیہ چاچی کی آنکھیں پھیلتی سکڑتی گئیں۔

''ارے ہمارے کام کون کرے گا؟ یہ ولید تو پاگل ہے، پکڑ کر اسے بستر پہ لٹا دیا، بڑی سخت جان اور ڈھیٹ ہڈی ہے، اتنی آسانی سے نہیں مرے گی، میں ابھی اسے نکالتی ہوں کمرے سے، کیسی بے دید لڑکی ہے، بچے کی ذرا سی ہمدردی پہ پھیل گئی، اپنی اوقات ہی بھول گئی۔'' چاچی تیر کی تیزی سے سٹور کی طرف بڑھی تھیں، پھر انہوں نے دھاڑ سے دروازہ کھولا تھا، دوسرے ہی پل انہوں نے نشرہ کو چوٹی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بستر سے اٹھایا، لحاف کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور کسی کی تکلیف کا احساس کیے بغیر ایک زوردار تھپڑ نشرہ کے پھول سے رخسار پہ دے مارا تھا، پھر اسے بازو سے دبوچ کر گھسیٹتے ہوئے دھکا دیا، وہ لڑکھڑا کر فرش پہ جا گری۔

''چل دفع ہو کام کر اپنا، بڑی آئی پلنگ توڑنے والی، ولید کو ادائیں دکھانے والی، آئندہ ایسی بد حرامی دکھائی تو چار چوٹ کی ماردوں گی، بے حیا بے غیرت نہ ہو تو۔'' وہ اسے ایک مرتبہ پھر سیڑھیوں پہ دھکا دے کر چلائی تھیں، اس منظر کو صائمہ تائی اور عینی نے بھی دیکھا تھا، لیکن ان دونوں نے عالیہ کو روکنے کی کوشش میں وقت ضائع نہیں کیا تھا، نشرہ ایسے سلوک کی ہی مستحق تھی، آخر اس نے ولید کی توجہ حاصل کرنے کا گناہ جو غیر دانستگی میں کر لیا تھا۔

ادھر عالیہ چاچی کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا، انہیں اپنے کپڑوں کے ڈھیر کی فکر تھی، وہ اس کے سوجے ہوئے پاؤں پر اپنی جوتی کی نوک ٹھونک کر چلا رہی تھیں، نشرہ درد اور کرب کی شدت سے کراہ بھی نہیں سکی تھی، اس کے امڈتے آنسو تک آنکھ میں برف کی طرح جم گئے تھے، اس کا پورا وجود برف کا گلیشیئر بن رہا تھا، آسمان نے آج بھی اس منظر کو بڑی اذیت سے دیکھا تھا، وہ اس تنہا بے بس اور اکیلی لڑکی کے غم میں قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔

''اور یتیموں کا اللہ کے سوا کوئی پرسان حال نہیں۔'' آسمان غم سے نڈھال ہو گیا تھا، اس نے قہر سے اہل زمین والوں کو دیکھا جن میں کچھ لوگوں کے دل بحیرہ اسود کے پانیوں کی طرح سیاہ تھے، ایسے دل جن پر مہر لگا دی گئی تھی، جو کسی نیکی کسی انسانیت کسی بھلائی کسی احسان، کسی نرمی اور کسی ترس کے ذائقے سے ناآشنا تھے، جن کے دلوں سے خدا نے رحم کو اٹھا لیا تھا اور ان کا شمار بے رحموں اور ظالموں میں کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

ہل سٹیشنز پر سردیوں کا موسم بڑا قیامت بن کر اترتا ہے۔
لیکن یہ قیامت سیاحوں کے لئے نہیں ہوتی بلکہ مقامی لوگوں کے لئے ہوتی ہے، سوکھے پہاڑوں پر برف مقامی لوگوں کو تو متاثر نہیں کرتی تھی، بلکہ جہاں تک ممکن تھا پریشان کرتی تھی، عموماً برفانی تودے اچانک سڑکوں کو بلاک کر دیتے تھے، شہروں اور دیہاتوں کی طرف آنے جانے والے سارے رستے ہلاک ہو جاتے تھے، کاروبار مراکز متاثر ہوتے تھے، عام زندگی کا نظام ٹھپ ہو جاتا تھا، لوگ گھروں میں باؤنڈ ہو جاتے، نہ کوئلہ ملتا تھا نہ لکڑی، سردی الگ مفلوج کرنے لگتی تھی، سو پہاڑوں پہ جمتی برف دور دراز کے علاقوں سے آنے والے سیاحوں کے لئے اٹریکشن ضرور رکھتی تھی تاہم مقامی لوگ ناک تک عاجز آ جاتے تھے۔
یہ کوئی چھوٹا سا نام نہاد معمولی گاؤں نہیں، منگلورہ شہر تھا، اتنا بڑا وسیع و عریض جدید شہر، رکشوں، تانگوں، بسوں اور موٹروں کی بھرمار تھی، دور حاضر کی ہر سہولت اور خوراک سے مزین، درجنوں کے حساب سے ہوٹلز تھے، سپر سٹور تھے، پیکڈ فروٹس جوسز، دودھ، خشک خوراک کی ہر سہولت میسر تھی۔
بریکوٹ اور اودے گرام میں تاریخ بولتی تھی، اس کی سوندھی مہک میں سکندر اعظم اپنی فوج کی کمان کرتا خود دکھائی دیتا تھا، آج بھی رات کے مہیب سناٹوں میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔
یہاں رات جلدی نہیں اترتی تھی پھر بھی لوگ کنڈیاں چڑھا کر گرم بستروں میں دبک جایا کرتے تھے، اس کے تین منزلہ گھر سے کچھ فاصلے پر والی سوات کی کوٹھی تھی، کوٹھی کے باہر زنگ آلود جنگلے کے کنارے پہ رکھے اسٹول کی اونچائی پہ ایک سپاہی پرانی وردی میں ملبوس اونگھ رہا تھا۔
پل کے اس پار "روزگل" ہوٹل تھا، نہایت عالیشان، جدید اور خوبصورت، ایسے علاقے میں سیون اسٹار ہوٹل دیکھ کر پی سی کی یاد آ جاتی تھی، ہیام جب منگلورہ میں تھا تب مورے (ماں) کی ہزار ناراضگی کے باوجود چاروں بڑی بہنوں کو جیپ میں لاد کر روزگل پہنچ جاتا تھا، یہاں کی ٹراوٹ بڑی مشہور تھی، آلو بخارے کی ساس میں تیار ہوتی تھی مزیدار اور لذیذ، ہیام بڑا زندہ دل، خوش باش انسان تھا، زندگی کے لمحے لمحے سے خوشی کشید کرتا تھا، اس کی نسبت یہ چاروں بہنیں اور مورے بہت خشک مزاج سنجیدہ ٹائپ خاصی روکھی قسم کی خواتین تھیں، شاید ہیام کے اور ان کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔
وہ اسرئی میڈیکل یونیورسٹی کا فارغ التحصیل انتہائی ذہین اور خوش مزاج "یوڈا ایئرسٹ" تھا جبکہ وہ چاروں بہنیں پرائیویٹ گریجویٹ تھیں، گھر کی چار دیواری سے بہت کم نکلنے والی، پھر مورے کے سخت مزاجی نے ان چاروں کے گرد سخت قسم کا ایک خول بنا دیا تھا، وہ چاہ کر بھی اپنے اس محدود دائرے سے نکل نہیں سکتی تھیں، ان چاروں میں عنیہ کی زندگی کچھ الگ تھی، یقینی کہ وہ اس گھر کے ماحول سے نکل کر میانڈم کے ویل آف ایجوکیٹڈ گھرانے کا حصہ بن چکی تھی، یہ اور بات تھی کہ عنیہ کی ساس ان کی مورے سے قطعی طور پر کم نہیں تھیں ویسی ہی اکڑ، غرور، تند مزاج، پھر بھی عنیہ اپنے شوہر افراسیاب کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔

آج کا دن کچھ عجیب انداز میں طلوع ہوا تھا۔
صبح ہی صبح عنیہ کی پراسرار فون کال آئی تھی، جسے سن کر مورے نے سر لپیٹا اور لحاف میں گھس گئیں، یہ کیفیت ان کے شدید ڈپریشن کو ظاہر کرتی تھی، اللہ جانے عنیہ نے سویرے سویرے کون سا صور پھونکا تھا، عمکیہ اور عشیہ کی جرأت نہیں ہو سکی تھی کہ مورے سے کچھ پوچھ سکیں، انہوں نے اپنا من پسند دیسی گھی میں بنا چوری نما ناشتہ بھی گول کر دیا تھا، سو یہ تینوں بہنیں خاصی پریشان ہو رہی تھیں، کیونکہ معاملہ اچھا بھلا گمبھیر لگ رہا تھا۔
دوپہر کے قریب مورے نے گرم لحاف منہ سے کھینچ کر ہٹایا تھا یہ تینوں بہنیں فوراً الرٹ ہو گئی تھیں، عمکیہ بالائی والی چائے تیار کرنے بھاگی تھی، عروفہ نے تیزی سے چوری بنانا شروع کر دی تھی، معاً مورے کی بلند اور روکھی آواز سنائی دی، وہ عشیہ کو آواز دے رہی تھیں، عشیہ اون سلائیاں پھینک کر پیروں میں چپل پھنسائے بھاگتی ہوئی مورے کے کمرے تک آئی تھی، مورے نے پیچ پہ ٹوپا چڑھا رکھا تھا، ان کی ناک سرخ اور چہرہ تپ رہا تھا، گویا طبیعت ابھی تک ناساز اور بیزار تھی، مورے نے عشیہ کی موجودگی محسوس کر کے کرخت آواز میں کہا۔
''ہیام کو لاہور کال ملاؤ۔'' وہ اٹھ کر اپنی تجوری کی تلاشی لے رہی تھیں، جانے اس تجوری میں کون سے خزانے دفن تھے، جس کی ہر روز گنتی ہوتی، درشن کیا جاتا اور پھر لاکر میں اسے سمیٹ کر سنبھال دیا جاتا تھا۔
''اس وقت؟'' عشیہ نے چونک کر گھڑیال کی طرف دیکھا۔
''جتنا کہا ہے بس وہی کرو۔'' وہ اپنے ازلی کرخت لہجے میں بولی تھیں، عشیہ کو تار کھینچ کر فون سیٹ قریب لانا ہی پڑا، پھر نمبر ڈائل کر کے اس نے ریسیور مورے کو تھما دیا تھا۔
''تم خود بات کرو۔'' انہوں نے عشیہ کو اشارے سے سمجھایا، وہ کچھ متذبذب تھی، بھلا کیا بات کرے؟
''کیا کہوں؟'' ہیام کی ہیلو کے جواب میں اس نے ماں کی طرف ہونق پن سے دیکھا تھا، مورے نے تیکھے چتونں سے اسے گھورا۔
''ذرا دم تو لو، بتاتی ہوں۔'' ان کا انداز پہلے سا کرخت تھا، دوسری طرف ہیام گہرا سانس کھینچ کر رہ گیا، وہ سمجھ گیا تھا مورے کو کچھ ضروری بات کرنا تھی، انہوں نے لمبی لمبی چابیوں کا گچھا نکال کر لاکر کو تالا لگایا اور چابیاں سنبھال کر تکیے کے نیچے رکھ لیں۔
''ہیام سے پوچھو کب آئے گا وہ؟'' مورے نے مصروف انداز میں ہیام سے کی جانے والی گفتگو اسے سمجھائی تھی، وہ سر ہلا کر پوچھتی رہی۔
''ابھی تو ممکن نہیں۔'' ہیام نے ترنت جواب دیا۔
''کیوں ممکن نہیں؟'' اس نے مورے کے اشارے پہ پوچھا تھا۔
''اتنی جلدی چھٹی نہیں ملے گی، نئی نئی سرکاری نوکری ہے۔'' ہیام نے دکھی انداز میں تفصیل بتائی تھی۔
''سرکاری ہسپتال کا ماحول کیسا ہے؟'' عشیہ نے پیار سے دریافت کیا تھا، دوسری طرف وہ

اتنا ہی سلگ کر بولا۔
''انتہائی ان رومینٹک، کیمیائی بو سے رچا بسا، ان رنگین پکی عمروں کی نرسیں اور خوفناک سی انتہائی بدلحاظ ہسپتال کی ایم ایس، بھجو تو میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے، کیا سوچ کر منگورہ کے حسن جہاں سوز کو چھوڑ کر آیا تھا، یہاں تو سب کی روکھی پھیکی پیلی کالی یرقان زدہ شکلیں ہیں، منہ پہ پھٹکار برستی ہے، کہاں میرے شہر کے لال لال ٹماٹر سے خوبصورت چہرے، قندھاری انار جیسے گال اور سیبوں جیسے میٹھے رسیلے لہجے۔'' ہیام جو تیز گام پہ سوار ہوا تو روکنے کا سوال ہی کہاں تھا۔
''کئی دفعہ او ٹی سے الجھا ہوں، تین دفعہ بلڈوزر نما ایم ایس سے ٹکرایا ہوں کہ ہسپتال میں کوئی رنگین اور فریش چہروں کی بھرتیاں کرو، اتنے کرخت چہرے دیکھ کر تو مریض کا خودکشی کرنے کا دل کرتا ہے، لیکن نقار خانے میں طوطی کی سنتا کون ہے؟'' وہ ناک چڑھا کر بھناتا چلا گیا تھا، عشیہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی تھی جسے مورے کی موجودگی میں اس نے سمیٹ لیا تھا۔
''تو تم نے خود کو طوطی تسلیم کر ہی لیا؟'' عشیہ نے مزہ لیتے ہوئے کہا، اپنے دھیان میں بولتا ہوا ہیام ایکدم چونک گیا تھا، پھر اس نے جلدی سے وضاحت کی۔
''میں نے محاورہ بولا ہے۔'' وہ چڑ سا گیا۔
''لیکن میں نے محاورہ نہیں سمجھا۔'' عشیہ اسے اور چڑا رہی تھی، ہیام نے جلدی سے موضوع بدل دیا، کیونکہ اپنی کمزوری پہ وہ بات کرنا گوارا نہیں کرتا تھا۔
''منگورہ کا موسم کیسا ہے؟'' وہ جلدی سے محکمہ موسیات کی رپورٹنگ پہ آ گیا، عشیہ اس کی چالاکی سمجھ کر مسکرا دی تھی۔
''میں میٹرولوجسٹ نہیں ہوں۔'' اس نے جتلا کر کہا۔
''آئی نو تم ہو بھی کیسے سکتی ہو؟'' ہیام نے منہ بنایا تھا۔
''میں تو برف کا احوال پوچھ رہا ہوں، گر رہی ہے یا رک چکی ہے؟''
''تمہارے جانے کے بعد تو بہت گری ہے۔'' عشیہ نے اسے اور چڑایا۔
''ہاں تو سوگ مناتی رہی ہوگی۔'' اس نے بھی کان سے مکھی اڑائی تھی۔
''اچھا بتاؤ رہائش کا انتظام ہو گیا؟'' عشیہ کو کام کی بات اچانک یاد آئی تھی، دوسری طرف ہیام نے لمبی لمبی ٹھنڈی آہیں بھری تھیں، اس کے پاس بہت طویل اور دردناک کہانی تھی لیکن عشیہ کے دہلنے پر اس نے مختصر بتایا۔
''ابھی کہاں؟ ہوٹلز بدل بدل کر دھکے کھا رہا ہوں، پورے لاہور میں میرے لئے ڈھنگ کی رہائش نہیں، جو ذرا میرے اسٹینڈرڈ کی ہے اس تک میری جیب رسائی نہیں رکھتی، بڑے تنگی کے دن ہیں، اسٹارٹ میں تو ٹرک ہوٹلز میں رہا ہوں، پنجاب کی پتلی دال سڑکتا رہا ہوں، سمجھ نہیں آتا تھا کہ دال ہے یا چائے؟ یا دال کا پتلا سا بے مزہ سوپ، بڑے صبر سے دن گزارے ہیں، پھر سوچا آخر میرا معاشرے میں ایک مقام ہے، ایک باعزت پیشے سے وابستہ ہوں، ٹرک ہوٹلز میرا معیار نہیں، سو ایک کولیگ سے مشورہ کیا تھا، اس نے کسی ''احسان منزل'' کا ذکر کیا تھا، وہاں بطور پے انگ گیسٹ کے لئے انٹرویو دینے جانا ہے، خیر چھوڑو، تم سناؤ، علیہ اور اس کی شہزادی کیسی ہے؟

عمکیہ اور عروفہ کا کیا حال ہے؟ مورے کی کمر کا درد کم ہوا؟ روز گل کی دوکانداری اور بزنس کا سناؤ، یہ تو سیزن کے دن ہیں، بڑا روپیہ کما رہا ہوگا، آہ میں تو پردیس میں دھکے کھا رہا ہوں۔" ایک ہی سانس میں کل حکائیت سناتا آخر میں وہ دکھی ہوگیا تھا، حالانکہ یہ دکھی ہونے کی سراسر اداکاری تھی، عشیہ اس کی تمام مکاریوں سے واقف تھی، اسے ہمدردیاں بٹورنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

"ٹرانسفر نہیں ہوسکتی کیا؟" عشیہ کا دل بھائی کے دردناک روز و شب پہ اداس ہوگیا۔

"اتنی جلدی کہاں؟" اس نے اور بھی منہ لٹکا لیا۔

"تم کوشش تو کرتے۔" عشیہ افسردہ ہوگئی تھی۔

"کیسے کرتا؟ ایم ایس میری محبوبہ کی ماں نہیں ہے، جس کی سفارش سے میں لاہور سے اڑتا ہوا منگورہ کے جنرل ہسپتال پہنچ جاتا۔" وہ چڑ کر رہ گیا تھا، عشیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا، ہیام کی بات میں بہت وزن تھا، اسے مانتے ہی بنی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا۔" عشیہ نے پیار سے سمجھایا، ہیام ان چار بہنوں کا سب سے چھوٹا اور اکلوتا بھائی تھا، جب بھی گھر میں آتا، اپنے وجود کی ساری رونقیں بکھیر دیتا تھا، اس کے چلے جانے کے بعد پھر سے ان کی زندگیاں گئی بندھی لائف میں جمود کا شکار ہو جاتی تھیں۔

"خیال کون رکھے؟ خیال رکھنے والی لے آؤ نا۔" اس نے لگے ہاتھوں اپنی خواہش بہن تک پہنچا دی تھی، یہ اس کا دلارا بھائی شادی کے لئے کب سے تڑپ رہا تھا، بے چارے کو بچپن سے شادی کا بہت شوق تھا۔

"وہ بھی آجائے گی، وقت تو آنے دو۔" عشیہ نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

"وہ وقت نجانے کب آئے گا؟ جس کے انتظار میں ڈاکٹری جیسا پل صراط بھی میں نے پار کر لیا۔" وہ بے انتہا غم زدہ تھا، جیسے وہ ڈاکٹر ہی شادی کروانے کے لئے بنا تھا۔

"امید پہ دنیا قائم ہے۔" عشیہ نے اسے ڈھارس پہنچائی۔

"کتابیں ایسی باتوں سے بھری ہیں۔" وہ جل کر رہ گیا تھا، عشیہ ہنسنے لگی، تبھی مورے کی لہراتی چپل اس کی کہنی سہلا گئی تھی، اس نے سی کی آواز سے کراہ کر مورے کو دیکھا تھا، جو عشیہ کو خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھیں، جیسے کہنا چاہتی ہوں، "کیا اس مقصد کے لئے ہیام کو فون کیا ہے؟" عشیہ کو بھی اچانک ہیام کو فون کرنے کی وجہ کا خیال آگیا تھا، اس نے جلدی سے مورے کو بتایا، مبادا دوسری چپل بھی اڑتی ہوئی نہ آجائے۔

"یہ تو میں نے بھی سن لیا ہے۔" انہوں نے خونخوار نظروں سے عشیہ کو دیکھا۔

"اسے مجبور کرنا تھا کہ وہ ضرور آئے۔" اب وہ اپنی دوسری چپل کو گھور رہی تھیں، عام طور پر وہ زبان کا کم اور ہاتھوں کا زیادہ استعمال کرتی تھیں اور وہ چاروں بہنیں مورے کی عادت سے اچھی طرح واقفیت رکھتی تھیں۔

"وہ نہیں آسکتا مورے، اس کی نئی نئی نوکری کا سوال ہے۔" عشیہ نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

"کوئی بڑا مسئلہ ہے مورے۔"

"ہاں، بہت بڑا مسئلہ ہے، بلکہ مسئلوں کا پہاڑ ہے۔" وہ غصے سے تڑخ کر بولیں، مسئلہ واقعی

پیچیدہ تھا، عشیہ دہل سی گئی تھی، نجانے عنیہ نے کال کر کے مورے کو کیا کہا تھا؟ عیشہ کو سچ مچ پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔

''بات کیا ہے؟'' اندر آتی عمکیہ نے بھی سوال اٹھایا تھا، مورے نے اسے بھی گھورا، حالانکہ اس لحاظ سے عمکیہ بڑی بہادر تھی جو مورے سے ہر قسم کے سوال جرأت کر سکتی تھی۔

''عنیہ کی ساس آ رہی ہے۔'' مورے نے بالآخر پنڈورا باکس کھول دیا تھا، کھودا پہاڑ نکلا چوہے والا معاملہ ہوا، عنیہ کی ساس آ رہی تھی یا ملکہ وکٹوریہ؟ اس میں اتنی پریشانی کری ایٹ کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ صبح سے مورے منہ سر لپیٹ کر پڑی تھیں، محض اس لئے کہ عنیہ کی ساس آ رہی تھیں؟ لیکن وہ صرف عنیہ کی ساس کہاں تھیں، بلکہ عشیہ کی ہونے والی ساس بھی تھیں، کیونکہ عشیہ کا رشتہ زبانی کلامی افراسیاب کے چھوٹے بھائی زریاب سے طے تھا، اب شاید عنیہ کی ساس تاریخ لینے آ رہی تھیں، عمکیہ نے بلاوجہ ہی قیاس کی لگامیں ڈھیلی کر لی تھیں، اسے مورے کی پریشانی سراسر فضول لگی تھی۔

گو کہ باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی پھر بھی زبانی بات طے تھی کہ عشیہ کو عنیہ کی دیورانی بننا ہے اور اب شاید عنیہ کی ساس اس زبانی کلامی رشتے کا نام دینے آ رہی تھیں۔

''ہیام ہوتا تو اچھا تھا، سمجھ نہیں آ رہی، کیا فیصلہ کروں؟ عجیب دورا ہے پہ لا کھڑا کیا ہے اس سر پھری عورت نے۔'' مورے غصے سے تپے تپے لہجے میں مضطرب سی بول رہی تھیں، اب کہ وہ دونوں ہی ٹھنک گی تھیں، گویا معاملہ گمبھیر ہی تھا، اتنا ہلکا نہیں تھا جس قدر وہ سمجھ رہی تھیں۔

''عمکیہ کے رشتے کی بات کرنے آ رہی ہے، بولتی ہے، زریاب نہیں مانتا، عنیہ کی ضد ہے انکار نہ کیا جائے، عشیہ سے رشتہ توڑ رہے ہیں۔'' انہوں نے بالآخر ان سب کے سروں پہ پٹاخہ چھوڑ ہی دیا تھا، وہ دونوں ہکا بکا رہ گئیں۔

☆☆☆

وادی بیال میں حسن پگھل رہا تھا۔

رات کی ساحرہ کے پر سمیٹتے ہی صبح جمال کے حسن نے ذرے ذرے کو اشکا دیا تھا۔

سایہ کوہسار میں ایک خوبصورت سبزہ زار کے وسط میں دلکش ندی تھی اس ندی کے کنارے کھلے ہوئے شگفتہ پھول تھے اور ان پھولوں پر منڈلاتی ہوئی رنگ برنگی تتلیاں دھانی رنگ بکھیر رہی تھیں۔

اس نے سلک کے کرٹن سمیٹ کر کھڑکی کے بھاری پٹ کھول دیئے تھے، اس کھڑکی کے شمال جانب نانگا پربت کی حسین چوٹی تھی، وہی نانگا پربت جس کے حضور لاکھوں سیاح گھٹنے ٹیک چکے تھے۔

اچانک ہی نانگا پربت کی برف پوش چوٹی نے تھوڑی دیر کے لئے بادلوں کی اوٹ سے نکل کر دعوت نظارہ دی تھی، اسے دیکھ کر یوں لگا تھا جیسے کسی ملمع ساز نے بڑی خوبصورتی سے اسے چاندنی کی قبا پہنا دی ہو، نانگا پربت کی چوٹی سیاحن عالم اور کوہ پیماؤں کے لئے بے پناہ کشش کا باعث تھی، اس کے پہلو کا گلیشیر ماہرین ارضیات کے لئے بے پناہ اہمیت کا حامل تھا۔

گلیشیر دراصل برفانی تودے کو کہتے تھے جو کوہستانی علاقوں میں تہہ در تہہ برف جمنے سے معرض وجود میں آتا تھا اس کی نچلی سطحیں کم درجہ حرارت کی وجہ سے سخت صورت اختیار کر لیتی تھیں جس کی وجہ سے یہ سردیوں میں تو مضبوطی سے اپنی جگہ جمارہتا تھا جبکہ گرمیوں میں اندر سے پگھلنا شروع ہو جاتا تھا سو دریاؤں کی کمی تو دور ہوتی ہی تھی اکثر اوقات تو ان گلیشیر کی وجہ سے بہت حادثات بھی رونما ہوتے تھے، کبھی کبھی ان کے سرکنے سے انسانی جانیں تک ضائع ہو جاتی تھیں، انسانی آبادیاں زد میں آجاتی تھیں، زرعی رقبے تباہ ہو جاتے تھے۔

یہ ڈسٹرکٹ دیامر کا حسین و جمیل علاقہ بیال تھا، جس کے حسین گلیشیر ملکی اور غیر ملکی ماہرین ارضیات کی توجہ کا مرکز بنے رہتے تھے، رائے کوٹ، سکن، چنگلفر، بازین اور توشن، نامی گلیشیر بہت مشہور تھے، جنہیں دیکھنے اور مبہوت ہونے بہت سے سیاح ضلع دیامر آتے رہا کرتے تھے۔

تو شاید وہ بھی ایک سیاح ہی تھا جو آیا اور چھا گیا، جس کو دیکھ کر دل لمحہ بھر کے لئے دھڑکنا بھول گیا تھا، تو کیا وہ واقعی کوئی سیاح تھا؟

حمت نے اسے قبرستان کے علاقے کی طرف دیکھا تھا، نہ جانے وہ بٹو قبیلے کے اس خاندانی قبرستان کی طرف کیوں آیا تھا؟ اس کا وہاں کیا کام تھا؟ اس کے ساتھ تین اور خوش پوشاک لوگ تھے اور اپنے حلیے سے وہ لوگ مقامی نہیں لگتے تھے، وہ اپنے ساتھیوں کو کچھ کاغذات کے پلندے اور نقشے دکھا کر نجانے کیا سمجھا رہا تھا، حمت نے بس اسے ایک مرتبہ قبرستان کے علاقے کی طرف دیکھا تھا، بعد میں وہ کئی مرتبہ بہانے بہانے سے وہاں گئی تھی لیکن وہ اجنبی سیاح اسے دوبارہ دکھائی نہیں دیا تھا اور اس کا دکھائی نہ دینا حمت کے اندر دور تلک سناٹے اتار گیا تھا، اتنی مہیب خاموشی تھی کہ دل سینے میں تنگ پڑ جاتا تھا، تب وہ چپکے سے اپنی مرحومہ ماں کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے کے بہانے گھر سے نکل کر قبرستان پہنچ جاتی تھی، اس امید پر کہ شاید وہ اجنبی سیاح دوبارہ دکھائی دے سکے۔

لیکن وہ ایسی بخت آور کہاں تھی؟ جو دل کی مراد کو پالیتی، دیدار سے سیراب کر دی جاتی، وہ کہاں اتنی بلند بخت تھی، اگر اتنی بلند بخت ہوتی تو کیا یہاں ہوتی؟

جانے وہ کب تک نانگا پربت پہ نگاہ جمائے محو کھڑی رہتی، چونکی تو تب تھی جب سردار کبیر بٹو کی امریکی بیٹی شان بے نیازی سے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

اس کی پیدائش تو دیامر کی تھی مگر سردار کبیر بٹو نے اوائل عمری میں اسے امریکہ بھیج دیا تھا، وہ اپنی ماں کے ساتھ امریکہ میں پلی بڑھی تھی، اب وہ سردار بٹو کی امریکی بیٹی کے نام سے مشہور ہو چکی تھی، ایک سال پہلے یہ "بت مغرب" اپنے حسن و جمال کی تابناکیوں سمیت دیامر میں فروکش ہوا تھا، پھر اسے یہ علاقہ اتنا بھایا کہ واپس گئی ہی نہیں۔

اپنی کالی آنکھوں اور کالے سیاہ ریشمی بالوں کی وجہ سے وہ پورے خاندان کی لڑکیوں سے ممتاز اور منفرد نظر آتی تھی، غرور تکبر کا مرقع تھی، ہائی کوالیفائیڈ جینئس آؤٹ سپوکن، ویل مینرڈ، بٹو محل کی ہر عورت اس امریکی شاہکار سے متاثر اور مرعوب تھی، سو حمت کی کیا جرأت تھی کہ وہ اس بت مغرب سے مرعوب نہ ہوتی، جس نے دیامر آکر بٹو خاندان کی کئی قدیم اور عمر رسیدہ روایات کو پیروں تلے کچل دیا تھا اور سردار بٹو اف تک کرنے کی جرأت نہیں کر سکے تھے۔

حمت کچھ دیر تک بے خیالی میں اسے دیکھتی رہی تھی یہاں تک کہ اس نے خود ہی حمت کو مخاطب کرلیا تھا۔

''میرے ساتھ چلو گی حمت۔'' اس نے نخوت سے پوچھا تھا شاید وہ اسی کام کے لئے حمت کے کمرے میں آئی تھی، حمت کچھ حیران ہوئی تھی۔

''کہاں جانا ہے؟''

''رائیڈنگ کریں گے، اصطبل چلیں گے، بابا میرے لئے آریائی نسل کا گھوڑا لائے ہیں۔'' وہ مسکرا کر فخر سے بتا رہی تھی۔ لہجے میں باپ کی محبت کا مان بول رہا تھا، حمت مسکرا دی تھی، آریائی نسل کے انسان تو سنے تھے، اب شاید گھوڑے بھی ملنے لگے تھے، حمت نے مسکرا کر اسے دیکھا اور نرمی سے بولی۔

''نیل بر! مجھے تو اعتراض نہیں، تم صندریہ لالا سے پوچھ لینا۔'' حمت نے جھجک کر کہا تھا، کیونکہ اسے صندریہ کے غصے سے بڑا خوف آتا تھا، گو کہ نیل بر کے ساتھ آؤٹنگ کے لئے نکلنا بڑا دلفریب تجربہ تھا پھر بھی اسے صندریہ اور شاہوار لالا سے بڑا ڈر لگا کرتا تھا۔

''صندریہ میرا باپ ہے جس کی اجازت لوں؟ اپنے باپ سے میں پوچھ چکی ہوں۔'' اس نے اپنی حسین بے باک، سحر طراز آنکھیں حمت کے چہرے پہ گاڑ دی تھیں، حمت کا دل جیسے ڈوب گیا تھا، اس نے اپنی زندگی میں ایسی حسین آنکھیں نہیں دیکھی تھی، کیسی پاگل آنکھیں تھیں، کیسی قاتل آنکھیں تھیں جو صندریہ بٹو اور شاہوار بٹو کی انانیت اور ان جیسے آکسفورڈ ڈین کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔

اسے نیل بر کی آنکھوں کے شان شایان ایک نظم اچانک یاد آ گئی تھی، جو شاید کسی نے نیل بر کی آنکھوں پہ ہی لکھی تھی۔

یہ مست مست بے مثال آنکھیں
نشے سے ہر دم نڈھال آنکھیں
اٹھیں تو ہوش و حواس
گریں تو کردیں کمال آنکھیں
کوئی ہے ہے ان کے کرم کا طالب
کسی کا ذوق وصال آنکھیں
نہ یوں جلائیں نہ یوں ستائیں
کریں تو کچھ یہ خیال آنکھیں
ہے جینے کا اک بہانہ یارو
یہ روح پرور جمال آنکھیں
دراز پلکیں، وصال آنکھیں
مصوری کا کمال آنکھیں
شراب رب نے حرام کردی

مگر کیوں دکھی جلال آنکھیں
ہزاروں ان سے قتل ہوں گے
خدا کے بندے سنبھال آنکھیں

اپنی آنکھوں کے فسوں کو نیل بر کی اپنی آواز نے توڑ ڈالا تھا۔

''حمت ڈن ہو انا، کل ہم چلیں گے، بیال کیمپ تک، آگے موڈ ہوا تو چلاس کے بازار سے شاپنگ کر کے آئیں گے۔'' نیل بر چٹکی بجا کر اسے حواسوں میں لے آئی تھی، حمت کچھ گھبرا گئی تھی، اسے نیل بر کی دماغی حالت پر شک سا ہوا۔

''گھوڑے پہ چلاس کے بازاروں میں پھرنا ہے؟'' حمت کی گھبراہٹ کا کوئی انت نہیں تھا، کیونکہ نیل بر جیسی سر پھری مخلوق سے ہر قسم کے ردعمل کی توقع کی جا سکتی تھی۔

''اونو پوری ڈفر ہو تم، ہم جیپ پہ جائیں گے۔'' نیل بر نے خفگی سے حمت کو گھورا تھا، حمت تھوڑی شرمندہ ہو گئی تھی، نیل بر کے پاس اتنا وقت نہیں تھا جو وہ حمت کو شرمندگی کے گرداب سے نکالتی، تاہم کچھ یاد آنے پر وہ لمحہ بھر کے لئے مڑی ضرور تھی۔

''آج کل تم قبرستان کی طرف بہت جا رہی ہو؟'' اس کے انداز میں تجسس نہیں تھا، تاہم معنی خیزیت ضرور تھی، یہ اتنی عام سی بات بھلا نیل بر تک کس نے پہنچا دی تھی، حمت حیران ہی رہ گئی۔

''نہیں تو بس دو مرتبہ گئی ہوں۔'' حمت نے سر جھکا کر کہا تھا، جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

''دو نہیں تین مرتبہ۔'' نیل بر نے تصحیح کی تھی، حمت کا دل دھک سے رہ گیا تھا، وہ حمت سے اتنی انجان نہیں تھی، اسے شرمندہ دیکھ کر نیل بر نے شانے جھٹک کر کہا۔

''اٹس او کے حمت۔'' نیل بر نے بالوں میں ہاتھ پھیرے۔

''میں نے ایسے ہی پوچھ لیا، بی جاناں کو بڑا تجسس ہو رہا تھا۔'' وہ معنی خیزی سے مسکرائی تھی، حمت اب کہ بری طرح سے چونکی، بی جاناں کے مخبر بڑے ہوشیار تھے، حمت کو ماننا ہی پڑا تھا، پھر بھی جاناں کو ہر وقت حمت کی جاسوسی کا گریز تھا، تاکہ کسی بھی وقت اس کی کوئی بھی کمزوری ان کے ہاتھ لگ سکتی، وہ اندر ہی اندر کٹنے لگی تھی، اب بی جاناں کی طویل تفتیش کا سامنا بھی کرنا تھا۔

نیل بر کے جاتے ہی حمت بھی نیچے اتر کر کچن کی طرف آ گئی تھی، یہاں یہ ناشتے کی باقیات سمیٹی جا رہی تھیں، اماں بخار نے حمت کو دیکھ کر پیالیوں میں حلوہ، چنے اور تلی ہوئی روٹی نکالنا شروع کر دی تھی۔

اماں بخاران کی خاندانی باورچن تھی، اپنی نیک فطرت اور ہر وقت ہمدردی کے بخار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اماں بخار کے نام سے جانی جاتی تھیں، کوئی بھلا سا نام اماں بخار کا ضرور تھا جو اکثریت جاننے سے قاصر تھی، حمت کی پرورش اماں بخار نے کی تھی، سو حمت ان سے گہری عقیدت رکھتی تھی، اماں بخار نے اسے تذبذب میں کھڑا دیکھ کر حیرانگی سے پوچھا۔

''بیٹی کچھ چاہیے تو نہیں؟'' ان کے انداز میں ہمیشہ والی حلاوت موجود تھی، حمت نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے کیا؟'' اب کہ اماں بخار نے اسے غور سے دیکھا تھا، اس کی سرخ آنکھیں انہیں متفکر کر رہی تھیں۔

''میں ٹھیک ہوں اماں بخار۔'' وہ دھیمی آواز میں انگلیاں چٹخا کر بولی تھی، اماں کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھیں، حمت نے نگاہ چرالی، اماں بخار کی نگاہوں سے سے الجھن ہونے لگی تھی۔

''لگتا تو نہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا، پھر حمت کا ہاتھ دبا کر نرمی سے بولی۔

''اپنی ماں کی قبر پہ بہت جانے لگی ہو؟'' گو کہ انداز میں اب بھی سادگی تھی پھر بھی حمت کو لگا تھا ان کا سوال خاصا مجسس ہے، تو گویا اس کی روٹین بدلنے کا گھر کے ہر فرد کو اندازہ ہو گیا تھا، حمت دھک سے رہ گئی تھی۔

''حمت بیٹی، کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ۔'' اماں بخار نے محبت سے حمت کا ہاتھ دبایا تھا، تو گویا اس کے دل میں ہونے والی تبدیلی بھی بہت سے لوگوں کو چونکا گئی تھی، کیا اس کا چہرہ کھلی کتاب تھا؟ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی، اسے اماں بخار سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

''کچھ بھی نہیں۔'' حمت گڑبڑا کر رہ گئی تھی، جیسے پھر سے چوری پکڑی گئی ہو، کیا دل کا اپنی ڈگر سے ہٹنا کوئی معمولی واقعہ تھا، کیا دل کا کسی اور کے لئے دھڑکنا کوئی عام سا واقعہ تھا۔

''اچھا تو پھر بی جاناں کی بات سن لو۔'' اماں بخار اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی تھی، حمت نے گہرا سانس کھینچ لیا تھا، تو گویا پیشی بھگتنے کا وقت قریب آ چکا تھا، اسے بی جاناں کے دربار میں حاضر ہونا ہی پڑا تھا، حمت بی جاناں کے سب سے چھوٹے بیٹے کی اولاد تھی، صنوبر اور شاہوار سب سے بڑے تایا کے بیٹے تھے، ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا، پھر سردار کبیر بنو تھے، جن کی منظر عام پہ واحد اولاد نیل بر تھی، ان کے بعد حمت کے والد تھے جو اس کی پیدائش سے پہلے شاید انتقال کر گئے تھے، اپنی والدہ کے بارے میں بھی حمت قطعاً انجان تھی۔

بنو محل میں حمت کی حیثیت اماں بخار سے بھی کم درجے پہ تھی، وہ اپنی دادی بی جاناں کی سب سے ناپسندیدہ ترین ہستی تھی، سردار کبیر بنو بھی اسے کسی کھاتے میں شمار نہیں کرتے تھے، مجموعی طور پر اس گھر میں نیل بر کی حیثیت مستحکم تھی، جبکہ حمت کی کوئی اوقات نہیں تھی، وہ بچپن سے لے کر اب تک بی جاناں اور سردار بنو کی لامحدود نفرت کا شکار ہو رہی تھی، اس نفرت کی نہ کوئی حد تھی نہ کوئی شمار تھا، ان دو لوگوں کی نفرت کا سبب کیا تھا؟ وہ آج تک انجان تھی۔

(باقی اگلے ماہ)

سیما بنت عاصم

کہانی اور انسان کا رشتہ بہت پرانا ہے، ازل سے شاید یہ ایک دوسرے سے بندھے ہیں کہانی ہر دور میں کہی جاتی اور سنی جاتی رہی ہے اور آج بھی ہزار اشکال میں ہمارے آس پاس موجود ہے، کچھ کہانیاں بڑے غیر محسوس انداز میں ہمارے اندر پلتی پنپتی ہیں، ہمارے ساتھ ساتھ چلتی اور کبھی کبھی ہمارے اندر ہی پڑی سسکتی مر جاتی ہیں، کچھ کہانیاں بڑی بے نام، بے معنی، الجھی اور بکھری سی ہوتی ہیں، ان کا سرا تھامنے کی کوشش کرو تو خود الجھ کر رہ جاؤ، شاید ایسی کہانیاں ہمیشہ ادھوری ہی رہ جاتی ہیں، جو خود نامکمل ہوتی ہی نہیں انسان کو بھی منتشر کر جاتی ہیں، میرے آس پاس بھی ایسی کئی کہانیوں کا ہجوم لگا تھا، جو ادھوری تھیں یا الجھی ہوئیں، میں انہیں سمیٹنے یکجا کرنے کی کوشش کرتی تو کوئی سرا نہ ہاتھ آتا، نتیجتاً میں خود بکھر کر رہ جاتی، خود الجھ جاتی، کسی ایک کردار کو لے کر سوچتی تو اس سے جڑی ہزار کہانیاں منہ چڑانے لگ جاتیں، کہانیوں کو ترتیب دیتی، آغاز...... انجام...... تشکیل دیتی تو ہارنے لگتی، یہی وہ کہانیاں ہوتی ہیں، جو نامکمل رہ جاتی ہیں، سو میں بھی انہی کے سبب منتشر تھی۔

(میں ایک ادیبہ ہوں، لفظوں سے کھیلنا میرا ہنر ہے، ان لفظوں نے کب مجھے اپنے سحر میں جکڑا، مجھے یاد نہیں، بس یاد ہے تو اتنا کہ قلم کبھی بھی میرے لئے اجنبی نہیں رہا، اسی قلم نے مجھے لفظوں کو یکجا کر کے کہانیاں تشکیل دینا سکھایا، مگر بات گھوم پھر کے وہیں آ جاتی ہے کہ ابھی بکھری ادھوری سسکتی کہانیوں کے سامنے کبھی کبھی قلم بھی ہار جاتا ہے اور قلم کار بھی، ہر ماہ گھر پر اعزازی پرچے باقاعدگی سے آتے ہیں خود کو مقروض سا محسوس کرتی، جیسے چپکے سے کوئی دستک دیتا ہے اور ہم دروازہ بند کیے بیٹھے ہیں، گھر اور گھر داری کے جھمیلے مجھے خود سے لاپروا کیے دیتے ہیں تو پھر خود سے وابستہ شوق تو رہے ایک طرف۔

پہلے ایڈیٹر کی ڈاک آتی تھی، اب فون کھڑکائے جاتے ہیں اور جب مدیرہ خصوصی طور پر مجھ سے فرمائش کرتی تو میں نا صرف نادم نظر آتی بلکہ ہار بھی جاتی، کھٹ سے وعدہ کر لیتی، اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا، "ماہنامہ اور آنسہ" کی مدیرہ سے اب میری وابستگی اتنی گہری ہو چلی تھی کہ وہ نہ فرمائش کرتی نہ درخواست، بس دھڑلے سے حکم صادر فرماتی۔

"ثمرہ! سال کے آغاز میں ناولٹ نمبر آرہا ہے، فٹافٹ اپنی اچھوتی سی کوئی تحریر بھیجو۔"

"ہائیں۔"

میں شپٹا اٹھی، ڈھیروں ڈھیر آس پاس بکھری کہانیاں مجھ پر تالیاں پیٹنے لگیں، میں تو کئی کہانیوں کے تانے بانے جوڑنے میں ہلکان تھی اور کہاں ناولٹ جھٹ کوئی بہانہ، عذر تراشنا چاہا مگر وہاں سنتا کون تھا؟

"مجھے نہیں پتا مجھے دسمبر کی دس تاریخ تک ناولٹ چاہیے میں انتظار کر رہی ہوں۔"

"اور لیجئے جناب! فون کھٹ سے بند، یہ ہوتے ہیں گہرے ربط و بے تکلفانہ میل جول کے نقصانات، اب موصوفہ ادیبہ صاحبہ سر تھامے بیٹھی نظر آ رہی ہیں اور ادھورے بکھرے الجھے بے نام و بے معنی الفاظ و کہانیاں ان کے آس پاس وحشیانہ رقص فرما رہے ہیں، اب کون سی گرہستی اور کاہے کی گھر داری، مجھے اک نئی فکر پڑ گئی، اس محبت بھرے اصرار سے فرار ممکن ہی نہیں اور گھر کے بکھیڑے تھے کہ مجھے نوچنے کھسوٹنے پر تلے رہتے۔"

"اس روز میری عزیز از جان دوست رخ کی کال آئی، تو میں اس سے اپنی الجھن کہے بنا

یہ رہ گئی اور وہ تھی کہ بس کبھی کبھار ہی سنجیدہ نظر آتی تھی۔"

"ہاہ! یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے۔"

"بکواس مت کرو، میری جان پر بنی ہے اور تمہیں مذاق سے فرصت نہیں۔"

"ارے بی بی! کس نے کہا کہ اعصاب پر سوار کرو یا لکھ ڈالو یا معذرت کر لو۔"

"نا، میں وعدہ کر چکی ہوں، وہ منتظر ہے۔"

"ہائے ہائے کوئی ٹور تو دیکھے عظیم مصنفہ کی۔"

"انسان ہو، اب تو میں اپنے اعزازات بھول بھی جاتی ہوں۔"

"اوہو، عزازات، ذرا میں بھی سنوں۔" وہ صاف مجھے چھیڑ رہی تھی، مگر میں جوش میں آ گئی۔

"سب سے پہلے مختلف میگزینز میں لکھنے بلکہ چھپنے کا سولہ سالہ تجربہ۔"

"گویا آپ کا قلم الٹرا میار بن چکا ہے، بھی نادانیاں کیا کرتا ہے۔"

"میں نے جیسے سنا ہی نہیں "پھر بیسٹ رائٹر ایوارڈ" وہ بھی دو دو بار۔"

"جی ہاں، وہ اس زمانے میں نصیب ہوئے جب آپ خود اس میگزین کی ایڈیٹر تھیں۔"

"ارے ہاں، کثیر الا اشاعت میگزینز کی ایڈیٹر ہونے کا سات سالہ تجربہ بھی تو ہے اور جنابہ قسم لے لو جو ایوارڈز کی حد میں رتی بھر بھی بے ایمانی ہوئی ہو۔"

"ہاہ! دنیا بھر میں اگر خوش قسمتی نہ ہوتی تو بے وقوف کیسے زندہ رہتے؟"

"جیسے تم زندہ ہو، ہاہ ہاہ ہاہ۔" وہ برا مان کے بیٹھ گئی پھر چڑانے کو بولی۔

"لیں ختم ہو گئے تمہاری قابلیت کے سرٹیفکیٹس۔"

"یار اک بک بھی تو ہے مارکیٹ میں، اب یہ نہ کہنا کہ یہ کوئی کارنامہ نہیں، لوگ جو پیسے دے کر بھی کتاب لے ہی آتے ہیں، مگر میں تو غریب مصنفہ ہوں، مجھ سے خود ناشر نے میرا قسط وار ناول مانگا تھا اور جناب پے بھی کی تھی ہزاروں میں۔"

"ہاں تو غریب مصنفہ ہو نا، رحم کھا کر دیے ہوں گے ہزاروں۔" وہ منہ پھاڑ کے ہنسی۔

"جہنم میں جاؤ، مجھے تمہاری تعریفی سند نہیں چاہیے، اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ چھوٹی سی تحریر کہاں سے آئے، کون سی کہانی کے سرے ترتیب دے کر تشکیل کیا جائے، بھئی صاف بات ہے، شادی سے پہلے میں بڑی جھٹ پٹ کہانیاں تیار کرنے والی مصنفہ تھی، اب ان بچوں اور گھر نے دماغ میں بھوسا بھر دیا ہے۔"

"دس تاریخ تو یہ سر پر کھڑی ہے، اگر کہانی نہ ملی تو۔" وہ بالآخر سنجیدہ ہو ہی گئی۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا، ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔"

"کیا کہا تم نے؟" وہ بے طرح چونکی۔

"اوہو، کانوں میں تیل پڑا ہے کیا، میں نے کہا ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔"

"بس سمجھو کہانی اسی جملے میں ہے، ضرورت اور ایجاد۔"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔" میں واقعی الجھ گئی تھی۔

"بھئی کبھی کبھی میلوں دور پھیلی کہانی کو سمیٹنا، سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی کہانی ایک جملے میں سمٹ آتی ہے، مگر یہ نکتہ تو کہانی سن کر ہی سمجھ آئے گا نا۔"

"ہم......م......م...... سچ کہتی ہو۔" میں نے سمجھ کر سر ہلایا۔

"چلو پھر میں اس کہانی کے سارے تانے

بانے ترتیب دے لوں پھر ملتے ہیں۔"
"او کے مگر یاد رکھنا، دس تاریخ۔"
"ڈونٹ وری۔" اس نے فون بند کر دیا اور کم از کم اتنا بھروسا تو مجھے اس پر تھا ہی۔

☆☆☆

اگلے ہی روز وہ میرے ساتھ تھی۔
"ترتیب پا گئے، سارے تانے بانے؟"
"حد ہوتی ہے، بد اخلاقی و خود غرضی کی، نہ چائے نہ پانی بس کہانی۔"
"سب ملے گا، مگر کہانی کے بعد۔" مجھے خاک بھی پروا نہ تھی۔
"تب تک میں سوکھ کر مر جاؤں گی، کہانی طویل ہے۔"
"ہاں، مجھے ناولٹ ہی تو چاہیے۔" میری سوئی ہنوز اسی جگہ اٹکی تھی۔
"اور وہ جو تم سوچ بیٹھی تھیں، افسانے کی صنف کو اک نئی طرز میں ڈھال کے پیش کرنا ہے، کوئی نئی فارم ایجاد کرنی ہے۔"
"حق ہاہ، وہ بھی اک دور تھا کہ میں جو سوچتی کر بھی ڈالتی تھی۔"
"ہم......م......مگر انسان جو سوچتا ہے سراسر ویسا نہیں ہوتا، بلکہ ہوتا وہ ہے جو کبھی گمان کو چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔"
"یہ بھی زندگی کا اک رخ ہے، شاید قسمت یہیں آ کر فتح یاب ہوتی ہے، تم نے کہا تھا کہ کہانی ہیں ایک جملے میں ہے، ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔"
"ہاں ایجاد اور ماں، میرے بھائی کا گھر دو بار اجڑا اور دونوں مرتبہ ان دو چیزوں نے اہم کردار ادا کیا، ایجاد یعنی موبائل اور ماں۔"
"او مائی گاڈ، رئیلی، شاہ زیب، وہ تمہارا اونچا لمبا خوبصورت سا بھائی جس سے تمہاری ایک پل نہ بنتی تھی؟"
"تو کیسے بنتی؟ کرم کرتوت ہی ایسے تھے، کھانا پینا عیش کرنا، گھر کی گاڑی کیسے چلے گی، یہ دردِ سر میرا تھا، باپ کی موت نے اسے مزید بگاڑ دیا تھا اور گھر کی کفالت کا بار میرے نازک کندھوں پر آ پڑا، جو چار حروف نہ پڑھے ہوتے تو کسی نچلے درجے کی نوکری کرتے حسرت کی زندگی گزارتا میں پورا کنبہ۔"
"سچ ہے تم جیسی لڑکیاں بہت عظیم ہوتی ہیں، جو گھر کی کفالت کے لئے اپنی زندگی جھونک دیتی ہیں، میکے کی دہلیز پر ہی ان کے سر میں چاندنی بھر جاتی ہے۔"
"یہ سب اسی شاہ زیب کی نا اہلی کی وجہ سے تو ہے۔"
"ہم......م......م...... چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو انتشار پھیلتا ہے، نظام بگڑ جاتا ہے۔"
"مگر اصل انتشار تب پھیلا جب امی ہر جانب سے چشم پوشی برت کر اسی نا معقول شاہ زیب کے سر پر سہرا سجانے پر تل گئیں۔"
"اور وہیں سے کہانی کی شروعات ہے۔" میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔
"کہانی کی شروعات تو جانے کب سے ہو چلی تھی، امی نے مجھ سے مخفی رکھا، بلکہ اصل بگاڑ کا محرک ہی یہ نکتہ تھا کہ امی سب کچھ مجھ سے مخفی رکھ کر بالا ہی بالا طے کرتی رہیں، میں صبح کی آفس گئی، شام لوٹتی، پیٹھ پیچھے کیا کچھ ہوا، میرے فرشتوں کو بھی نہ خبر رہتی۔"
"مگر اس پردہ داری کی وجوہات کیا تھیں؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔
"شاہ زیب کی شادی کے لئے میری مخالفت، وہ اپنے ناکارہ و نکمے پن کے سبب

کفالت کا بار اٹھانے کا اہل ہی کب تھا، مگر اسے لوگ بڑے چالاک نکلے جنہوں نے دل بھر کے ہمارے کنبے کو انگلیوں پر نچایا، امی نے اپنی سادگی اور اسی پردہ داری سے مات کھائی اور......"

"مگر شاہ زیب کا بیاہ رچانے کی تمہاری امی کو سوجھی کیسے؟ جبکہ وہ نکما، نکھٹو۔"

"وہ نکما، نکھٹو ہی نہیں، چور، بے ایمان اور ٹھگ بھی تھا، اسے دو بار بدترین عورتیں نصیب ہونے پر اس بات پر میرا ایمان پختہ ہو گیا کہ برے مردوں کے لئے بری عورتیں، امی اسے بیاہنے پر کیوں مجبور ہو گئیں، یہ اک علیحدہ کہانی ہے، جو رفتہ رفتہ کھلے گی، شاہ زیب کی شادی پر میری مخالفت کی وجہ یہی نہیں تھی کہ میں اس کے برے کچھنوں کے سبب کنبے کا بوجھ ڈھونے پر مجبور تھی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اس معاملہ کو ایمان کے خلاف سمجھتی تھی کہ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کے خود کو سجا بنا کے پیش کیا جائے، نہ ہی میں اس رسک پر بھائی بیٹے بیاہنے کے حق میں ہوں کہ شادی کر کے سدھر جائے گا۔"

"ہاں، یہ تو واقعی رسک ہوتا ہے، اکثر دیکھنے میں بھی آتا ہے کہ نااہل لڑکوں کی شادیاں اسی گمان پر کر دی جاتی ہیں اور بے چاری آنے والی کی زندگی خراب ہو جاتی ہے، کرنے والے مر کھپ جاتے ہیں یا بیاہ کر اپنے گھر چلے جاتے ہیں اور تو اور میکے والے بھی مقدر کا لکھا کہہ کر ہاتھ جھاڑ لیتے ہیں اور برباد ہوتی ہے بے چاری عورت۔"

"اور اس سارے بگاڑ کا محرک یہی نکتہ ہوتا ہے کہ اپنی اولاد کی نااہلی سے چشم پوشی برت کر گمان کے تحت بڑا فیصلہ کرنا، میں کہتی ہوں کہ ایسے کسی بھی فیصلے سے پہلے صرف ایک منٹ کے لئے دوسرے کی جگہ خود کو رکھ کر سوچا جائے کہ ہماری اپنی بیٹی کے لئے شاہ زیب جیسا رشتہ آتا تو کیا ہمارے لئے قابل قبول ہوتا اور یہ کہ یہ سارے آزار اگر ہماری بیٹی کے نصیب میں لکھ دے جاتے تو ہم پر کیا گزرتی؟"

"ہم......م......م...... کہتی تو تم ٹھیک ہو، خیر آگے چلو اور یہ بتاؤ کہ تم نے تو پھر بڑی اچھل کود مچائی ہو گی؟"

"ایسی ویسی، مگر میری ضرورت سے زیادہ اچھل کود پر مجھے کیا سننا پڑ سکتا تھا، تم خود سمجھ سکتی ہو، میں شاہ زیب سے بڑی تھی، کنبہ ڈھو رہی تھی، چھا رشتہ نایاب تھا، تب سب یہی سمجھتے کہ میری مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ میں شاہ زیب کی شادی نہیں ہونے دینا چاہتی، اس لئے بات بالا ہی بالا نکاح تک پہنچی تو میں بھی لہو کے گھونٹ بھر کر صبر کر بیٹھی۔"

"اچھا!" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"لگتا ہے لڑکی خوبصورت تھی جس پر تمہاری امی گئیں؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم مجھے جانتی ہو، میں اگر یہ رضا و رغبت بھی اس کے لئے دلہن ڈھونڈنے نکلتی تو شکل و صورت سے بڑھ کر سیرت و کردار کو پرکھتی اور پھر ٹھونک بجا کر ہی ہامی بھرتی۔"

"سچ کہتی ہو۔" میں نے سرد آہ بھری۔

"مگر آج کل اتنی گہرائی میں جا کر کون سوچتا ہے، لوگوں نے اپنا معیار بلند کر لیا ہے، لوگ معیار کے نام پر ایک کے بعد ایک لڑکی رد کرتے ہیں، خوبصورتی، اسٹیٹس، خاندان، یہ وہ سب ہی کچھ درکار ہوتا ہے، شاید اسی لئے ہر گھر میں بیٹیوں والے روتے نظر آتے ہیں، مگر دلآزاری کا یہ سفاک فعل بعد ازاں ایسی ہی ساس بہوؤں کے دکھ اٹھاتی ہیں، خیر یہ ایک الگ کہانی

ہے تم آگے چلو، تم بتا رہی تھیں کے بات آنا فانا نکاح تک جا پہنچی۔"
"جی ہاں، ادھر سب ادھار جو کھائے بیٹھے تھے، ہوتی ہیں نا کچھ بیٹیاں ایسی، جو لاڈلی بھی ہوتی ہیں اور بھاری بھی؟"
"بھاری...... مطلب...... موٹی تازی؟"
"ارے نہیں بھئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو طوطے کی طرح پھیر کر بات کرتی اور طوطے ہی کی طرح زبان دبا کے بات کرتی، میرا مطلب تھا، بھاری، یعنی جھیلنے میں مشکل، یا جسے بیاہنا بھی مشکل ہو اور بیاہنا ضروری بھی ہو۔"
"تو ایسی لڑکی تمہاری امی کو پسند کیسے آ گئی؟"
"ارے میں نے کب کہا کہ امی کو پسند آ گئی؟ کہا تو ہے کہ گلے پڑ گئی امی تو کسی کے ساتھ کہیں گئی تھیں، تعارفی سوالات میں محترمہ کے والد محترم نے جانچ لیا کہ خیر سے جوان سپوت کی ماں ہیں، جھٹ بیٹی کو سامنے لا بٹھایا اور لگے تعریفیں بگھارنے، اتفاق سے امی کے پرس میں شاہ زیب کی تصویر پڑی تھی وہ دکھا دی تو بچھ گئے اور خود ہی منہ پھاڑ کر کہہ دیا کہ اگلے دن وہ شاہ زیب سے ملنے آ رہے ہیں، زبردستی بیٹی کی تصویر تھما دی کہ شاہ زیب کو دکھا دیں۔"
"اور شاہ زیب نے تصویر پسند بھی کر لی؟ میرا مطلب ہے لڑکے تو بڑا آئیڈیل رکھتے ہیں۔"
"جی نہیں، شاہ زیب جیسے لڑکوں کو پتا ہوتا ہے کہ ان کے کارنامے ایسے ہیں کہ انہیں رشتہ ملنا مشکل ہے، کبھی جو بھولے بھٹکے شاہ زیب کا رشتہ لگ ہی جاتا تھا اور محلہ میں ہوتی انکوائری، محلے والے ان کے کارنامے وہ مرچ مصالحہ لگا کے بتاتے کہ بیٹی والا بھاگتا نظر آتا اور ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا تھا۔"
"ہم...... ہم...... ظاہر ہے رائی ہو تو پربت بنتا ہے، دنیا کی آنکھوں پر پٹی کون باندھ سکتا ہے؟ سچ ہے، دنیا دوسروں کے معاملہ میں بڑی سفاک ہوتی ہے، خیر اگلے دن کیسا رہا؟"
"بھئی کہ لڑکے کے محترم والد گرامی پورے آٹھ افراد کے کنبے سمیت رات بارہ بجے ہمارے گھر پر براجمان تھے، بلکہ نہیں آتے ہی اعلان بھی کر دیا کہ وہ کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔"
"واٹ نان سینس، یہ کیا طریقہ ہے بھلا؟"
"جی ہاں، یہی طور طریقے خاندان کے بے ڈھنگے ہونے کا پتا دیتے ہیں، جو کہ وہ تھے بھی، امی نے تو ابھی نہ سوچا کہ جب گھرانا اتنا بے ڈھنگا ہے تو لڑکی میں بھی کچھ نہ کچھ تو جراثیم ہوں گے، شاہ زیب انہیں پسند آیا نہ آیا، بس وہ ٹھان چکے تھے کہ اپنی بیٹی ہمیں ہی تھوپنی ہے، سو مصر رہے کہ بس اگلے جمعہ شاہ زیب کو لا کر نکاح کر لیں۔"
"ہائیں، اور آنٹی بھی مان گئیں، شاہ زیب نے بھی کوئی احتجاج نہ کیا؟"
"میں تمہیں بتا تو چکی ہوں کہ شاہ زیب اپنی قدر و قیمت سے آگاہ تھا، بیٹھے بٹھائے لڑکی مل رہی تھی، اسے اور کیا درکار تھا، شاہ زیب کو کونے میں لے جا کر موصوف نے اس کے کانوں میں کیا صور پھونکا کہ جھٹ پٹ نہ صرف خود مان گیا بلکہ امی کو بھی جانے کیا کچھ کہہ کے منا لیا، امی میری وجہ سے زود رنج رہتی ہیں، سمجھتی ہیں کہ بیٹی والے مجبور ہوتے ہیں، پھر ادھر سے اصرار اتنا تھا کہ وہ ہار گئیں، سوچا کہ دوسروں کی بیٹیوں کے معاملہ میں ہم نرمی رکھیں گے تو رب کریم اس کا اجر ضرور دے گا، گھر میں اس دوران بڑی لے دے ہوئی، مگر نکاح کا فیصلہ ہو چکا تھا،

سو وہ ہفتہ بھر اس میں ہو ہی گیا، رخصتی چھ ماہ بعد رکھی گئی، مگر چھ ماہ کس نے دیکھے تھے؟''

''کیا مطلب؟ ذرا کھل کر بتاؤ۔''

''مطلب یہ کہ رخصتی تو محترمہ کے گھر والوں کے پلان میں شامل ہی نہ تھی، نکاح ہوتے ہی انہوں نے شاہ زیب کے گھر والوں کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کے پھینکا اور شاہ زیب کو اپنے گھر کا رستہ دکھا دیا تاکہ لڑکا لڑکی کا تعارف ہو اور رخصتی جلد ہو جائے۔''

''مگر ایسا کس لئے؟''

''تاکہ جہیز بچ جائیں، چار لوگ بلا کے خرچا نہ کرنا پڑے، لڑکا کوئی غلطی کر بیٹھے تو الزام اس کے سر رکھ کر بیٹی تھوپ دی جائے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔''

''ہائے ہائے، بیچاری آنٹی کے کتنے ارمان تھے اکلوتے بیٹے کی شادی کے لئے۔''

''جی ہاں، تمام ارمان آرزوؤں کا جلوس نکال کے رکھ دیا سارے گھرانے نے۔''

''بچ...... بچ...... برا ہوا...... یہ ایسا زمانہ کہاں کہ آنکھیں بند کر کے کہیں بھی بیٹا بیٹی کا نکاح پڑھوا دیا جائے۔'' میں نے تاسف سے سر ہلایا پھر چونک کر کہا۔

''ارے ہاں، یاد آیا، وہ کون سی بات تھی جو شاہ زیب کے سسر نے اس کے کانوں میں کہی تو وہ فوراً نکاح پر آمادہ ہو گیا؟''

''تین لاکھ کا جھانسہ۔''

''کیا مطلب......؟''

''موصوف چار شادی شدہ بیٹوں کے باپ تھے، جنہوں نے ان کی بدفطرتی کے سبب اپنی دنیا الگ بسالی تھی، نتیجتاً محترم نے اپنے سر چھپانے کا ٹھکانہ بیچ باچ وہ رقم کسی کاروبار میں لگا دی، جس کے منافع سے گھر چلتا تھا، بقیہ اک طلاق یافتہ بیٹی اور خود محترمہ خوشنما یعنی ہماری ہونے والی بھاوج نوکری پیشہ تھیں، وہ جان بوجھ کر کرائے کے گھر میں پڑے تھے تاکہ اپنا گھر ہو تو بیٹے حق دار بن کر کھڑے نہ ہو جائیں، اپنا مکان بیچ کر جو پیسہ کاروبار میں لگا رکھا تھا اس میں سے تین لاکھ کا جھانسہ شاہ زیب کو دے دیا تاکہ بیٹی ٹھکانے لگے۔''

''اوہو، یہ تو پھر بہت دھوکے باز لوگ تھے، ان سے تو پھر اچھی امید بھی فضول تھی۔''

''کم از کم مجھے تو کوئی اچھی امید نہ تھی، مگر بتایا نا کہ انہوں نے نکاح کے بعد براہ راست شاہ زیب کو گھر کا راستہ دکھا دیا، وہ موصوف بھی رات بھر منکوحہ سے گپیں لگاتے، یعنی موبائل پر بات چیت، دن بھر سوتے اور شام میں سسرال جا بیٹھتے جہاں منکوحہ صاحبہ کیل کانٹوں سے لیس ہوتیں، گھر کے بقیہ افراد مختلف بہانوں سے ادھر ادھر ہو جاتے، موصوف جال ڈالتیں تاکہ شاہ زیب صاحب ایسے پھنسے کہ غلطی کا سہرا ان ہی کے سر بندھ جائے اور سسر محترم بیٹی کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر چلتا کریں، ہینگ لگے نہ پھٹکری۔''

''اور شاہ زیب صاحب ایسے معصوم تو نظر نہ آتے کہ اس چال کو نہ سمجھ سکیں، پھر آنٹی نے بھی کوئی احتجاج نہ کیا؟''

''امی نے بڑی اچھل کود کی، شور مچایا مگر ان کی سنتا کون تھا، نہ کسی سخت سست کا اس گھرانے پر کوئی اثر تھا، صاف کہہ دیا کہ ان دونوں کا بندھن مضبوط ہے، ان کو کون روک سکتا ہے، تب امی نے صاف کہہ دیا کہ وہ خوشنما کو بٹھا کر رکھیں وہ اسے بیاہ کر گھر لے جانے والی نہیں ہیں، جب ان سب کو دنیا داری رسم و رواج کا کوئی لحاظ پاس نہیں ہے۔''

''آنٹی نے ٹھیک ہی کہا، یہ عزت دار و

شریف لوگوں کا شیوہ نہیں ہے، ایسے معاملات بہت خطرناک اور معیوب سمجھے جاتے ہیں۔''

''مگر وہاں پروا کسے تھی؟ شاہ زیب معتبر تھا، پھسل سکتا تھا، سو امی نے سختی سے وہاں جانے پر پابندی لگادی تب اک اور چال کھیلی گئی، اک روز سر شام سخت بارش و خراب موسم میں کوئی خوش نما کو ہمارے دروازے پہ چھوڑ گیا، بہانہ یہ کیا کہ وہ قریب ہی کہیں آئی تھیں، مگر شدید بارش کے سبب اب گھر لوٹنے سے قاصر ہے، شام رات میں ڈھل گئی بارش تھمی نہ وہ لوٹنے پر آمادہ ہوئیں، شاہ زیب نے امی کے کہنے پر یہاں وہاں سب کو فون کھڑکائے کہ کم از کم اطلاع دے دیں کہ محترمہ غصے سے ہمارے گھر براجمان ہیں، یا وہیر سے کسی کو بلا لیں، مگر نا، یہ کام تو پلاننگ کے تحت طے پایا تھا کہ رات گزر گئی تو موصوفہ کا لوٹنا بے معنی رہے گا، وہ اس بہانے سہرا ہم سب کے سر باندھ کر ہاتھ جھاڑ لیں گے، لہٰذا سارے موبائل بند اور گھر پہ تالا پڑا رہا اور وہی ہوا، رات گزر گئی اور محترم سسر صاحب نے اب بیٹی صاحبہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، انہوں نے پیسہ بچانے کے لئے اچھی طرح اپنی اصلیت دکھادی تھی اور امی کو خوب اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ دھوکہ باز لوگوں سے رشتہ جوڑ چکی ہیں، مگر اب پچھتائے کیا ہووت۔''

''او مائی گاڈ، دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے؟''

''جی جناب! اسی لئے کہتے ہیں کہ تجربہ انسان کو غلط فیصلے سے بچاتا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ تجربہ حاصل بھی غلطیوں سے ہی ہوتا ہے، بات یہیں تک رہتی تب بھی ٹھیک تھا، عورت گھر بسانے والی ہو تو خود کو سسرال کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے مگر اس آنا فانا شادی کے عقب میں جو اغراض و مقاصد شامل تھے ان کا پردہ شادی کے بعد چاک ہوا۔''

''اوہو...... پھر شاہ زیب کا کیا ردعمل رہا اس بے ڈھنگی رخصتی پر؟''

''اسے بھلا کیوں برا لگتا، بیٹھے بٹھائے بیوی مل گئی تھی، میں نے بتایا نا، اس کے خوشنما سے بے تکلفانہ مراسم تو استوار ہو ہی چکے تھے، صد شکر کہ اس نے اپنی عزت دار گھرانے کی ناموس کا پاس رکھتے ہوئے اپنی حدود کراس نہ کی تھیں، جس کے لئے تمام تر کوششیں تھیں، مگر وہ لوگ بلا کے استاد تھے، اک طرح سے وار نہ چلا تو دوسرا وار کر دیا جو کامیاب ٹھہرا، نکاح کے بعد روک تمام رکھی جاتی ہے تو اسی لئے کہ دونوں فریقین اپنی حدود نہ بھولیں مگر وہاں تو پلان ہی آگ لگانے کا تھا۔''

''اللہ معاف کرے، صد شکر کہ پروردگار نے تمہاری عزت رکھ لی۔''

''بس عزت ناموس کی پروا تو عزت دار کو ہوتی ہے مگر زبردستی لڑکی تھوپنے کے عقب میں اک نکتہ تھا اور وہی نکتہ سارے بگاڑ کا لب لباب تھا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اب خوشنما کے گھر والے ہاتھ جھاڑ کر سکون کی سانس لیں اور تسلی کے ساتھ بیٹھ جاتے مگر ادھر خوشنما اور ادھر کا میکہ، وہ تڑپ اور عشق دیکھنے میں آیا کہ آفرین تھی بھئی۔''

''اک منٹ، تم نے ابھی کسی نکتے کی بات کی جو بگاڑ کا سبب تھا؟''

''ہاں، خوشنما کے سیاست دان والدین بیٹوں سے تو ہاتھ جھاڑ ہی بیٹھے تھے اک طلاق شدہ بیٹی تھی، جس کی کمائی کا آسرا تھا مگر اس سے زیادہ بنتی نہ تھی، مگر وہ یہ تجربہ حاصل کر چکے تھے کہ بیٹوں کی نسبت بیٹیاں زیادہ بہتر سنبھال سکتی ہیں، وہ شادی کر کے اپنا فرض تو ادا کر ہی دیں گے بعد میں اس کے اجڑنے کو مقدر کے کھاتے میں ڈال

کر بحث کریں گے، سو وہ دونوں مل کر اس کے قدم ہی اکھاڑتے رہے، اسے لگ کر بسنے ہی نہ دیا اور بری کمک تو انسان زیادہ تیزی سے پک کرتا ہے، خوشنما بھی آخر انہی کی اولاد تھی۔"

"ہم......م......آگے کہو۔"

"آگے وہی حالات رہے یعنی ضرورت اور ایجاد، موبائل خوشنما کا اٹوٹ انگ تھا، وہ صبح سے لے کر رات تک ہر بات ماں کے کانوں میں ضرور اتارتی تھی، ماں بیٹی کا اک دوسرے کے بغیر گزارہ ہی نہ تھا، کہاں کی سسرال اور کیسا شوہر، سب اس کی جوتی کی نوک پر تھے، کہ پیچھے سے یہی کمک ملتی تھی، محترمہ رات گئے تک کچن کے سلیب پر چڑھ کر دروازہ بند کر کے والدہ صاحبہ سے گفتگو فرماتیں، گفتگو کیا سسرال، شوہر، ساس نندوں کی برائیاں اور نت نئے حربے سیکھتیں۔"

"ہائیں یعنی شاہ زیب صاحب میں بھی کیڑے پڑ گئے تھے؟"

"جی ہاں اور یہ شاہ زیب کا اپنا کمال تھا کہ انہوں نے رج کے سبز باغ دکھائے تھے، بڑی بڑی باتیں کی تھیں جن کے برخلاف سسرال میں سفید پوشی نظر آئی تو شاہ زیب اور خوشنما کے رشتے میں دراڑ پڑی اور شاہ زیب کے جھوٹ اور ڈینگ باز فطرت سامنے آئی تو کون سی بیوی رہتی جو سر آنکھوں پر بٹھاتی؟"

"ہم......م......وہ فطرتاً نکما نکھٹو تھا، ڈینگیں نہ مارتا تو کون اس کے جھانسے میں آتا۔"

"میاں بیوی کا رشتہ اعتماد کا ہوتا ہے، اعتماد تب ہی بحال رہتا ہے جب کردار پازیٹو ہو، لیکن شاہ زیب کے معاملہ میں نہلے پہ دہلا والی بات رہی، شاہ زیب اگر نکھٹو تھا تو خوشنما اس سے بڑھ کر تائید ہوئی۔"

"حق ہاہ اور یہی بات بگاڑ اور ٹکراؤ کا سبب بنتی ہے۔"

"بالکل، شاہ زیب کی حیثیت صفر ہو گئی، پھر تو اس کو روکنا تھا نا ہی ناممکن ہو گیا، یوں لگا جیسے اسے گھر بسانے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی، مزید میکے کی کمک اس کے قدم اکھاڑنے کا سبب بنتی رہی۔"

"ہم......م......م......یعنی یک نہ شد، دو شد۔"

"بالکل یہی معاملہ رہا، امی اسے گھر داری میں کھپانا چاہتی تھیں، مگر گھر اور گھر والوں سے دلچسپی کسے تھی، دماغ پر تو میکہ اور اس کے مسائل سوار رہتے، رات بھر جاگ کر وہ اماں سے پیچ پر گپیں لگاتی تو صبح کیا اس کے فرشتے جاگتے؟ وہ رج کے سونے کے بعد دن چڑھے تک جاگتی اور سج بن کے بیٹھتی تو اماں نازل ہو جاتیں، جانے وہ کون سے راز و نیاز تھے جو رات بھر کی گفتگو میں بھی باقی رہ جاتے تھے، گھنٹے بھر کمرہ بند کر کے کھسر پھسر چلتی اور پھر محترمہ خوشنما کا ڈولا میکے سدھارنے کو تیار اور ذرا سی ردوکد پر ہنگامہ، کبھی جو ماں محترمہ کا نزول نہ ہو پاتا تو وہ ضد باندھ لیتی کہ اسے ہر حال میں میکے جانا ہے، دو چار دن کی ناغہ پر بھی میکے میں پٹاخے پھوٹنے لگتے، فسادات شروع ہو جاتے، اک ایمرجنسی لگ جاتی اور ادھر اس کا اصرار کہ اسے ہر حال میں جانا ہے۔"

"تو شاہ زیب یا آنٹی کو چاہیے تھا کہ سختی سے کام لیتے، یہ تو سراسر غلط طریقہ ہے؟"

"یہ بھی کر کے دیکھ لیا، نتیجتاً محترمہ خوشنما پر دورے کی کیفیت طاری ہو گئی، ہاتھ پاؤں مڑ جاتے، منہ میں جھاگ نکلنے لگتے، کئی بار ایمرجنسی میں لے کے دوڑنا پڑا دوسری صورت میں وہ دھمکی دیتی کہ وہ گلے میں پھندا ڈال لے گی یا نسیں

کاٹ لے گی۔"

"اف میرے خدایا، میکے کی ایسی تڑپ نہ دیکھی نہ سنی۔"

"خوشنما کے بھائی، شاہ زیب کو ملتے تو کہتے کہ اگر گھر بسانا ہے تو خوشنما اور اس کی اماں کا رابطہ ختم کرو ورنہ وہ اسے بسنے نہیں دیں گی کہ ان کے زیر نظر اپنے مفادات ہیں اور یہ نظر بھی آ رہا تھا ورنہ کوئی ماں ایسی عاقبت نا اندیش نہیں ہوتی کہ اولاد کی بے جا حمایت کر کے اس کا گھر اجاڑ دے۔"

"ایسے میں شاہ زیب کا کیا کردار رہا؟"

"میں تو کہتی ہوں، شاہ زیب نے ہی خوشنما کو سر چڑھایا تھا اور اس کے آگے پیچھے پھر کر، ہر بات میں اس کی جی حضوری و حمایت کر کے اس نے نا صرف اپنے گھر والوں کو متنفر کر دیا تھا بلکہ خوشنما کو بھی اپنی من مرضی کا عادی بنا دیا تھا، سو وہ کیوں نہ رقص فرماتیں؟ جب شاہ زیب کو اس کے اطوار کھٹکنے لگے تو خوشنما صاحبہ ہاتھوں سے نکل چکی تھیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے اس بگاڑ کے عقب میں بھی کچھ حقائق تھے؟"

"بالکل یہی بات تھی، میکے سے خوشنما کا دل بھرتا تو شاہ زیب کے پاس فون آتا کہ اسے آ کے لے جائے، شاہ زیب میکے پہنچتا تو پتا چلتا خوشنما بڑی بہن کے گھر پر ہے، وہاں جاتا تو اس سے آگے کی خبر ملتی، وہاں سے اس سے بھی آگے کی، لڑکی کیا تھی تھرکتا مچلتا پارہ تھی اور یوں سات گھر جھانکنے کے دوران شاہ زیب کو خوشنما کے بہنوئیوں اور بھاوجوں سے خوشنما کے بارے میں وہ وہ باتیں سننے کو ملتیں کہ اللہ دے اور بندہ لے خوشنما کا کردار مشکوک تھا اسی لئے کوئی اس پر ہاتھ نہ دھرتا تھا، شاہ زیب کو تین لاکھ کا جھانسہ دے کر نکاح کے جال میں پھنسانے کے عقب میں یہی معاملہ تھا کہ بیٹی بسانے کا بس نام ہو بعد ازاں بگاڑ پیدا کر کے اسے گھر بٹھا لیا جائے اور انہوں نے یہی کیا، بہانے بہانے سے بیٹی کو میکے بٹھا لینا، آخر کار اس نے نوکری کر کے طلاق کا مطالبہ کر دیا اور سہرا بندھا شاہ زیب کے نکے پن کے سر۔"

"ارے ہاں، ان تین لاکھ کا کیا بنا؟"

"جب طلاق پر نوبت آ گئی تو کیسے تین لاکھ اور کہاں کے تین لاکھ، شاہ زیب اور امی یہ سوچے بیٹھے تھے کہ ان تین لاکھ کے حصول پر وہ کوئی چھوٹا موٹا کام دھندا اسٹارٹ کرے گا، مگر شادی کے بعد بھی وہ اس تین لاکھ کے ذکر کو ٹالتے رہے، بعد ازاں صاف کہہ دیا کہ اس رقم کی انویسٹمنٹ سے تو گھر کی روٹی چلتی ہے، وہ تین لاکھ شاہ زیب کو دے دیں گے تو لالے نہیں پڑ جائیں گے۔"

"ہم...... م...... اس طرح کے لوگوں سے یہی امید رکھی جا سکتی ہے مگر خیر شاہ زیب کو بھی ان کے جھانسے میں نہیں آنا چاہیے تھا، رشتے خلوص نیت کی بنیاد پر جوڑے جاتے ہیں جب بنیاد کھوکھلی ہو تو رشتے میں بھی دراڑ پڑ ہی جاتی ہے۔"

"میں نے تمہیں بتایا نا، شاہ زیب کا کردار کمزور کچا تھا، اس کی شادی اک مشکل عمل تھا اور یہ بات وہ خود بھی جانتا تھا، انہوں نے تین لاکھ کا جھانسہ اپنی کمزوریاں جانچ کر دیا تھا مگر شاہ زیب اس کے بغیر بھی شادی پر آمادہ ہو ہی جاتا، یہ میں جانتی ہوں۔"

"ہم...... م...... م...... پھر اس طلاق والے معاملہ کا کیا رہا؟"

"میں تمہیں ان کی نیتیں تو بتا ہی چکی ہوں، امی ہی نہیں شاہ زیب بھی عاجز آ چکا تھا، شاید

مگر اس کے کان اسی لئے بھرے جاتے تھے کہ وہ خوشنما سے اتنا بدظن ہو جائے کہ اس کے مطالبہ پر یا مطالبہ سے پہلے ہی اسے پرچا پکڑا دے، سو یہی ہوا۔"

"اللہ معاف کرے، اسی لئے کہتے ہیں کہ لڑکی کو بسانے اور اجاڑنے میں اس کے گھر والوں خصوصاً اس کی ماں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔"

"ہم......ہم...... مگر امی شاہ زیب کو لعن طعن کرتیں کہ اس کی نااہلی کی وجہ سے اس کی حیثیت کمزور رہی، اسی نکھے پن کا پوائنٹ پکڑا گیا، لوگوں نے اس طلاق کی یہی وجہ سمجھی، خوشنما کا کردار جو بھی رہا ہو، شاہ زیب کی ذات مزید زیر عتاب آتی رہی۔"

"اس تمام معاملہ میں تمہارا کیا کردار رہا؟"

"تمہیں معلوم ہے، میں صبح آفس جاتی شام میں لوٹتی تو تھکن سے چور ہوتی، امی مجھ سے ہر معاملہ کی پردہ داری یوں رکھتیں کہ میں شاہ زیب کی شادی کی مخالف تھی اور جب وہ مجھ سے پردہ داری رکھتیں تو میں نے بھی خود کو غیر جانبدار ہی رکھا، یہ معاملہ سال سے تقریباً ڈیڑھ سال پر محیط رہا اور یقین جانو کہ اس عرصہ میں اک بار سترہ دن اور دوسری بار تیرہ بارہ دن خوشنما سسرال میں رہی، ورنہ کبھی ماں بیمار کبھی باپ اور کبھی بھائی یا بہن کے گھر کوئی حادثہ یا واقعہ پیش آتا رہا۔"

"تم سچ کہتی ہو یہ سب قدم اکھاڑنے کے حیلے بہانے تھے، خیر آگے چلو، یہ قصہ تو تمام ہوا۔"

"ہونا تو یہ چاہیے تھا اس معاملہ سے سبق سیکھتے ہوئے شاہ زیب خود کو سدھارنے کی کوشش کرتا، امی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اس معاملہ کے بگاڑ کا وہ خود بھی ذمہ دار ہے اور اب وہ اس کی شادی کا نام بھی نہ لیں گی، وہ جو چاہے کرتا پھرے، مگر شاہ زیب مرد تھا، نام نہاد سہی، شادی تو ہوئی نا، امی تو اس کی شادی کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگا چکی تھیں، سو اس نے از خود اپنی شادی کی کوششیں شروع کر دیں۔"

"ہائیں یعنی خود کو سدھارنے کی بجائے اک اور ٹھوکر کی تیاری؟"

"ہاں، مگر یہ معاملات تو اس کی فطرت بن گئے تھے نا گھر کی پروا تو وہ پالتا ہی نہ تھا، کبھی بائی چانس کچھ کام مل گیا تو کر لیا، پیسے مل گئے تو کھا پی کر اڑا دیے، گھر چلانا ماں بہن کی ذمہ داری ہے، پھر ایسے انسان کی معاشرہ میں کیا قدر و قیمت ہوتی، شاہ زیب اپنی اسی کمزوری سے واقف تھا، مگر اسے سدھارنے کی کوشش نہ کی، اس کے دماغ پر اب اگلی شادی کی دھن سوار ہو گئی تھی، وہ اسی کے لئے کوشاں رہا اور اسے اگلی بیوی مل بھی گئی، یہ اور بات کہ اس بار بھی اس نے ہیرا پھیری سے کام لیا۔"

"مگر پہلے یہ بتاؤ کہ اگلی بیوی ملی کیسے؟"

"اس نے کسی فیکٹری کمپنی میں کام کیا، وہیں سارہ نامی اک سیاہ فام لڑکی اس کا شکار بنی، کیونکہ اگر تم سارہ کو دیکھو تو یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اسے بھا گئی تھی، شاہ زیب کا ٹارگٹ تو بس شادی تھی، اسی ٹارگٹ کے حصول کے لئے اس نے جو کمایا وہ سارہ کے گھر پر اڑایا، وہ بظاہر اک حسرت زدہ کنبہ تھا، سارہ گھر کی تنگی کے سبب کمپنی میں کام کرتی تھی، شاہ زیب اس پر جال ڈالا اور اس کے گھر تک جا پہنچا اور چار ہاتھ سے کمائی لگائی، وہ بھی موقع غنیمت جان کر اسے کیش کرتے رہے، سارہ کی ماں اک لوز کیریکٹر عورت تھی، اس نے پہلے شوہر کے مرنے کے بعد اپنے سے کم عمر آدمی سے شادی رچا رکھی تھی، جو اس کنبے کی کوئی خاص پروا نہ کرتا تھا، اکثر گاؤں اپنی زمینوں پر رہتا، شہر آتا تو سارہ کے ساتھ کچھ وقت

گزار کر لوٹ جاتا، اپنے گھر کی گاڑی یہ خود ہی کھینچتی تھیں، سارہ کی بڑی بہن نے ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، اپنی من پسند شادی کر رکھی تھی، جو اسے جوتے کی نوک پر رکھتا، لڑتا پیٹتا اور ماں کے کردار کو سمجھتے ہوئے میکے سے ملنے پر پابندی لگاتا، بھائی جرسی موالی سے تھے، سارہ اپنے کنبے سے مخلص تھی اور اس کے مسائل سمیٹنے کے لئے ہی کام کرتی تھی، شاہ زیب اس خاندان کی مجبوریاں جانچ گیا تھا، مگر یہاں بھی اپنی ڈینگ باز فطرت دکھائی کچھ پیسہ لٹایا اور انہیں یہ باور کروانے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ اک مالدار آدمی ہے۔"

"ہاہ، ہاہ، تب انہوں نے سوال نہ کیا کہ اس مالدار آدمی کو کمپنی میں چند ہزار کی نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ کیڑے تو جب نظر آتے ہیں نا جب آنکھوں سے لالچ کی پٹی اتر جاتی ہے، یوں نہ تھا کہ شاہ زیب نے یہ معاملہ بالا ہی بالا بھگتایا تھا، وہ امی کو سارہ کے گھر لے کر بھی گیا، مگر امی نے اک نظر میں جانچ لیا کہ یہ کنبہ خوشنما کے کنبے سے کہیں زیادہ اونچا فنکار ہے، وہ پہلے ہی چوٹ کھائے بیٹھی تھیں، اس لئے صاف انکار کر دیا۔"

"اور شاہ زیب نے ہزار جھوٹ سچ بتا کر از خود شادی رچالی؟"

"ہاہ یہی معاملہ رہا، اک بار میں آفس سے لوٹی تو امی مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں کہ شاہ زیب نے شادی کر لی ہے، ان کے ارمانوں کا خون ہوا تھا، شاہ زیب کی شادی کی خبر انہیں دوسروں نے دی تھی، جو تصدیق شدہ تھی، شاہ زیب اسے بیاہ کر کسی چھوٹے سے کمرے میں لے گیا تھا۔"

"حق ہاہ، بے چاری آنٹی کی قسمت، اک انڈہ اور وہ بھی گندا۔"

"مجھے غصہ تو بہت آیا، کہ ابھی جا کے اس کا سر توڑ دوں مگر امی دن و رات آٹھ آٹھ کر آنسو روتی جیسے گھلتی جاتی تھیں، ہمہ وقت راستہ تاکتیں کہ وہ بھولے سے ہی لوٹ آئے، انہیں جھلک دکھا دے بالآخر میں نے ہی ان کا دکھ جانچتے ہوئے شاہ زیب سے رابطہ کیا کہ جو ہوا اس پر مٹی ڈالے امی کی خوشی کی خاطر بیوی کو گھر لے آئے، ادھر امی کو بھی سمجھا بجھالیا، نتیجتاً اس کے لئے راستہ کھل گیا اور آخر کار بیوی سمیت لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔"

"اگر تم مجھے اختتامی نکتہ نہ بتاتیں تو میں سمجھتی کہ قصہ تمام ہوا مگر یقیناً یہ اک نئے قصہ کا آغاز تھا؟"

"بالکل صحیح کہا تم نے، میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ نہلے پہ دہلا والا معاملہ رہا، گھر داری کے معاملہ میں سارہ، خوشنما سے بھی چار ہاتھ آگے نکلیں، بلکہ وہ تو اس بات کی سرے سے قائل ہی نہ تھیں کہ عورت کو کوئی کام کرنا چاہیے، ان کے ہاں تو عورت کام ہی نہیں کرتی، خود وہ ابھی تک اتنی بھی چوڑی تھی، کہ اس کی اماں اسے نہلایا کرتی تھیں اور یہ کہ اس کی اماں کے سامنے بھی ساس روٹی رکھتی تھیں، سو میری امی بھی رکھا کرتیں، کہ بہوؤں کے معاملہ میں وہ اپنے مقدر کو رو پیٹ کر صبر کر چکی تھیں اور بس ان خاموش پالیسی پر عمل پیرا تھیں، سو مجھ سے کاہے کی شکایت کرتیں اور اگر کرتیں بھی تو میں کیا کر سکتی تھی، سارہ کے ساتھ وہی معاملہ تھا کہ جسے پیا چاہے وہی سہاگن، شاہ زیب نے اپنا پہلا گھر اجڑنے سے سبق سیکھتے ہوئے اسے مزید ڈھیل اور چھوٹ دے دی تھی، وہ سونے کی رسیا تھی اور ایسی رسیا کہ کبھی دیکھا نہ سنا، صرف کھانے کے وقتوں میں

اسے جھنجھوڑ کر اٹھانا پڑتا، امی اس کے آگے کھانا رکھتیں اور مئی کی جھلسا دینے والی گرمی کی لوڈشیڈنگ کے وقتوں میں بھی وہ اوندھی ہو کر پھر غافل ہو جاتی۔"

"اوہ خدایا، ویری امیزنگ، پھر کیا ہوا؟"

"موبائل پر رابطہ ان موصوفہ کا بھی والدہ ماجدہ سے رہتا، چیٹ پر گھنٹہ گھنٹہ بھر گپیں لگائی جاتیں اور جس روز کال پر بات نہ ہو پاتی، محترمہ صاحبہ کا منہ دیکھنے قابل رہتا، جیسے کسی مجرم کو پھانسی کی سزا سنادی گئی ہو، اس کا دل و دماغ ماں کے پاس پڑا رہتا تھا، جسے اس کا نام نہاد باپ اس کی شادی کے بعد صرف اپنی خدمت گزاری کے لئے گاؤں لے گیا تھا، مانو اس جدائی پر ماں بیٹی کی دنیا لٹ گئی تھی، سارہ کے نکھے پن کی بابت اس کی ماں سے کچھ بھی کہنا بے کار تھا، اس کے سر سے لے کر پیر تک جو پٹ ہونے کو وہ اس کا "ننھا پن" گردانتیں، کیونکہ نانی دادی بن کر بھی وہ خود چوزی تھیں تو بیٹیوں نے تو ابھی انڈہ بھی نہ توڑا تھا۔"

"لاحول ولاقوۃ، تو پھر بیٹی کی شادی کی کیسے من میں سما گئی، اسے پالنے میں ڈال کر جھولا دیتی رہتیں۔"

"یہیں آ کر تو شاہ زیب کا کردار کھلا اس نے نا صرف اپنی بابت ڈینگیں ماری تھیں، بلکہ اس سے جھوٹے سچے وعدے کیے تھے، کہ وہ اس گھر کے سارے مسائل سمیٹ لے گا، بلکہ ان سے یہ بات بھی چھپائی تھی کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے، جو بالآخر انہیں معلوم ہو ہی گئی، ان کی کیفیت چوٹ کھائے سانپ جیسی ہو گئی اور شاہ زیب کی ذات کے سارے پھندے نظر آنے لگے یہاں تک کہ سارہ ننھی چوزی اور شاہ زیب اس کے باپ برابر ثابت ہو گیا اور نکما نکھٹو تو وہ تھا ہی۔"

"ہاہ تو شاہ زیب سے اپنا نکاح پڑھا لینا تھا، بیٹی کیوں سر تھوپ دی؟" میں نے جل کر کہا۔

"شاہ زیب کا تو بس نہ چلتا بیگم صاحبہ کے پیر کے نیچے ہتھیلی رکھ دے، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ مہینہ بھر کی Sick Leave پر مجھے گھر رہنا تو اب کہیں جا کر مجھ پر محترمہ کے اصل جوہر کھلے کہ ان کے لیلی ونہار کیا ہیں؟"

"یعنی آنٹی کی پردہ داری چوٹ کھا کر بھی برقرار تھی؟"

"پردہ داری سمجھ لو یا صبر یا پھر شاید وہ مجھے کبھی ٹینشن سے بچانا چاہتی تھیں مگر گھریلو معاملات بالآخر کھل ہی جاتے ہیں، سو کھل کر رہے، اس ہڈ حرام کام چور کو اور بھلا کیا درکار ہوتا تھا، سونے پہ سہاگہ یہ رہا کہ خوشخبری آ گئی، پھر تو ناز نخرے اور عروج پر پہنچ گئے، بات یہیں تک رہتی تب بھی ٹھیک تھا، مگر ادھر والدہ محترمہ سٹپٹا اٹھی تھیں، ان کی ننھی چوزی معصوم بچی پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹنے والا تھا، وہ ہر پل خبر گیری کرتیں اور ادھر سے جھوٹی سچی روئیداد گھڑ کر کانوں میں اتاری جاتی تھی۔"

"ہم......م......م...... ضرورت زیادہ حمایت اسے ننھا کاکا ہی بنا کے رکھتی ہے۔"

"میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کس قیامت کے دن تھے، دن میں کئی گھونٹ لہو کے پینے پڑتے، میں بھر گھر میں رہتی اور یہ دیکھ کر کڑھتی کہ امی ملازماؤں کی طرح اس کے سامنے کھانا پکا کر رکھتیں، وہ کھا لیتی تو برتن تک اٹھانے کی روادار نہ رہتی، نتیجتاً وہ چڑ اٹھتی، بک بک کرتی مگر وہاں خاطر میں کون لاتا تھا، دن بھر کمرہ بند کیے پڑے سوتے رہنا، کھانے کے نام پر پلیٹوں کی پلیٹیں صاف کرنا اور شاہ زیب کے سدھارنے کے بعد

بیگ اٹھا، یہ جا وہ جا۔"

"سارہ کی ایک بہن تقریباً دو میل کے فاصلے پر رہتی تھی، جہاں کا بہانہ لے کر وہ روز نکل کھڑی ہوتی، امی منہ تاکتی رہ جاتیں، نہ خبر نہ اطلاع۔"

"ایک منٹ ابھی تم نے کہا شاہ زیب کے سدھارنے کے بعد.....تو کیا......؟"

"ہاں شاہ زیب نے ماضی کے واقعہ سے سبق سیکھتے اور کچھ امی کے سمجھانے بجھانے پر کوئی نوکری ڈھونڈ تو لی تھی، مگر اس کی نوکریاں چار دن کی چاندنی ہوا کرتیں، جن کا سارا محنتانہ وہ اپنی جیب میں رکھتا تھا، خیر اتنا بھی غنیمت تھا کہ گھر کی گاڑی تو چل ہی رہی تھی۔"

"تم بتا رہی تھیں کہ وہ روز نکل کھڑی ہوتی تھی، تو کیا آنٹی بھی اسے روکتی ٹوکتی نہیں تھیں؟"

"سسرال یا شوہر کی پرواہ کون کرتا تھا، اصل بات یہ تھی کہ شاہ زیب اپنے گھر اور گھر کے مسائل کی پرواہ نہ کرتا تھا تو بھلا بہو کیسے کرتی؟"

"سچ کہتی ہو، آگے کہو۔"

"اگرچہ امی کو سخت برا لگتا، ہر روز بہن کے گھر جانا، تم یقین کرو کہ وہ تو لوٹتی تو اس کے مٹھی بھری چپلیں بتاتیں کہ وہ کتنا چل کر گئی اور آئی ہے، شاہ زیب سارے پیسے اسے دیتا تھا مگر وہ گانٹھ کی اتنی پوری تھی کہ ایک ٹکا بھی خود پر خرچ کرنے کی روادار نہ تھی۔"

"پھر وہ پیسہ کہاں جاتا تھا؟"

"یہ آگے چل کر پتا چلے گا، کچھ دن گزرے گھر میں چھوٹی چھوٹی چوری کی وارداتیں ہونے لگیں، قیمتی چیزوں کے ساتھ ساتھ معمولی چیزیں بھی، تم یقین کرو گی، چمچ، پلیٹیں، صابن، شیمپو کی بوتلیں، کھونٹی پر لٹکے کپڑے، اب یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ سارہ تھیلا کن چیزوں سے بھر کے روز بہن کے گھر لے کر جاتی تھی اور پیسہ بھی میکے کو جاتا تھا؟"

"اوہ مائی گاڈ!"

"وہ عسرت زدہ گھر سے ذرا بہتر گھر میں آئی تھی اور اس کی سوچ یہ تھی کہ بس اپنا میکہ بھرنا ہے، سو وہ اسی کوشش میں جتی تھی، یقین کرو کہ ہر چیز اتنی صفائی سے غائب ہوتی جیسے مکھن سے کوئی بال نکال لے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ان چوریوں کا بھید کھلنے سے پہلے محترمہ ساس صاحبہ بیٹی کی ڈلیوری کا بہانہ لے کر آن وارد، یہ وہ وقت تھا جب امی کا ایک پاؤں، بہو کے ساتھ ہسپتال میں ہوتا، دوسرا گھر میں، اس کے ٹیسٹ وغیرہ کے بعد اب معمول کے چیک اپ چل رہے تھے، مگر ماں کی شکل دیکھ کر وہ جیسے ایک ٹانگ پر کھڑی ہو گئی تھی، یہ وہ بہو تھی جس نے سو سو کر پلنگ توڑ دیے تھے، کبھی کچن میں جھانکا نہ تھا، اب علی الصبح جاگ کر ماں کے لئے روٹی پکاتی، ہر لمحہ انہیں ساتھ رکھتی، یہاں تک کہ رات میاں بیوی کے درمیان بھی ساس صاحبہ سوتی تھیں، منع کرنے پر ان کا فرمان رہا کہ اب چونکہ وہ آ گئی ہیں اس لئے وہ شاہ زیب کو الگ سونا چاہیے، کل وہ نہیں، شاہ زیب ہوتا ہے ماں بیٹی کے درمیان۔"

"واہ، اسے کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری۔"

"بالکل ماں بیٹی نے مل کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی تھی، باقی گھر اور گھر والوں سے ان کا واسطہ ہی نہ تھا، یہاں تک کہ شاہ زیب کو بھی دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا، یہ وہ وقت تھا جب امی اور شاہ زیب بہو کو ہر طرح کا آرام اور بہترین کھانا پینا دے رہے تھے، مگر سارہ ہر چیز

ماں کے سامنے رکھ دیتی یا کہتی کہ اگر ماں کو نہیں دیا تو اسے بھی نہیں کھانا، کہیں جانا ہے تو اسے بھی لے کے چلنا ہے ورنہ اسے بھی نہیں جانا اور ساس موصوفہ تھیں کہ ہلنے پر تیار نہ تھیں، کسی بھی ردو کد پر ہنگامہ کھڑا کر دیتیں کہ وہ ابھی اور اسی وقت بیٹی کو لے کر جا رہی ہیں، دراصل ان لوگوں کو یہ حوصلہ شاہ زیب کی ضرورت سے زیادہ نرمی اور آگے پیچھے پھرنے نے بخشا تھا اور انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ شاہ زیب کو کوئی لڑکی نہیں مل سکتی، مزید یہ کہ شاہ زیب نے انہیں دھوکہ دے کر ان کی بیٹی سے شادی رچائی تھی، اپنی پہلی شادی کو مخفی رکھا تھا، یہ بات انہیں خار میں مبتلا کر چکی تھی اور وہ ٹھان بیٹھیں تھیں کہ بیٹی کے قدم اکھاڑ کر شاہ زیب سے ہر حال میں انتقام لینا ہے، وہ ہر روز بیٹی کو لے کر نکل جاتیں اور دونوں ماں بیٹیاں جانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر دھوم دھول جوتیوں سمیت لوٹتیں، ردوکد پر امی یا شاہ زیب کو ذلیل کرتیں اور اسی وقت بیٹی کو لے کر جانے پر تل جاتیں، اک بار اسی طرح بات بڑھی اور وہ بچ بچ سارہ کو لے کر گاؤں سدھار گئیں، شاہ زیب وہ کسی طرح کھوج لگاتا گاؤں جا پہنچا مگر وہیں ساس صاحبہ نے کچھ کرائے کے لوگوں کی مدد سے اسے زدوکوب کیا اور اس سے طلاق نامہ پر سائن لے کر اپنے تئیں اپنا انتقام پورا کر لیا۔"

"اف میرے خدایا، اس بات کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟"

"تقریباً دو ڈھائی سال، امی نے لاکھ چاہا کہ شاہ زیب کا گھر دوبارہ بس جائے مگر اس کی دو شرطیں ہیں، اک تو لڑکی کی ماں نہ ہو، دوسرے وہ کسی صورت موبائل رکھنے کی اجازت نہیں دے گا، اس کی ان دو شرطوں کو کوئی مانے نہ مانے مگر خود اس پر دو طلاقوں کا لیبل اسے لوگوں کے لئے ناقابل قبول بنا چکا ہے، دو طلاقوں کے سبب کئی رشتے رد ہو چکے ہیں۔"

"اگر برا نہ مناؤ تو اس ساری کہانی میں اصل قصور وار خود شاہ زیب ہے، رشتے سچائی اور کھرے پن کی بنیاد پر جوڑے جاتے ہیں، اس کا کردار ہی اس کے اجڑنے کا باعث ہے۔"

"تم سچ کہتی ہو، مجھے انکار نہیں ہے۔" وہ گلوگیر آواز میں کہتی اٹھ گئی۔

میں اس چائے کے لئے روکتی ہی رہ گئی، مگر وہ ان سنی کرتی نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

مریم ماہ منیر

میں نے الارم کی آواز پر کسلمندی سے کروٹ بدلی تو اپنے وجود پر اوڑھی چادر میری ہی ٹانگوں سے الجھتی چلی گئی، مندی آنکھوں سے میں نے سائیڈ ٹیبل پر پڑی ٹیبل کلاک پر نظر ڈالی نیند بھری آنکھوں سے کلاک تو نظر نہیں آئی لیکن اندازے کے مطابق ہاتھ مارا تو کلاک ہاتھ لگ گیا، الارم بند کر کے دوبارہ سے کروٹ بدلی، نیند تو الارم کی چیختی آواز نے آنکھوں سے کوسوں دور کر دی تھی لیکن سستی نے جسم کو اپنی جگہ سے ہلنے سے انکار کر دیا تھا، سو کاہل سی پڑا رہا، لیکن ذہن نے خاصی حد تک کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

سنڈے بھی شروع ہو گیا، شروع بھی کیا ہونا ہے، دس تو بج گئے ہیں، مجھے یاد آیا تھا کہ میں نے دس بجے کا الارم رات کو سوتے وقت سیٹ کیا تھا، دس بج گئے تو سمجھو کہ آدھا دن تو گزر گیا۔

میں نے نرم نرم پولیسٹر کے تکیے میں منہ گھسیڑا۔

''آدھی چھٹی تو گزر گئی، باقی آدھی چھٹی۔''

''بہت کام ہیں کرنے والے، کمرے کی بھی صفائی کرنی ہے، بیڈ شیٹ بھی بدلنی ہے، آفس فائلز کے الجھے ہوئے Documents بھی ٹھیک سے کرنے ہیں، کھانا بنا کر فریز بھی کرنا ہے چھوٹے برتنوں میں ڈال کر تاکہ اگلے آنے والے دنوں میں کھانے کی تکلیف نہ ہو اور پھر...... پھر نئی کہانی بھی تو لکھنی ہے۔''

اس نئی کہانی پر آ کر میری سوچ ٹوٹی تھی، سب سے بڑا مسئلہ ایڈیٹر کو نئی کہانی بھیجنے کا پیپر تک کا وعدہ تھا، میں اس معاملے میں وقت کا خاصا پابند واقع ہوا تھا، ایک مقامی جریدے میں ماہنامہ بھی افسانہ کبھی ناولٹ لکھ دیتا ہوں، پچھلے پندرہ سالوں سے لکھ رہا ہوں، کبھی کم کبھی زیادہ لیکن لکھ رہا ہوں، لکھنے کے جراثیم میری رگ رگ میں شامل ہیں سانس لینا چھوڑ سکتا ہوں لیکن لکھنا نہیں چھوڑ سکتا۔

جب جاب نہیں تھی تو تب زیادہ ٹائم لکھنے کے لئے میسر تھا، اب ساتھ جاب ہے تو تب بھی لکھنے کا شوق ختم نہیں ہوا ہاں البتہ اس فکر معاش کے سلسلے نے لکھنا کم کر دیا ہے۔

میں ہمیشہ سے ہی تنہائی پسند رہا ہوں، شاید میں ہی نہیں میری طرح ہر لکھنے والا تنہائی پسند ہوتا ہے، لیکن یہ تو صرف دنیا کی نظر میں ہے، اگر کوئی مجھ سے یا پھر کسی بھی لکھاری سے پوچھے کہ تم تنہائی کیوں پسند کرتے ہو؟ تو جواب ہو۔

''کہاں پر تنہا، جو تمہیں میری تنہائی دکھائی دیتی ہے، اس لمحے کسی آلے سے میرا ذہن پڑھو تو پتہ چلے کتنا بڑا ہجوم ہوتا ہے خیالات کا اور میرے ہاتھ میں تھاما قلم کاغذ پر الفاظ کی بھول بھلیوں میں گم ان تمام خیالات کو الفاظ کا روپ دیتا، ارے تم کیا جانوں اس خیالات کے ہجوم میں وہی تو میرے دوست ہیں جگری دوست، ایک کاغذ اور دوسرا قلم۔''

اس نئی تحریر کی سوچ نے مجھے زیادہ دیر بستر پر ٹکنے نہیں دیا اور میں منہ بسورتا ہوا چادر ہاتھ سے ایک طرف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

میں کچھ دیر بعد ہی کاغذ قلم لئے ساحل سمندر پر جانے کے لئے تیار تھا۔

ہاں ساحل سمندر، میری پسندیدہ جگہ، جہاں پر جاتے ہی میرے ذہن کے لکھنے والے حصے کی مشینری چالو ہو جاتی ہے، جب میرا قلم لکھنے سے انکاری ہو جائے اور ذہن کی سوچوں میں قلت ہونے لگے تو میں ساحل سمندر پر چلا آتا ہوں، یہاں کی کھلی فضا اور کھلا آسمان اور اس کھلے آسمان کو دور تک کھلے پانی کا ساتھ، میرے ذہن کے بند دروازے کھولنے لگتے ہیں اور میرے ہاتھوں

کی انگلیوں کو پھر سے جیسے متحرک ہونے کے لئے ایندھن میسر آ جاتا ہے۔

میں اپنی مخصوص جگہ پر چلا آیا، ساحل سمندر سے چند فرلانگ دور ایک بہت بڑا سا پتھر جس پر میں اکثر و بیشتر اپنا لکھنے کا کام کرتا ہوں، اس پر بیٹھا، اپنا شولڈر بیگ سے کاغذ قلم نکال لیا، لیکن اگلے پندرہ منٹ میں ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ آج یہاں پر بھی ذہن کے دروازے کھلنے سے انکاری تھے اور قلم نے بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا، کچھ دیر میں ہی میں نے کاغذ قلم واپس بیگ میں رکھ لئے اور خاموش نظروں سے دور تک نظر آتے کھلے آسمان اور وسیع سمندر کو دیکھنے لگا۔

عید کے تہوار پر ساحل سمندر پر رونما ہونے والے سانحے کی وجہ سے حکومت کی طرف سے خاصی پابندی تھی اور کچھ لوگوں کے دلوں میں بھی خوف کی لہر بیٹھ گئی تھی تبھی تو مجھے ساحل سمندر پر تفریح کی خاطر آئے لوگوں کی تعداد خاصی کم دکھائی دی، مچھیرے بھی بہت کم دکھائی دے رہے تھے، مچھیروں کی سوچ کے ساتھ ہی مجھے اس کی یاد آ گئی۔

''آج آیا نہیں میرے پاس۔'' بے اختیار ہی سوچ آئی تھی ذہن میں، جب وہ پہلی مرتبہ مجھ سے ملا تو میں اسی جگہ پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''سلام جی۔''

''وعلیکم السلام۔'' آواز کی جانب چہرہ موڑتے ہوئے میں نے اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی، چودہ سال کی عمر کا سفید میلی بنیان اور سرخ سبز دھاریوں والی نیکر پہنے گھنگھریالے بالوں اور گندمی رنگ تیکھے نقوش، پہلی نظر میں، میں اس کا اتنا ہی تجزیہ کر سکا تھا۔

''آپ لکھاری ہیں؟'' اس کی نظریں میرے ہاتھ میں پکڑے کاغذ قلم کی جانب تھے، یہ کہتے ساتھ ہی وہ قدرے میرے قریب ہوا۔

''کیا لکھ رہے ہیں؟'' اس کا انداز ہنوز تھا، اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اگلا سوال داغا۔

''تم پڑھنا جانتے ہو؟'' میں نے جو اسے یوں کاغذ پر لکھے حروف میں گم دیکھا تو بولا۔

''ہا......ہا۔'' جواب میں وہ ہنسا تھا۔

''بس الف ب اور پ تک، اتنا ہی، حروف تہجی آتے ہیں۔'' اس کے انداز میں حد درجہ کی معصومیت تھی جس نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''لیکن لہجے سے تم پڑھے لکھے لگتے ہو۔''

''سر جی دیکھنے اور ہونے میں فرق ہوتا ہے۔''

''ارے واہ۔'' میں نے اس کے جملے کو دلچسپی سے سنا اور محسوس کیا۔

''میں مچھیرا ہوں۔''

''مچھیرا۔'' میں نے نظر بھر کے اسے دیکھا تو واقعی اس کا حلیہ مچھیروں والا تھا، لیکن اس کا لہجہ پنجابی تھا، یہ بات میں اسے کہے بنا نہ رہ سکا۔

''لیکن تم تو پنجاب کے لگتے ہو؟''

''کیوں سر جی، کیا پنجابی لوگ مچھیرے نہیں ہو سکتے؟'' اس کے جواب نے مجھے لاجواب کر دیا، میں فقط مسکرا کر رہ گیا۔

''کسی اخبار میں لکھتے ہیں؟'' گھما پھرا کر اس کی سوئی پھر سے وہیں کاغذ قلم کے نقطے پر آن ٹکی تھی۔

''نہیں ایک رسالے میں۔''

''اور تم پڑھتے ہو؟''

''ابھی بتایا نا سر جی! دیکھائی دینے اور ہونے میں فرق ہوتا ہے۔''

''تم صرف دیکھائی نہیں دیتے باتیں کرنے میں بھی پڑھے لکھے لگتے ہو۔'' مجھے اس

کے لب و لہجے کے ساتھ اس کا انداز بھی خاصا دلچسپ لگا، بلکہ فلسفیانہ اور ایک دم ہی میرے ذہن میں ایک نئی کہانی کا موضوع سجا گیا۔
''کیا نام ہے تمہارا؟''
''اماں نے نام تو ماجد رکھا لیکن سب مجھے منجو بلاتے ہیں۔'' یہ کہتے ساتھ ہی وہ میرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا اور پھر یکدم یاد آنے پر پوچھا۔
''میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں نا؟''
''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔'' میں نے بلا تامل کہا۔
جیسے اس نے میرے دل کی بات کی ہو، ابھی مجھے صرف موضوع ملا تھا کہانی تحریر کرنے کا، پنڈورا بکس تو میری نظروں کے سامنے تھا، اسے کھولنا باقی تھا۔
میرا...... ساحل سمندر اور کاغذ قلم کا ساتھ اتنا ہی پرانا تھا جتنا میں کراچی شہر، کراچی شہر اور میرا ساتھ رزق معاش کے عرصے کا تھا۔
''کتنے عرصے سے یہاں ہو؟''
''تین سال ہو گئے سر جی اس ساحل سمندر اور میرے مچھلیاں پکڑتے جال کے تعلق کو۔'' اس کی بات پر میں مسکرایا بلکہ کچھ حیرت نے بھی میرے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔
''تم تو مجھے مچھیرے کم فلسفی زیادہ لگتے ہو۔''
''ہاں، مجھے پڑھنے کا شوق تھا۔''
''تو پڑھا نہیں؟''
''بس نصیب سر جی، پانچویں میں اماں نے اٹھوا لیا سکول سے، حالات ٹھیک نہیں تھے گھر کے اور ابا کے دوست کے مچھیروں سے خاصی دوستی ہے تو میں یہاں آ گیا، اب تین سال سے یہی ریت میری زمین یہی آسمان میری چھت۔''

بس یہی میری اس کی پہلی ملاقات تھی، اس کے بعد تو جیسے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا، میں جب بھی ساحل سمندر پر جاتا، وہ کچھ دیر بعد ہی میرے پاس چلا آتا، دو ماہ یہ سلسلہ چلتا رہا، تب تک مجھے احساس نہیں تھا کہ وہ میرے لئے کتنا اہم ہو گیا تھا، اس کی باتوں میں جادو تھا جو میرے ذہن کی سوچوں کو نئے نئے رستے دکھلاتا اور میرا قلم چلتا ہی رہتا۔
میرا دل کس حد تک اس کے ساتھ جڑ گیا تھا اس بات کا اندازہ مجھے اس دن ہوا جب وہ میرے پاس نہیں آیا اور میں لاشعوری طور پر اس کا انتظار کرتا رہا۔
بے اختیار ہی اگلے دن میں ساحل سمندر پر پھر چلا آیا، تو چند ہی منٹوں میں وہ میری نظروں کے سامنے تھا۔
''ماجد...... منجو۔'' اسے نظروں کے سامنے پا کر میں نے بے اختیار ہی اسے آگے بڑھ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔
''کیسے ہیں سر جی، کل آئے تھے آپ، مجھے پتہ ہے۔''
''میں آیا تھا، لیکن تم کہاں تھے؟''
''میں بھی یہیں تھا، سامنے جو سمندر کے رتیلے ٹیلے پر لانچ پھنسی تھی اس میں، میں بھی تھا، آج صبح ہی لانچ کو باقی مچھیروں کی مدد سے رتیلے ٹیلے سے ہٹایا ہے۔''
مجھے یاد آیا کہ کل سمندر میں لانچ پھنسی تھی۔
''تمہیں کیسے پتہ میں کل آیا تھا؟''
''میں دور سے دیکھ رہا تھا، آپ کو یہاں بیٹھے۔''
اس کی بات سن کر دل کو خوشگوار سی خوشی ہوئی تھی، خدا کی بنائی خود غرض دلوں کی اس بستی

میں مجھے ماجد کا دل خلوص سے بھرا محسوس ہوتا تھا، اس کے لہجے اور انداز میں جو خلوص سادگی اور چاہت ہوتی تھی وہ میرے دل کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھی، میں اس دن واپس اپنے اپارٹمنٹ میں آیا تو میرے ذہن کے بند دروازے کھل چکے تھے اور ذہن کے بند کمرے میں سوچوں کی فضا نے ایک خوشگوار ماحول طاری کیا ہوا تھا، مجھے یاد ہے اس رات، میں نے قلم ایک نئے اور اچھوتے افسانے کو تحریر کیا تھا۔

☆☆☆

پھر میں ایک دن ساحل سمندر گیا تو وہ میرے پاس چلا آیا، مجھے کچھ چپ چپ سا لگا۔

''کیا بات ہے ماجد، ٹھیک ہو؟''

''جی سر جی، ٹھیک ہوں۔''

''اتنے اداس کیوں ہو؟''

''ایسے ہی سر جی، یہ بتائیں آج کیا لکھا نیا؟''

''ابھی تک تو کچھ نہیں لکھا، لیکن آج لکھنے کو دل نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''آج تم سے باتیں کروں گا، ڈھیر ساری۔''

''ڈھیر ساری۔'' وہ اداسی سے پھیکی ہنسا۔

''کیوں باتیں نہیں ہو سکتیں ڈھیر ساری؟''

''ہو سکتیں ہیں، کیوں نہیں، لیکن کیا باتیں؟''

''کوئی بھی موضوع لے لو، بس تمہارا دل راضی ہونا چاہیے باتیں کرنے پر۔''

''میرا دل، میرا دل تو آج خاموش رہنے کو چاہتا ہے۔'' میں نے اس کی بات پر اسے گہری نظر سے دیکھا تو مجھے سمندر سے بھی زیادہ گہرا لگا، اگلی نظر میں نے سامنے نظر آتے سمندر پر ڈالی۔

''کون ہے گہرا، زیادہ گہرا، یہ سمندر یا پھر ماجد۔'' ایک سوچ تھی جو میرے ذہن میں ابھری۔

''میں اس مرتبہ گھر گیا تو مجھے پتا چلا کہ ایک ماہ پہلے ابا نے کام چھوڑ دیا تھا۔'' میرے کانوں میں ماجد کی آواز سنائی دی، میں نے ہنوز نظر سمندر پر ہی ٹکائے رکھی، اب ماجد بولنا شروع ہوا تھا تو کہیں مجھے اپنی جانب دیکھتا پا کر پھر سے چپ نہ ہو جاتا۔

''میرا ابا نشہ کرتا تھا سفید پاؤڈر کا، وہی سفید پاؤڈر جسے آپ پڑھے لکھے لوگ ہیروئن کے نام سے بلاتے ہو۔'' اتنا کہہ کر چند لمحے کے لئے ماجد چپ ہوا جیسے کچھ مزید کہنے کو حوصلہ کر رہا ہو۔

''ویسے سر جی، فلم کی ہیروئن بھی نشہ ہوتی ہے، اس کا بھی نشہ ہوتا ہے، ہیرو کے دماغ اور دل پر اس کا نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے اور فلم دیکھنے والوں کو بھی اپنے نشے میں لگا دیتی ہے۔'' عجیب سی یاسیت تھی ماجد کے لہجے میں جو میرے دل کو چھید رہی تھی۔

''جب پہلی مرتبہ سنا کہ ابا ہیروئن کا نشہ کرتا ہے تو میں بھی فلم والی ہیروئن سمجھا، ان دنوں میں بھی ایک فلم کی ہیروئین کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔'' اتنا کہہ کر وہ ہلکے سے ہنسا۔

''نشہ کرنے پر اماں ابا سے جھگڑتی تھی، کبھی کبھی زیادہ غصہ میں ہوتی تو گالیاں بھی نکالتی، میں بھی ڈرتا تھا ان دنوں کہیں اماں کو پتہ چل گیا کہ میں بھی ہیروئن کا نشہ کرنے لگا تو، تو اماں مجھ سے بھی لڑے گی اور ایسا نہ ہو مجھے مارے اور کھانا بھی نہ دے، اماں کبھی کبھی ابا کو بھی کھانا نہیں دیتی تھی، ابا کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتا اور پھر اماں کے غصے اترنے کے بعد گھر لوٹ آتا، میں ڈرتا کہ اماں ابا کے ساتھ ایسا کرتی ہے تو میرے

ساتھ بھی ایسا نہ کرے، ابا کے پاس تو پیسے ہوتے ہیں ہوٹل کھانا کھانے کے میں کیا کرونگا، میرے پاس تو پیسے بھی نہیں ہوتے۔" اتنا کہہ کر وہ چند لمحے کو خاموش ہوا تھا۔

میں نے بے اختیار سمندر سے نظر موڑ کر اپنے قریب بیٹھے ماجد پر ڈالی اور کسی انجانے جذبے کے تحت اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، میرے ہاتھ رکھتے ہی اس نے میری جانب دیکھا۔

"مجھے بہت عرصے بعد پتہ چلا فلم والی ہیروئن میں فرق۔" مجھے ماجد کی آنکھوں میں آنسو تیرتے صاف دکھائی دیئے۔

"سر جی، فلم والی ہیروئن کا نشہ اتر جاتا ہے لیکن پاؤڈر والی ہیروئن لے ڈوبتی ہے۔"

"میرا ابا ڈوب رہا تھا پاؤڈر والی ہیروئن میں، میں ابا کو کہتا ابا اس سے پہلے کہ ڈوب کر غرق ہو جا نکل آؤ اس پاؤڈر کے بھنور سے، لیکن وہ سمجھتا نہیں، کہتا بھلا پاؤڈر والی ہیروئن اسے کیسے ڈبوئے گی اور ڈوب کے غرق ہونے والی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنستا، مجھے تب اس پر ترس آتا، لیکن وہ کہتا، کہ جب سے تو سمندر پر گیا ہے مچھیروں کے ساتھ رہنے پر ان کی زبان بولنے لگا ہے، اس کے خیال میں سمندر دیکھ دیکھ کر سمندر کی باتیں کرنے لگا ہوں۔"

"ماجد پریشان نہ ہوا کرو۔" میں اس فقرے کے سوا اس سے اور کچھ بھی نہیں کہہ پایا، اس لمحے سمجھ ہی نہیں آیا کہ ماجد کے دکھے دل کو کس طرح سے حوصلہ دوں۔

"سر جی، ابا ڈوب گیا۔"

اس کی بات سن کر میں لمحے بھر کو سن ہو گیا، یہ کیا کہہ رہا تھا ماجد اور چند لمحوں میں جب حواس واپس آئے تو میں نے ماجد کو اپنے ساتھ لگا لیا، ماجد تو شاید اس سہارے کے انتظار میں تھا، میرا کندھا ملتے ہی وہ رو پڑا، کتنی ہی دیر میں اسے اپنے سینے سے لگائے اس کی پشت کو سہلاتا رہا، کچھ دیر بعد اس کے آنسوؤں کی شدت میں کمی ہوئی تو میں نے اسے خود سے الگ کیا۔

"پانی پیو گے؟" جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے قریب پڑے شولڈر بیگ میں سے پانی کی بوتل نکال کر ماجد کے ہاتھ میں پکڑائی۔

"لوگ سمجھتے ہیں سمندر پر رہنے والوں کو پیاس نہیں لگتی، لوگ یہ نہیں سوچتے کہ سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے، نمکین پانی پیاس بجھانے کو نہیں ہوتا، یہ تو پیاس بڑھاتا ہے، میری روح پیاسی ہے، سر جی، میں پیاسا ہوں۔"

"ابا کے مرنے کے اگلے دن ہمیں گھر سے نکال دیا گیا، میری اماں اور چھوٹی بہن میری ماسی کے گھر رہ رہی ہیں۔"

"گھر سے کیوں نکالا؟"

"ابا نے دو ماہ پہلے نشے کے لئے پیسے نہ ہونے پر مکان گروی رکھ دیا تھا، پہلے نوکری چھوٹی پھر مکان گروی رکھا اور پھر ابا یہ دنیا چھوڑ گیا، میری اماں اور بہن کو گھر چھوڑنا پڑا اور مجھے گھر چھوڑ کر یہاں آنا پڑا ساحل سمندر اپنے ساتھی مچھیروں کے پاس مچھلیاں پکڑنے۔"

"سوچتا ہوں کہ کسی دن مچھلیاں پکڑتے سمندر میں ڈوب جاؤں تو حکومت کی طرف سے میری اماں اور بہن کو ایک لاکھ تو ملے گا نا۔"

"ماجد! یہ کیا بات کی؟ ایسے نہیں سوچتے۔"

"بہت بڑی رقم ہوتی ہے نا سر جی۔"

"ماجد!"

"سر جی کتنے سو کے نوٹ ہونگے ایک لاکھ میں؟" اب کی بار وہ معصومیت سے میری جانب

دیکھتا ہوا بولا۔
"بس ماجد! خبردار جو ایک لفظ بھی آگے بولا۔"
پھر کافی دیر تک ماجد میرے ساتھ اپنی اور گھر والوں کی باتیں کرتا رہا، میں واپس آنے لگا تو ماجد سے بولا۔
"کتنے پیسے لئے تھے گھر کو گروی رکھنے پر تمہارے اہا نے؟"
"دس ہزار۔"
"دس ہزار۔"
"میں تمہیں تین ماہ میں گروی کے پیسے دوں گا، بلکہ اس مہینے تین ہزار، ابھی میرے پاس نہیں ہیں اگلی مرتبہ آؤں گا تو تب لیتا آؤں گا۔"
"نہیں سر جی، میں نے آپ سے پیسے لینے کے لئے تھوڑا بتایا ہے۔"
"اور میں نے ایسا سوچا بھی نہیں ہے، بس میرا دل کیا ہے، مجھے تم اچھے لگتے ہو، بہت اچھے جیسے میرا کوئی قریبی دوست ہو تو بس اس لئے تمہارے لئے اس عید کا چھوٹا سا تحفہ ہوگا۔"
اتنے عرصے اس نے میل ملاقات پر میں اتنا تو جان ہی پایا تھا کہ وہ حد درجہ خوددار تھا۔
"لیکن سر جی!"
"ماجد! تم مجھے دوست نہیں سمجھتے؟"
"میں تو آپ کو اپنا دل کہتا ہوں، میں نے اپنی اماں کو بھی بتایا تھا آپ کے بارے میں، جب آپ نہیں ملے تھے تو میں یہاں پر کبھی کبھی بیٹھا اکیلا ہی سوچتا رہتا تھا اب وہ ساری سوچیں آپ سے بانٹ لیتا ہوں۔"
"تو اب مزید اس بارے میں، میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔"
☆☆☆
بس یہی میری اس کی آخری ملاقات تھی، اس کے بعد نہ میں ساحل سمندر آیا نہ اس سے مل سکا۔
میں شولڈر بیگ کندھے پر ڈالے سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں، جس کام کے لئے میں سنڈے کو ساحل سمندر آیا وہ بھی نہ ہو سکا، لگ رہا تھا کہ واپس اپارٹمنٹ جا کر مجھے ماہنامے کے ایڈیٹر کو بتانا پڑے گا کہ میں نے پیر کا جو وعدہ کیا تھا افسانہ بھجوانے کا وہ میں مصروفیت کی وجہ سے لکھ ہی نہیں سکا۔
ساحل سمندر کی گیلی ریت پر قدم اٹھاتے میں قریب کی بنی جھگیوں کی جانب چلا آیا۔
ایک مرتبہ میں نے ماجد سے پوچھا تھا کہ "کہاں رہتے ہو؟" تو اس نے دور نظر آتی چند جھگیوں کی جانب اشارہ کیا۔
"وہاں۔"
"وہ تو ساحل سمندر کے بہت قریب ہیں، اگر طوفان آجائے تو۔"
"خدا کے آسرے، سمندر میں رہنا تو طوفان سے کیا ڈرنا سر جی۔"
"یہ تم مجھے سر جی کیوں کہتے ہو؟"
"کیونکہ مجھے آپ سر جی جیسے لگتے ہیں۔"
"سر جی جیسے؟"
"ہاں مجھے یاد ہے میں جب سکول جاتا تھا تو ہمیں جو استاد اردو پڑھاتے تھے ہم سب بچے انہیں سر جی کہتے تھے۔"
میں جھگیوں کے قریب چلا آیا، کچھ بچے جھگیوں کے پاس گیلی ریت سے گھروندے بنا رہے تھے چند عورتیں بھی وہیں بیٹھیں تھیں۔
اتنے میں بیس بائیس سال کا ایک لڑکا جھگی سے باہر نکلا اور میری جانب چلا آیا۔
"ہاں صاحب۔"
"وہ میں یہاں ایک لڑکا ماجد ہوتا ہے

مچھیرا، اس کا پتہ کرنے آیا ہوں۔"
"ماجد؟"
"ہاں اس نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں رہتا ہے، ان جھگیوں میں۔"
"اچھا، ماجد، منّو۔"
"ہاں منّو کہہ کر اسے سب بلاتے ہیں۔"
"وہ تو صاحب ڈوب گیا۔"
"کیا؟" میں پورے جی جان سے تڑپ اٹھ تھا اس کی بات سن کر۔
"ڈوب کے مر گیا، عید پر سمندر کی لہر میں ڈوبنے والوں میں ماجد بھی تھا۔"
"لیکن میں تو اسے ایک ہفتے پہلے ملا تھا۔" میرے ہونٹوں سے نکلا۔
"ہاں تو صاحب عید کو گزرے دو دن ہوئے ہیں۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میرا دل لرز اٹھا تھا، ماننے سے انکاری تھا۔
"صاحب! اس کی تو لاش ڈھونڈنی بھی نہیں پڑی، پانی کے ریلے نے اس کی لاش خود ہی ساحل پر نکال کر پھینک دی۔"
"وہ...... وہ تو پنجاب کا تھا۔"
"ہاں، اس کی لاش پنجاب گئی ہے۔" اس لڑکے نے جواب دیا۔
"اس کی تو ماں اور بہن بھی پنجاب میں؟" میں نے لاشعوری طور پر کچھ جاننے کی کوشش کی۔
"آئی تھی اس کی ماں اس کی لاش لینے، حکومت کی طرف سے ڈوبنے والوں کے لواحقین کو ایک ایک لاکھ روپے ملے ہیں، اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ گروی گھر کو چھڑائے گی اور پھر کچھ پیسے بیٹی کی شادی پر لگائے گی باقی اپنے علاقے میں پرچون کی دکان کھول لے گی۔" میرے پوچھنے کی دیر تھی کہ اس نے ساری تفصیل بتانی شروع کر دی۔
"لیکن آپ کون ہیں صاحب اس کا کیوں پوچھ رہے ہیں۔"
"میں...... میں اس کا کوئی نہیں۔" میں زیر بولا تھا سر جھکائے اور واپسی کے لئے مڑا۔
"صاحب آپ نے بتایا نہیں۔" مجھے مڑتے دیکھ کر اس لڑکے نے پوچھا۔
"میں اس کا دوست۔" مڑتے مڑتے میں نے جواب دیا۔
"آپ اس کے سر جی تو نہیں؟"
"آپ کی بہت تعریف کرتا تھا، عجیب لڑکا تھا، عجیب عجیب باتیں کرتا تھا، لگتا ہی نہیں تھا، ہم مچھیروں کا ساتھی، کبھی اس کی باتیں عجیب لگتی کبھی بڑی سمجھ والی، جو بھی تھا دل کا اچھا تھا۔"
میں بوجھل دل لئے اپنے اپارٹمنٹ واپس چلا آیا اور اب اپنے سامنے کاغذ پر افسانہ رقم کر چکا ہوں۔
بہت سوالوں کے جواب تھے جو ماجد نے دیئے تھے، بہت سے سوال تھے جو مجھے ابھی اس سے پوچھنے باقی تھے۔
لیکن ایک سوال جو میں اس سے کبھی بھی پوچھ نہیں پایا، ہاں اس سے ملنے کے بعد کئی مرتبہ میرے ذہن میں آیا لیکن اسے الفاظ کا روپ نہیں دے سکا۔
"انسان زندہ ہو تو قیمتی ہوتا ہے یا مرنے پر قیمتی ہوتا ہے؟" ماجد زندہ تھا تو میرے لئے قیمتی تھا، مرا تو اپنی بہن اور ماں کے لئے قیمتی ہو گیا لیکن خود اپنے لئے کیا تھا؟ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟

☆☆☆

سدرۃ المنتہیٰ

تیرھویں قسط کا خلاصہ

نواز حسین، امرکلہ سے ملتا ہے اور اسے سب کے بارے میں بتاتا ہے۔
امرت علی گوہر اور عمارہ امرکلہ کے گھر جاتے ہیں، جہاں سے ان کی امرکلہ کی چادر کا حصہ، کونا ڈائری وغیرہ ملتی ہے۔
امرت کی عمارہ سے شادی کے بارے میں بات ہوتی ہے۔
جائیداد کے بٹوارے پر وہ حصہ لینے سے انکار کرتی ہے اور عدنان کے لئے بات کرتی ہے۔
حالار کی ناراضگی پر فنکار علی گوہر سے رابطہ کرتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیئے

چودھویں قسط

پروفیسر غفور تو گھر پر نہیں تھے، مگر تالا کھلا ہوا تھا۔
''کوئی چور چکا بھی آ سکتا ہے۔'' اس نے لمحے بھر کے لئے سوچا تو پروفیسر کے بڑھاپے پر ذرا رحم آ گیا۔
مگر یہاں چرانے کے لئے تھا ہی کیا؟ دو چار پائیاں، چند برتن، چند کپڑوں کے جوڑے اور موہنجوداڑو سے برآمد شدہ چیزوں کے ہم شکل سکے پتھر، نگینے، برتن، جو بڑی شان سے عین سامنے شو کیس میں سجے ہوئے تھے۔
''ہے تو یہ بھی چرانے کی چیزیں۔'' وہ شو کیس میں سجی چیزوں کو دیکھنے لگا۔
''کبھی چوری کی تو نہیں، یہ گناہ بھی سر لے لوں۔'' خود سے دو لمحے کی جنگ تھی پھر شو کیس کھولا اور دو نگینے ایک سکہ ایک چھوٹے سائز کا لوٹا اٹھایا، سوچا لوٹا کہاں رکھے گا، پکڑا جائے گا، مگر کوئی بڑی سی چیز اٹھا کر پروفیسر کی توجہ چاہ رہا تھا دل۔
''اس سے کم از کم وہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے تالا تو ضرور ہی لگائیں گے، میں تو پھر بھی ایک سکہ دو نگینے چرا کر جا رہا ہوں کوئی اور شوقین ہوتا تو پورا شو کیس اٹھا کر سر پہ بھاگتا۔'' سوچتے ہوئے وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔
''چوری اگر پکڑی گئی تو ادھار، نہ پکڑ پائے تو نقصان کسی بھرپائی کر دوں گا۔'' وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے گھر سے باہر نکلا تھا۔
جیب میں تین جواہرات رکھ کر جیسے دل امیر ہو گیا تھا، بائیک اسٹارٹ کر کے ہوا سے پھڑ پھڑاتے ہوئے بالکل سڑک کی سیدھ میں جا رہا تھا، جہاں نزدیکی ہوٹل میں عین سامنے حالار بیٹھا تھا، اس نے موٹر بائیک وہیں جا کر روکی تھی۔

☆☆☆

عمارہ نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنا چھوڑ دیا تھا اور اس کا انتظار کرنا بھی، مگر دل کی کیا نہیں سنی جاتی جو بار بار اصلیت پر آ جاتا ہے۔
دل کی اگر نہ سنی جائے تو وہ مزید شور کرنے لگتا ہے، بھٹکنے لگتا ہے، باؤلا ہے نا، وہ خود میں خود سے بولتی سوچتی سمجھنے کی کوشش کرتی مسکرا اٹھی۔
وہ اسی جگہ پر بیٹھ گئی جہاں بیٹھ کر ساری رات علی گوہر نے وہ ڈائری پڑھی تھی اور وہ کئی دیر تک کمرے کی کھڑکی سے اس کے چہرے پہ پڑنے والی روشنی میں اس کے تاثر دیکھتی رہی، ایک لمحے کو دل کیا کہ ڈائری اس کے ہاتھ سے چھین لے، مگر عمارہ بھلے عمارہ ہو، اتنی ہمت اس وقت نہ تھی، وہ یوں ہی کھڑکی سے سر ٹکائے ٹکائے سو گئی تھی۔
اور گوہر وہ ڈائری پڑھتے پڑھتے بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا، صبح سے وہ خاموش تھا، بہت چپ چپ، مگر خود کو بلاوجہ ہی مطمئن ظاہر کرتا ہوا، بلاوجہ مسکراتا ہوا، ایک بار تو عمارہ پوری باچھیں کھول کر اس کے سامنے ایسے مسکرائی جیسے اس کی مسکراہٹ کا مذاق اڑا رہی ہو اور وہ یقیناً اس کی مسکراہٹ پر طمانچہ تھا۔
جبھی وہ بقیہ دن منہ پھلائے بگاڑے ہوئے پھرتا رہا اور جب شام ہوئی تو اس کی

آوارہ گردی کے سارے رستے کھل جاتے تھے، کھل گئے۔
اور وہ چیچنی کی چابی گھماتا چلا گیا، اماں اور ابا سونے کی تیاری میں تھے، عمارہ نے ٹہلنے کا پروگرام کینسل کر کے امرت کو کال ملائی، وہ بھی کہیں راستے میں تھی، غالباً کہیں جا رہی تھی۔
''لور لور پھرنے کی عادت نہیں جائے گی تمہاری بھی۔'' چائے کا کپ لیتے ہوئے اس نے زیر لب کہا تھا۔

☆☆☆

وہ جا کر حالار کے پاس بیٹھ گیا، حالار پاگلوں کی طرح، ہوٹل سے نیچے آتی سیڑھیوں پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔
''بھائی جان یہ پاکستان ہے یہاں سیڑھیاں گندی ہوتی ہیں، تم کیا سمجھ کر یہاں بیٹھ گئے ہو؟'' پاس سے گزرتے ہوئے ہوٹل کے ویٹر نے اسے کہا تھا اور علی گوہر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، عنقریب ہنسی چھوٹ جاتی، مگر کنٹرول کیے وہ اس کے پاس کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔
''مجھے پتہ ہے کہ یہ پاکستان ہے اور یہ شہر، شہر حیدر آباد ہے، پھر بھی میں یہیں بیٹھ گیا ہوں۔'' وہ بیرے کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔
حالار نے اس وقت اسے خونخوار نظروں سے گھورا تھا۔
''کیسے ہو حالار؟''
''کیسا لگ رہا ہوں؟'' لہجہ تلخ ترین تھا۔
''اچھے لگ رہے ہو۔'' وہ بلاوجہ ہی مسکرایا تھا۔
''بہت شکریہ تعریف کا۔''
''وہ بھی جب تعریف کرتی تھی تو تم یہی کہتے تھے نا؟ مجھے پتہ ہے تمہاری اس سے بہت اچھی دوستی ہے، دوستی رہے گی۔'' دوسرا جملہ اس نے کاٹ دار انداز میں کہا تھا، علی گوہر کی مسکراہٹ دھیمی پڑ گئی۔
''تمہارے ساتھ پتہ ہے کیا مسئلہ ہے؟'' حالار اسی انداز میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔
''تمہارے ساتھ بہت زیادہ مسئلے ہیں اور وہ سارے تمہارے پیدا کردہ ہیں، تمہیں الجھنے الجھانے کے سوا کچھ نہیں آتا، کبھی خوابوں سے نکل کر دیکھنا پتہ چلے گا، کتنا خراب کیا ہوا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھا تھا۔
''تمہیں برا لگتا ہے نا جب میں اس کی بات کرتا ہوں، مگر مجھے برا نہیں لگا اس کا یوں تمہاری باتیں کرنا اور ایسے انداز میں کرنا، تم خوش قسمت ہو، میں کہنا چاہتا ہوں۔'' حالار نے ایک لمحہ رک کر اس کے چہرے کو دیکھا جہاں حسد جلن تیزی تلخی کوئی برا احساس نہ تھا، نہ طنز نہ ہی مذاق تھا، سنجیدگی تھی، ٹھہراؤ تھا۔
حالار کے اندر اس سب کے باوجود بھی ایک تلخی بیٹھ گئی تھی جو کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی، اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کہاں اور کیا کہے، مگر اس کے اندر ایک لاوا پک رہا تھا، جسے کسی صورت نکلنا تھا، مگر وہ کچھ بے ہنگم طرح سے اور وقفے وقفے سے چنگاری دے رہا تھا، وہ اندر

سے کھول رہا تھا، ابل رہا تھا، اس کا دل آگ کا گولا بنا ہوا تھا، سوئی ہوئی محبت عجیب روپ اختیار کر گئی تھی۔

کاش امرکلہ اس سے بہتر تھا تم مر جاتیں، میں رو لیتا، کوئی تو کام کھل کر کر لیتا، اسے کیا پتہ، اسے کون بتاتا۔

حالار کو خود امرکلہ نے خود کو کئی بار یہ بددعا دی ہے اسے کون کہتا کہ امرکلہ نے موت کو کتنے وقفے وقفے سے چکھا ہے، اسے کون بتاتا کہ وہ بھی ایک ہی بار میں رو کر ختم ہو جانا چاہتی تھی۔

علی گوہر اس کے سامنے کھڑا تھا اور بے بس تھا۔

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر صرف ایک جملہ کہہ سکا۔

''تمہاری جس غلطی اور غرور نے تمہیں ملیا میٹ کیا تھا ایک بار پھر تم اسی غرور کو اٹھا کر وہی غلطی کرنے جا رہے ہو، یہ سوچے بغیر کہ بھگتان تم سے وابستہ لوگ بھی بری طرح بھگتتے ہیں۔'' بات تلخ تھی مگر لہجہ تلخ نہ تھا۔

''میری زندگی میں جتنا برا ہوا ہے اور اب جو ہوگا، یا ہو چکا، یاد رکھنا علی گوہر اس میں تمہارا بھی ایک ہاتھ ہے۔'' وہ بچوں کی طرح اسے الزام دے کر اس جگہ سے چلا گیا تھا، علی گوہر کچھ لمحے وہیں کھڑا رہا تھا پھر فنکار کو فون ملایا ان کی یہی تقرار تھی کہ حالار کا پیچھا نہیں چھوڑنا۔

علی گوہر کو خدشہ تھا شاید وہ ہیرہ آباد گیا ہوگا، مگر وہاں سے سنسان گلی چھان کر اس کا دل کیا تخی صاحب کے مزار کا پھیرا لگا آئے کچھ دیر پہلے امرت کا میسج تھا کہ وہ آج تخی صاحب کے مزار کے پاس اس کا انتظار کرے گی، یہ شام سے پہلے کا کیا گیا میسج تھا، اسے اندازہ تھا وہ وہیں ہوگی، ابھی تک یا پھر وہاں سے نکل گئی ہوگی، اس نے اپنی کھٹیچر موٹر بائیک کو ایک بار پھر سے سڑک پر رواں کر دیا، جس کا مقدر اس کے بتائے گئے راستوں پر بھاگنا دوڑنا ہی تھا اور خود اس کا مقدر وہ خود نہیں جانتا تھا بلکہ اس کا خدا ہی جانتا تھا، فی الحال اس کا ذہن حالار کے جملے میں الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

دل اک عجب تماشہ ہے، ڈبکیاں کھاتا ہے، پھر ڈوب جاتا ہے، کبھی سطح پر تیرنے لگتا ہے۔

وہ قدم گاہ مولا علی سے سید حاتخی عبدالوہاب کے مزار پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا تھا، دل کو قرار چاہیے تھا اور شاید منزل کا پتہ بھی مگر منزل کیا جب رستے نامعلوم ہو جائیں، بڑی خاموشی سے اک ہجوم میں تنہا حالار تھا، مزار کے گرد کنسٹرکشن کا کام ہو رہا تھا وہ مزار کے پاس جا کر چادر چھو نہ سکا تھا، چھونا اور جھک کر بوسہ دینا لازم تو نہیں مگر اس سے قرار ضرور آ جاتا ہے، جب لمس ہاتھ سے دل تک اترتا ہے تو دل کی کشتی ٹھہرتی ضرور ہے، ڈولتے ڈولتے ذرا لمحے کو تیرنے بھی لگتی ہے۔

وہ دور سے چوکھٹ پہ بکھرے پتھروں کے درمیان بیٹھ گیا تھا، جمعہ کی رات تھی محفل سماع عروج پر تھا، اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا، سماعتیں بج رہی تھیں، آنکھیں کسی بے نام سے غم پر بہہ گئیں، تبھی دھندلاہٹ میں کسی نے کندھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا تھا اور بازو اس کے کندھے پر پھیلا دیا، کانپتا ہوا وجود خود اس کا سہارا بن گیا، حالار پروفیسر غفور کے کندھے پر سر ٹکائے، ننھے سے بچے کی طرح بلکنے لگا تھا۔

☆☆☆

قدم گاہ مولیٰ علی کے سامنے ہال کے اندر آتے ہوئے راستے کی چڑھائی پر جوتوں کے ڈھیر کے پاس پروفیسر غفور کھڑے تھے، اسے ان کو سامنے دیکھ کر عجیب خوشی سی ہوئی تھی، وہ اس کی چپل کے دو پرانے بھاری شوز جمائے بے خبری سے کھڑے تھے جب اس نے سلام کیا، وہ مسکرائے سلام کا جواب دے کر مگر اپنی جگہ سے نہ ہلے تھے۔

''یہاں کیسے آئی ہو؟''

''دل بہت بے سکون تھا سوچا یہیں سے ہو آؤں۔''

''اچھا کیا، کچھ کھو گیا ہے کیا؟''

''شاید بہت کچھ، شاید کچھ بھی نہیں۔''

''باتیں اچھی بنا لیتی ہو علی گوہر کی طرح۔''

''عمارہ بھی یہی کہتی ہے۔'' وہ کہتے ہوئے ہنسنے لگی تھی۔

''چلو سخی صاحب کو سلام کر آئیں۔''

''ہاں ضرور اگر آپ ہٹیں اور میں اپنے جوتے پہن لوں۔''

''اوہ یہ تمہارے جوتے ہیں، سوری امرت بچے، یہ تو میں دیکھے ہی نہیں، اوہ ان کی تو حالت بری ہو گئی ہے، میں صاف کر لوں۔'' وہ کملائے ہوئے جوتوں کے پاس جھکے مگر اس سے پہلے امرت نے جوتے جیسے تیسے پاؤں میں اڑس لئے اور ان کو اوپر اٹھانے کے لئے بازو کا سہارا دیا، وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اوپر اٹھے اور اس کا سر تھپکا۔

''کبھی ہم بڈھوں کا سہارا بھی لے لیا کرو، ہمیں صرف سہارا لینے کے لئے ہی مجبور کر دیا ہے۔'' وہ ان کی بات پر مسکرائی تھی۔

''آپ لوگ ہی تو اصل سہارے ہیں، ایک مخصوص وقت ہوتا ہے جب اللہ آپ لوگوں کو عین موقع پر بھجواتا ہے اور ہر کوئی اپنا اپنا کام کرتا ہے۔''

''کسی دوست نے کہا تھا اللہ کے لوگ ہر فیلڈ میں کام کرتے ہیں اور کیا خوب کہا تھا۔''

''تمہاری دوست امر کلہ نے تو یہ بات نہیں کی؟''

''نہیں سر امرت نے نہیں کہیں یہ کوئی اور تھی بظاہر بہت سیدھی تھی مگر باتیں عقل کی کرتی تھی، عمارہ اس سے بہت چڑتی تھی، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عمارہ اس سے جلتی تھی اور امر کلہ بھی، مگر امرت نے اسے بہت حوصلہ دیا تھا۔''

''پڑھ رہی ہے آج کل سندھی میں ایم اے کر رہی تھی، کئی بار کہا کہ یار ایم فل کر لو مگر نہیں، وہ کہاں سنتی ہے کسی کا بی ایڈ کر کے ایم اے کے بعد اب ایک سرکاری اسکول کی نوکری کر رہی ہے۔''

''خوش ہے نوکری سے؟''

''ہاں خوش ہے کس قدر۔''

''تم خوش ہو امرت؟ اور عمارہ؟ اور امر کلہ...... عمارہ ٹھیک ہے، میں بھی ٹھیک ہوں، انسان بڑا ناشکرا ہے سر! آج کل دعا کریں کسی مسئلے میں الجھی ہوں، مسئلہ سلجھ ہی جائے، حقدار کو اس کا حق مل

جائے، مجھے کسی اور کا حق لے کر کیا ملے گا۔"
"تم بہت پیاری بھی ہو امرت، تم اتنی فکر نہ کیا کرو۔" وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہجوم میں چیر کر جگہ بناتے آگے آ رہے تھے۔
"اور بھی کوئی مسئلہ ہے؟" پروفیسر اس کی طرف بغور دیکھنے لگے تھے۔
"جب فیصلہ کرنا دشوار ہو، یا پھر آنے والی مشکل کو ٹالنے کے لئے لڑ رہے ہوں، تو یہی کیفیت ہو جاتی ہے نا سر؟ جو میری ہے؟"
"اس سے بھی خطرناک، کیفیت ہو جاتی ہے، تم تو بہت بہادر ہو امرت۔"
"سر آپ میرا دل خوش کر رہے ہیں نا۔"
"ہاں امرت یہی سمجھو کہ میں تمہارا دل خوش کر رہا ہوں۔"
وہ چھوٹی سی گلی نما جگہ سے نکل کر احاطے میں آ گئے تھے، جہاں بیچ میں کپڑے کا پارٹیشن دے کر عورتوں کے لئے جگہ الگ بنائی گئی۔
پروفیسر غور مزار کی طرف بڑھ گئے تھے، وہ عورتوں کے حصے میں آ گئی اور چوکڑی مار کر میلے گدلے قالین پر بیٹھ گئی تھی۔
ایک عورت پارٹیشن کے پردے کو زور سے تھامے رو رہی تھی اور بخی صاحب سے کوئی اپیل کر رہی تھی، اس نے دو لمحے عورت کے تاثرات کو دیکھا جو کسی ضدی بچے کی طرح کچھ مانگ رہی تھی اور اس کے برابر میں کوئی عورت خالی خالی تاثر لئے اردگرد دیکھ رہی تھی۔
امرت کو محسوس ہو رہا تھا کوئی اسے دیکھ رہا ہے، کسی کی نظریں چبھ رہی ہیں، مگر چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد بھی اسے ہجوم میں کچھ نظر نہ آیا، اس کے باوجود بھی جسے دل تھوڑا بے قرار ہوتا ہے اور کسی کی نظروں کی تپش محسوس ہوتی ہے اسے لمحے کے لئے خود اپنے آپ سے خوف آنے لگا تھا۔
کہ یہ اس کے اندر کا احساس ہے جو اسے چین لینے نہیں دیتا، اس نے جلدی سے فاتحہ پڑھی اور بغیر دعا کیے وہاں سے نکل کر قدم گاہ موئی علی کے گیٹ کے سامنے چڑھائی کے پاس آ گئی جہاں جوتوں، لوگوں اور چیزوں کے ٹھیلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔
لوگ چیزوں پر شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے، دیکھ رہے تھے چکھ اور سونگھ رہے تھے اور کچھ چڑھائی سے نیچے میدان میں بستروں کے اندر اونگھ رہے تھے۔
وہ ٹھیلوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک کتابوں کے اسٹال پر رک گئی۔
"مجھے ایک بہادر عورت کی داستان حیات کا کتابچہ چاہیے۔" وہ کتابیں دیکھتے ہوئے دکاندار سے نہیں خود سے گویا تھی، ادھر بخی صاحب کے مزار کے پاس جھولی میں ڈھیر سارے پتھر بھرے بیٹھی ہوئی عورت جو پتھر پھینک کر متجسس ہو کر اسے دیکھے گئی تھی اور اس کے نکلنے کے بعد اس کے پیچھے بھی آئی، مگر ہجوم کی زیادتی کی وجہ سے سمت بدلنے کے سبب وہ اس لڑکی کو ڈھونڈنے میں ناکام ہوئی تھی، اس کا دماغ اسے بار بار کہہ رہا تھا کہ یہ وہی ہے، اس عورت کو کئی روز کے بعد کوئی امید کی کرن نظر آئی تھی اور وہ بھی لمحے بھر کے لئے سہی۔

عورت جب تک چڑھائی کے نزدیک آئی، جب امرت کتابچہ ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر میدان سے گزر کر بیرونی گیٹ تک پہنچ گئی تھی، ٹھیک دس منٹ بعد وہ عورت اس جگہ کھڑی تھی اس اسٹال کے پاس۔

''تمہیں کیا چاہیے اماں؟'' دوکاندار نے دلچسپی سے اس عورت کے تاثر جانچتے ہوئے پوچھا تھا۔

وہ بغیر کچھ کہے میدان میں اتر گئی، جہاں لوگ اونگھ رہے تھے، کچھ ٹہل رہے تھے، کچھ جاگ تو کچھ سو رہے تھے، عورت حواس باختہ بکھرے بال، میلی سی چادر اوڑھے، سر کھجاتی ہوئی گیٹ تک پہنچ گئی، جہاں سے چند منٹ پہلے ہی امرت رکشے میں بیٹھ کر یہاں سے گئی تھی۔

عورت گیٹ کے پاس اسی طرح کھڑی تھی، اس کی آنکھوں میں اب نمی تھی، جو ناامیدی کی نمی ہوتی ہے، تبھی علی گوہر اس گیٹ سے اندر آتے ہوئے وہ لمحے اس عورت کی طرف دیکھ کر رکا تھا، وہ آنکھیں پڑھنے میں ماہر تھا۔

اس نے عورت کی بے چین آنکھیں تو پڑھ ہی لیں تھیں، عورت گیٹ سے الٹے پاؤں سر کھجاتی آگے کی طرف پھر دو قدم پیچھے اور پھر سیدھے قدم پر آگے میدان کی طرف جانے لگی، علی گوہر اس کے پیچھے پیچھے میدان سے چڑھائی، چڑھائی سے ہجوم، ہجوم سے مزار کے احاطے میں پہنچ گیا، جہاں عورتوں کے حصے میں وہ عورت دیوار کے سہارے جا کر بیٹھ گئی۔

اب وہ پارٹیشن کے درمیان پردے کے سوراخ میں سے نکلتی ہوئی روشنی کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ روشنی کی پتلی لکیروں میں کچھ تلاش رہی ہو، اس کی آنکھیں اب بھی پانیوں سے بھری تھیں، مسلسل روشنی اور پھر اندھیرے کونے کی طرف دیکھتے علی گوہر کو لمحے کے لئے ایسے لگا جیسے عورت کی آنکھیں روشنی کی پتلی لکیریں دیکھتے ہوئے ایک ہی جگہ پر رک کر پتھرا گئی ہوں، لمحے کے لئے عورت پتھر کا مجسمہ لگنے لگی اور وہ پتھر کے سہارے بیٹھ کر اس کو دیکھتے ہوئے جیسے صدی کا سال بن گیا تھا۔

وہیں مزار کے کچھ نزدیک جب حالار پروفیسر غفور کے کندھے سے لگ کر بلک رہا تھا، تب پروفیسر غفور کی نظریں امرت کو دیکھنے کے لئے جب اطراف میں اٹھیں تو گوہر پر ٹھہر گئیں اور گوہر کو متجسس دیکھ کر عورت کی طرف اٹھیں، جو پتھرائی ہوئی نظروں سے روشنی کو اور اب علی گوہر کی نظریں محسوس کر کے علی گوہر پر تک گئیں، تب علی گوہر پتھر سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا اور کسی کا کندھا ٹکرانے کے سبب گرتے لڑھکنے بچا تھا، عورت کے منہ سے بے ساختہ عیسیٰ مسیح کی صدا نکلی تھی اور بلند آواز میں نکلی تھی۔

☆☆☆

کئی دن کی بھاگ دوڑ اور کوششوں سے بالآخر وہ کام سرانجام پا ہی گیا جس کے لئے اپنے آپ کو بھلا کر اس نے دن رات ایک کیے ہوئے تھے آدھی پراپرٹی سیل کر کے رقم محفوظ کرنے بعد اس نے آدھا حصہ عدنان کے نام کروانے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا، وقار صاحب کا ارادہ اب قریب ہی کوئی گھر لے کر کرائے پر دینے کا تھا، کچھ رقم محفوظ کر لی تھی صبیح اور بقیہ اخراجات کے

لئے، اس نے اپنی شادی کے لئے ایک دھیلا بھی خرچ ہونے کے لئے نہیں لینا تھا، اس سلسلے میں اس نے حنان سے صاف بات کرنے کا سوچ لیا تھا، رستے میں گزرتے ہوئے دو بار حنان اور اس کا آمنا سامنا بھی ہوا تھا۔

صاف لگ رہا تھا وہ ناراض ہے، اس کے پاس ان دنوں میں ذرا وقت نہیں تھا اس کے نخرے اٹھانے کے لئے، سو یہ کام وقت پر چھوڑ کر اس نے پوری توجہ اسی کام پر دے دی تھی۔

عدنان کے ساتھ ابھی وہ وکیل سے آخری ملاقات کے بعد باہر نکل رہی تھی جب اس نے حنان کو تیسری بار کچھ فاصلے پر دیکھا، اسے لمحے کے لئے شک ہوا کہ وہ اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

اور یہ سوچ کر اسے خوب ہنسی آ رہی تھی، وہ اب بھی ہلکے سے ہنسی دباتے ہوئے گاڑی میں آ کر بیٹھی تھی، عدنان نے اس کے تاثر بڑی توجہ کے ساتھ ملاحظہ کیے تھے۔

''یہ عبدالحنان تو خاصہ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے، پہلے سے بہتر؟ (یا بدتر)'' وہ بدتر نہیں کہہ سکی۔

''عجیب لگ رہا ہے، ملا نہیں سلام تک نہیں کیا، دیکھ کر منہ پھیر لیا، کمال ہے اب عدنان بھی اس بات پر حیرت کھا رہا ہے جبکہ یہ خوبیاں تو اس میں خود پوری طرح موجود ہیں۔'' وہ یہ سوچ کر مسکرائی۔

''شادی ہو رہی ہے تم لوگوں کی، ایک مہینے میں؟'' عدنان نے زندگی میں پہلی بار کسی ذاتی موضوع پر بات کی تھی۔

''ہاں...... شاید۔'' اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

گاڑی ٹرن کرتے ہوئے بھی مڑ کے عین سامنے حنان کھڑا تھا، عدنان نے ایک دوستانہ مسکراہٹ باہر پھینکی تھی، وہ بڑے تیکھے تیوروں سے سامنے سے ہٹ گیا تھا، امرت نے بغیر مسکراہٹ کے یہ کارکردگی ملاحظہ کی تھی۔

''کچھ گڑبڑ چل رہی ہے تم لوگوں کے بیچ؟''

''کئی سالوں سے۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''اس کا رویہ عجیب ہے، تم نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

''زندگی میں پہلی بار شاید کوئی فیصلہ تم نے بغیر سوچے سمجھے کیا ہے وہ بھی اتنا بڑا اور اہم فیصلہ جس پہ سوچنے کے لئے بہت کچھ ہوتا ہے، بڑی گنجائش نکلتی ہے جس پہ سوچنے کے لئے، ویسے تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت زیادہ مغز ماری کرتی ہو اس سلسلے کو کیسے ہلکا لے لیا۔'' وہ گاڑی لطیف ڈیری کی طرف بڑھائے گیا۔

☆☆☆

علی گوہر صبح سویرے یہاں آن پہنچا تھا، دل کو چین ہی نہیں آ رہا تھا، امرت کا فون مسلسل بند تھا اور فنکار کی طرف وہ جاتے جاتے رک گیا، پروفیسر غفور کی تازہ تازہ چوری کی تھی اس لئے شرمندگی آڑے آ رہی تھی، سوچ رہا تھا ابھی ان کی غیر موجودگی میں یونہی چیزیں اپنی جگہ چھوڑ آئے

گا، نوکری کے لئے بھی پلٹ کر خبر تک نہ لی، خود کو کوستے برا بھلا کہتے سوچتے، قدم گاہ مولیٰ علی پر پہنچا اور ساتھ سخی صاحب کو سلام کر کے احاطے میں نظریں دوڑائیں، نظر اس بڑھیا کو ڈھونڈ رہی تھیں، جس کے منہ سے اس کے گرنے سے پہلے عیسیٰ مسیح کی صدا بلند ہوئی تھی۔
اس وقت رش نہ ہونے کے برابر تھا، وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی، وہ چڑھائی سے نیچے اترتا ہوا میدان میں آ گیا۔
''کس کی تلاش ہے بھاؤ؟'' یہاں کا فرید حسین اسے جانتا تھا۔
''فرید بھا وہ ایک خاتون تھیں یہاں، کچھ بکھرا حلیہ، بال کھلے، ایک بڑا سا دوپٹہ لیا ہوا تھا، کل پرسوں نظر آئیں تھیں۔''
''ہاں وہ کرسچن عورت، اسے کوئی اور خاتون یہاں لے آئی تھی دعا کے لئے، کہہ رہی تھی عورت کی بیٹی مر گئی ہے اس کے بعد اسے چین نہیں ملتا، وہ سکون کے لئے بے تاب ہے، چرچ جانا چھوڑ دیا ہے، اب وہ عورت اسے در در پھرا رہی ہے۔''
''اب کہاں گئی وہ عورت؟''
''کسی اور کے مزار پر گئی ہو گی، لوگ نماز تو پڑھتے نہیں اللہ کو مانتے نہیں اور اپنے جیسے لوگوں کے مزاروں کے پھیرے لگاتے رہتے ہیں، اللہ کبھی کسی کو ایسا بھی نہ الجھائے۔'' یہ فرید کہہ رہا تھا جو دن رات یہاں گزارتا تھا، اس نے سوچا پوچھ لے کہ تو یہاں کیوں پڑا ہوا ہے۔
''بندہ بڑا کم علم ہے گوہر بھا، حقیقت کیا ہے یہ کسے نہیں پتہ، کچھ لوگوں کو پتہ چل جاتا ہے، وہ پھر شاید ولی بن جاتے ہیں۔'' وہ خود ہی سوچتا کہتا ہوا اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔
''تو اپنے دل کو لگام ڈال کر رکھ گوہر بھا، بڑا بے قابو ہے یہ تمہارا دل، کبھی کسی، تو کبھی کسی کے پیچھے پڑا رہتا ہے، بھی کہیں تو کبھی کہیں چکراتا پھرتا ہے، دو جوتے مار کر سیدھا کر دے، ورنہ پچھتائے گا۔'' اس کے کندھے پر دو تھپڑ مار کر وہ پاس سے گزر گیا، گوہر کو جیسے چپ لگ گئی۔

☆☆☆

''کیا تم مجھے کچھ کھلانے پلانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' وہ اس کی بات گول کر گئی۔
''تم میری بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتیں تو نہ دو، مگر غور ضرور کرنا اس بات پر، ویسے ہاں میں تمہیں کچھ کھلانے پلانے کا ارادہ رکھتا ہوں، تم کیا کھاؤ گی، ربڑی یا پھر آئس کریم، تمہیں یاد ہے مجھے یہ دونوں چیزیں اسی جگہ کی پسند ہیں؟'' وہ ذرا حیران ہوئی۔
''ویسے نفرت بھی کس قدر اچھی چیز ہے نا کوئی ہمیں یاد رہ جاتا ہے اور اس سے وابستہ چیزیں بھی، عادتیں بھی بعض اوقات یاد رہ جاتی ہیں۔''
''یہ محبت کی الٹی تصویر تو نہیں عدنان؟ محبت کا بایاں ہاتھ۔'' وہ اس کی بات پر مسکرایا۔
''میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔''
''کرتے تھے۔'' لفظ تھے پر زور دیا گیا۔
''میں سوچ رہا ہوں امرت اگر میری بہن ہوتی تو کیا وہ تم جیسی ہوئی؟'' اس نے کہتے ہوئے گاڑی ڈیری کے سامنے روکی تھی اور اپنی بات کا جواب سننے سے پہلے ہی گاڑی سے نکل کر ڈیری کی

طرف چلا گیا۔
اسے کئی سال پہلے کہا گیا اس کا جملہ یاد آیا تھا کہ شکر ہے میری کوئی بہن ہے اگر ہوتی تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم جیسی ہرگز نہیں ہوتی۔"
کتنی نفرت تھی تب اس کے لہجے میں' ور اب بھی اس کے لہجے میں کوئی محبت تو تھی نہیں البتہ اپنائیت کا کوئی دور پرے کا واسطہ ضرور جھلک رہا تھا۔
وہ ربڑی کے دو بڑے مٹی کے پیالے اور آئس کریم لے آیا تھا۔
''آئس کریم ابھی کھالو، ربڑی گھر جا کر کھالینا۔''
''آج کا دن میں اپنی ڈائری میں لکھ لوں عدنان؟'' وہ مسکراہٹ دبا کر آئس کریم جار کھولنے گی۔
''لکھ لو، ابھی تک ڈائری لکھتی ہو؟''
''تمہیں یاد ہے کہ میں ڈائری لکھتی تھی؟''
''مجھے سب یاد ہے، کیونکہ تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار میں نے ڈائری کا سنہرا کور پھاڑ دیا تھا تمہارا، اس دن ہم بہت لڑے تھے۔'' وہ کہتے ہوئے مسکرا دیا۔
''تم نے یہ بھی کہا تھا کہ امرت اللہ کرے ہمیشہ کے لئے مر جاؤ۔''
''مجھے پتہ ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو ہمیشہ کے لئے ہی مر جاتا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے بے اختیار ہنس دی تھی۔
''شکر ہے میری دعا قبول نہیں ہوئی امرت، ورنہ میں اس وقت تمہارے ایصال ثواب کے لئے ربڑی بانٹ کے لئے مجبور ہو جاتا اور بانٹنے کے لئے تو چیز زیادہ مقدار میں لینی پڑتی ہے۔''
''توبہ ہے عدنان کتنے کنجوس ہو اب تک، چلو اگر میں تم سے پہلے مر جاتی ہوں تو تم میرے لئے ربڑی ضرور بانٹنا، میں سوچ رہی ہوں کتنوں کا بھلا ہو جائے گا اس صورت۔''
''اور اگر میں پہلے مر گیا تو؟''
''اللہ نہ کرے عدنان، تمہاری بیوی تمہارے بچے ہیں، ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔''
''مطلب جس کی بیوی اور بچے نہیں اسے جینے کا کوئی حق نہیں ہوتا؟''
''ہوتا ہے بالکل ہوتا ہے، مگر تب آپ صرف اپنے لئے جیتے ہیں، دوسروں کے لئے جینا بڑی بات ہے۔''
''میں تو اب بھی اپنے لئے ہی جیتا ہوں۔'' وہ مسکرانے لگا۔
''مجھے اندازہ ہے، تمہاری بیوی بہت فکر مند ہے تمہارے لئے، کل گھر کے نمبر پہ بھی فون کیا تھا اس نے، اس سے بات کر لو عدنان۔''
''تمہاری بیوی تمہاری بیوی کر کے بات کر رہی ہو کب سے بڑی ہے تم سے وہ چار چھ سال، میری بہن ہوتی تو اسے بھابھی کہتی۔'' وہ اسے جتا رہا تھا کچھ۔
''ہاں کیوں کہ وہ بہت باتمیز ہوتی، میں اگر تمہاری سگی بہن ہوتی نا عدنان تو......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''سگی بہن کیا ہوتا ہے امرت؟''

''سگی بہن یہ ہوتی ہے جس کی ڈائری کا کور پھاڑنے کے بعد جس کو نئی زندگی دلوائی جاتی ہے، اس سے لڑنے کے بعد اسے سوری کیا جاتا ہے، وہ جب روتی ہے تو اسے چپ کرانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے، وہ جب اداس ہو تو اسے خوش کرنے کے ہیلے ڈھونڈے جاتے ہیں، کوئی جب اس کا رستہ روکتا ہے تو سگی بہن کا بھائی راستے میں کھڑا ہو جاتا ہے، ساتھ چلتا ہے اور جب ساتھ چلتا ہے تو کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی، آنکھیں خدا جانے کیوں بھر آئی تھیں، وہ اسے دیکھے گیا۔

''کاش میں تمہارا بھائی ہوتا، سگا بھائی، یا پھر بھائی ہونے کا حق ہی ادا کر لیتا، مگر اچھا ہے امرت میں تمہارا سگا بھائی نہیں ہوں ورنہ تمہیں زیادہ پچھتانا پڑتا ایسے نالائق سگے بھائی کو بھگتنا عذاب ہو جاتا تمہارے لئے۔''

''مجھے یقین ہے کہ اگر میرا کوئی سگا بھائی ہوتا تو یکدم تم جیسا ہوتا۔''

''اور مجھے یقین ہے کہ اگر میری کوئی بہن ہوتی اور وہ سگی ہوتی تو وہ تم جیسی کیا بلکہ تم ہی ہوتیں۔'' عدنان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا۔

''آئندہ یہ نہیں کہنا کہ بہن ہوتی، اب یہ کہنا کہ بہن ہو اور تم ہی ہو، اس سے کم از کم مجھے خوشی ضرور ہو گی پاگل۔'' اس نے اس کے سر پہ پیار سے چپت لگائی تھی، خود اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں تھیں۔

''زندگی کے کتنے خوبصورت پارٹ ضائع ہو گئے، کاش ہم بچپن سے ایسے رہ رہے ہوتے ہے نا؟''

''کوئی بات نہیں اب بھی خوبصورت پارٹ ہے، جوانی بھی اچھی ہوتی ہے، شکر ہے بڑھاپے تک یہ دشمنی نہیں چلی۔''

''اچھا گاڑی ہٹاؤ پیچھے سے ہارن آ رہا ہے۔''

''ہاں، ہم نے بھی دن دیہاڑے کہاں گاڑی کھڑی کر رکھی ہے، چلو تمہیں گھر چھوڑ دوں پھر نکلوں گا یہیں سے پہنچتے پہنچتے تو شام ہو جائے گی۔''

''گھر چلو ڈنر کے بعد نکلنا، انکل کو بہت خوشی ہو گی ہمیں اچھے طریقے سے بات کرتے ہوئے دیکھ کر۔''

''ان کو خوشی دینے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا میں نے۔'' اس نے رکھائی سے کہہ دیا تھا۔

''عدنان وہ تمہارے باپ ہیں، یقین کرو ایکدم سگے باپ۔''

''بہت حساب کتاب نکلتے ہیں ان کی طرف میرے۔'' وہ ایکدم سے تلخ سا ہو گیا تھا۔

''حساب کتاب؟'' وہ الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

''حساب کتاب صرف جائیداد اور ملکیت کا نہیں ہوتا امرت، محبت اور احساس کا بھی ہوتا ہے، رشتے اور خیال کا بھی ہوتا ہے۔''

''وہ ترستے رہے ہیں تمہارے لئے عدنان۔''

''میں بھی ترستا رہا ہوں امرت۔'' اس کا لہجہ تیکھا تھا۔
''وہ باپ ہیں تمہارے، ان کو بڑھاپے میں ضرورت ہے تمہاری۔''
''میں بیٹا تھا ان کا مجھے بچپن میں ضرورت تھی ان کی۔''
''وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں عدنان۔''
''ان کی طرف سے صفائیاں نہ دو تم۔''
''کاش میری ماں نے یہ سب نہ کیا ہوتا تو کم از کم ایک باپ اور بیٹے کے درمیان کا تعلق نفرت اور حسرت کی نظر نہ ہوتا، میں خود کو بھی ذمہ دار سمجھتی ہوں اس سب کا، امرت میں نہیں چاہتا کہ ہمارے تعلقات پھر کسی اختلافی رویے کی نظر ہو جائیں۔''
''میں بھی یہ نہیں چاہتی عدنان مگر......''
''تو پھر چھوڑ دو ساری باتیں۔'' اس نے گاڑی کسی بک شاپ کے سامنے روکی تھی۔
اسے کتابیں خریدنے کا چسکہ کب سے پڑ گیا، وہ بڑبڑائی۔
''نیچے اترو گی؟'' وہ اس کی طرف کھڑکی پر جھک کر پوچھنے لگا، وہ نیچے اتر آئی۔
''اندر آ جاؤ۔'' وہ اسے ساتھ لے کر بک شاپ کے اندر آ گیا، ایک ڈائری لی سنہرے کور والی، پین لیا اور رنگوں اور برش کا سیٹ۔
''میں اب بچی نہیں ہوں عدنان یہ کیا چیزیں لے رہے ہو؟''
''ڈائری صرف بچے نہیں لکھتے، بلکہ بچے لکھتے ہی نہیں ہیں، ایک تم ہی بچپن سے عادی تھیں۔''
''مگر کلر پینسلز، پین برش؟''
''تم بہت اچھے اسکیچ بناتی تھیں، میں نے بہت کوشش کی نقل مارنے کی مگر نہیں مار سکا، پتہ ہے ایک پوسٹر کو چرا کر میں اپنے نام سے لے گیا تھا ماسٹر جی کے پاس اور اس پر مجھے ایکسیلینٹ ملا تھا، وہ ابھی تک میرے پاس پڑا ہوا ہے۔'' وہ کتابوں کے درمیان آ کھڑا ہوا اور شاعری کی کتابیں دیکھنے لگا تھا۔
''میں اب شاعری نہیں پڑھتی عدنان۔''
''اچھا...... چلو ایک کتاب لے لیتے ہیں تمہیں امجد اسلام امجد اور شیخ ایاز پسند ہیں نا۔'' اس نے دو کتابیں لے لیں۔
''ایک اور ناول لے لیں؟ کہانیوں کی کتاب؟''
''نہیں عدنان، پاگل ہو گیا، میں اب کہاں پڑھتی ہوں، نالائق ہو گئی ہوں۔''
''رہنے دو، اب پڑھ لینا۔'' وہ دو چار موٹی موٹی کتابیں لے کر شاپ سے باہر آیا اب اس کا رخ کسی اور طرف تھا۔
''اب کہاں جا رہے ہو؟''
''ایک کام ہے تم بیٹھو گاڑی میں، میں آتا ہوں۔'' وہ کتابیں کلرز سٹیشنرز لے کر گاڑی میں آ بیٹھی تھی، وہ عجیب خوشی سے ان ساری چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔

اسے گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہو گئے، فون بھی گاڑی میں چھوڑ گیا تھا، وہ گاڑی سے نکل کر اردگرد دیکھنے لگی۔
''کہاں رہ گیا یہ عدنان۔'' کچھ دیر میں وہ سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا تھا۔
''کہاں رہ گئے تھے؟''
''کیوں تم پریشان کیوں ہو رہی ہو، کوئی تنگ کر رہا تھا کیا راستے میں؟'' اس کے ہاتھ میں ایک باکس تھا، وہ کہتے ہوئے بیٹھ گیا تھا۔
''نہیں بچی نہیں ہوں میں، وہ دور گزار آئی، اب ڈھیٹ ہو گئی ہوں۔'' وہ بیٹھ گئی۔
''یہ دیکھو، تمہاری گھڑی ایک بار میں نے بالکونی سے نیچے پھینک دی تھی، ویسی تو نہیں ملی، مگر یہ بھی اچھی ہے۔'' وہ ایک پرانے ماڈل کی گھڑی لے آیا تھا۔
''عدنان، میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں؟''
''سوچنا بھی مت، ایسا کہنے کے لئے۔''
''ویسے ایک بار تم نے مجھے بھی اس بالکونی سے گرانے کی کوشش کی تھی یاد ہے؟'' وہ مسکرائی گھڑی دیکھتے ہوئے۔
''ہاں یاد ہے، تب تمہیں حنان نے بچایا تھا۔''
''اب جب وہ تمہیں بالکونی سے گرانے کی کوشش کرے گا تو یقین جانو میں پہلے سے بچانے کے لئے کھڑا رہوں گا۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہنے لگا، وہ اس کی بات پر بے ساختہ ہنس دی۔
''اب تو میں قدرے شوق سے گروں گی۔''
''نہیں...... ہرگز نہیں۔'' وہ بے ساختہ کہتے ہوئے ہنسا تھا۔

☆☆☆

بھانواز کچھ دن بعد اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے آ گیا تھا۔
''امر کیسی گزر رہی ہے؟'' وہ اس کے انتظار میں کب سے بیٹھا ہوا تھا، امر نے ساری درگاہ کے احاطے میں رکھے ہوئے مٹکے خود بھرے تھے، صفائی کی تھی صحن کی اور اب منہ ہاتھ دھو کر کھانا لے کر آ بیٹھی تھی۔
''تم نے تو بہت سارے کام سنبھال رکھے ہیں امر کلہ۔''
''جب تک کوئی بڑا کام نہ مل جائے سوچا ہے چھوٹے چھوٹے کام ہی کر لوں۔''
''تمہیں کسی بڑے کام کی تلاش کیوں ہے امر؟''
''سوچ رہی ہوں رستہ کہاں ہوگا، وہ ملے تو منزل کی جستجو ہوتی ہے، زندگی کا گولہ ایک محدود دائرے میں رقص کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔'' وہ سوکھی روٹی کا ٹکڑا چباتے ہوئے بولی۔
''زندگی کا گولہ رقص کر رہا ہے، یہ کافی ہے نا، زندگی کے گولے سے دائرے سے باہر جھانکنے کے خواب دیکھنا چھوڑ دو امر، میری پیاری بہن، زندگی میں سب کچھ انہونا نہیں ہوتا اسباب ممکن کرنے کی کوشش کرو اور اپنے اندر کے حوصلے کو ذرا اور ہوا دو، بس کچھ اور ہوا، آکسیجن ملنے کے لئے

جو کافی ہو، اتنی گنجائش پیدا کر لو گی تو مشکل کو ایک حل مل ہی جائے گا۔"
"کبھی سوچا ہے بھانواز کہ کتنی خوبصورت باتیں کرتے ہیں آپ؟ زندگی سے بھرپور، ایک ایسا شخص جس کی زندگی میں بظاہر تانگے کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا، بس ایک بھانواز ایک اس کا گھوڑا اور گھوڑے کا تانگہ۔" وہ کہتے ہوئے مسکرا دی۔
"امر تمہیں اندازہ نہیں تم مجھے کتنی عزیز ہو گئی ہو، بہت سوچنے لگا ہوں تمہارے لئے، کل سوچ رہا تھا کہ کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر تمہاری شادی نہ کروا دوں؟"
"مجھے پتہ ہے یہ دو دن آپ نے کسی فضولیات کی نظر کیے ہوں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے ہنس دی تھی بے ساختہ۔
"کتنا کم ہنستی ہو اور کتنا اچھا ہنستی ہو۔" وہ چھوٹے چھوٹے نوالے لیتے ہوئے کھانے لگا۔
"آپ کو لڑکیوں کی تعریف کرنے کی اچھی خاصی پریکٹس ہو گئی ہے، اب میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگلے دو دن تک کوئی فضولیات ہونی چاہئیں، آپ کے لئے کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر شادی کروا دوں؟ کیا خیال ہے؟"
"خیال تو بہت اچھا ہے مگر مجھ کنگال سے شادی کرے گا کون؟" وہ بڑے دنوں بعد موڈ میں آیا تھا۔
"سوچتے ہیں، کوئی نہ کوئی تو ہو گی نا۔"
"تم میرے لئے سوچو، میں تمہارے لئے کچھ کرتا ہوں۔" وہ پرسوچ انداز میں بولا۔
"بھانواز۔" وہ کھاتے ہوئے چونکی۔
"کیا ہوا بابو؟" وہ بچوں کو پیار سے ایسے بلاتا تھا۔
"آپ نے میری یہاں موجودگی کی کس کو اطلاع دی ہے؟" وہ کھاتے ہوئے رک گیا۔
"جھوٹ نہیں چلے گا نہ بہلاوہ۔"
"میں نے اطلاع دینے کی کوشش کی تھی امر، مگر اطلاع دینے میں ناکام ہوا، اگر اطلاع ٹھیک طریقے سے پہنچی ہوتی تو مجھ سے دوبارہ رابطہ کیا جاتا۔"
"اطلاع پہنچ گئی ہے بھانواز۔"
"تمہیں کیسے پتہ امر کل؟"
"خواب آیا تھا، مجھے ایک رات پہلے، کہ کوئی میری تلاش میں یہاں تک آ لگا ہے۔"
"اس کے بعد؟ کون آیا ہے علی گوہر؟" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔
"علی گوہر، آپ نے علی گوہر کو اطلاع پہنچائی تھی؟" اس کا نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔
"کوشش کی تھی امر، مگر...... اس سے بات نہیں ہو سکی، میری آواز وہاں نہیں جا رہی تھی۔"
"آپ کی یہاں موجودگی کا جب اسے پتہ ہے تو آپ کے رابطے پر تو یقین آ گیا ہو گا اسے۔"
"نہیں امر یقین کرو اسے یقین نہیں آیا، ہاں شک ضرور ہوا ہو گا، اگر یقین آ جاتا اسے تو بیچ میں ہفتہ نہیں پڑ جاتا وہ اسی دن یہاں ہوتا۔"

''تو پھر کون آرہا ہے؟'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔
''تمہیں کس کا انتظار ہے؟'' وہ پھر سے کھانے لگا کھانا۔
''میں نہیں جانتی۔'' اس کے چہرے پر دو لمحوں کے لئے وہی الجھن چھا گئی تھی۔
''جو آرہا ہے اسے آنے دو، تب کی تب دیکھ لیں گے۔'' اس نے آخری نوالہ لیا سامنے دیکھتے ہوئے، جو لوگ اس کے تانگے میں سفر کر کے یہاں تک آئے تھے، اب ان کو گھر تک پہنچانا بھی تھا، وہ آدمی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اٹھا تھا۔
''آپ رات تک آجائیں گے نواز بھا۔'' وہ برتن سمیٹتے ہوئے اٹھی۔
''رات کے کسی بھی وقت آجاؤں گا، تم پریشان نہیں ہونا، اپنا دھیان رکھنا۔''
''آپ کا انتظار کروں گی میں۔''
''نہیں امر، انتظار بری چیز ہے، پھر تو رات بہت دیر سے آئے گی تمہارے لئے۔''
''اس سے وقت کی قدر ہوتی ہے، پھر ساری عمر یہی تو کیا ہے۔''
''اپنے آپ کو کسی کام میں الجھا لینا امر۔'' وہ کہتے ہوئے فکر مندی سے آگے کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

''مجھے پتہ ہے جوانی میں غصہ بہت آتا ہے، تم نوجوان ہو، اس لئے تم غصہ کرو، جی بھر کر کرو، میں کروں گا تو تم اسے میری کم عقلی کہو گی، بڑھاپا کہو گے جس کا دوسرا نام بچپنا بھی ہے اور پھر میں غصہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں، اسی لئے کسی نالائق شاگرد کی طرح بیٹھا ہوں، ایسا شاگرد حالی جو لاکھر کا پیاں بھرنے کے بعد بھی اپنے استاد محترم کو مطمئن نہیں کر پاتا، بدقسمتی سے وہی شاگرد ہوں میں۔'' وہ کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، دونوں ٹانگوں کو ڈھیلا چھوڑ کر اور دونوں بازو سینے پر باندھے، گردن ٹیڑھی کر کے قدرے معصومانہ انداز میں اسے دیکھنے لگے تھے۔
''آپ کا یہ گر ہے کہ آپ کو بولنا آتا ہے، لفظ گھڑنے آتے ہیں، الو بنانا آتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے حالی کی چہرے کے تاثرات اور بھی سخت ہو گئے تھے، گردن اکڑی ہوئی۔
دونوں ٹانگوں پر زور دیئے کھڑا ہوا، کھڑکی کے ساتھ، ان نگاہ بے طرح ڈال دی ابے پر اور پھر کھڑکی سے باہر تک گئی جہاں سورج آگ کا سرخ گولہ بنا ہوا ڈھلنے کی تیاری پکڑ رہا تھا۔
''دنیا کی ہر چیز کو اپنے کام دھندوں کی فہرست دی گئی ہے، اپنے مدار میں ہر چیز گھومتی ہے، ایک انسان ہے جسے اپنی منزل خود طے کرنی ہے، خیر سے شر، شر سے خیر کے اندر کتنے مسائل جنم لیتے ہیں۔'' یہ سوچتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سورج کے سرخ گولے پر نگاہ پڑی، امر کلہ کی کہانیوں میں سورج کے سرخ گولے کی بہتات ہوتی تھی، وہ اب بھی اس منظر پہ رکا تھا۔
وقت کی سوئی ایک ہی جگہ نہیں اٹکی تھی، بلکہ اس کی اٹک گئی تھی، مگر کہاں اور کس جگہ اس کا تعین بھی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔
ذکار حالی کے چہرے پر لکھے تاثرات تو نہ پڑھ سکتا تھا مگر اس کے چہرے کے تاثر میں لکھی الجھن ضرور پڑھ سکتا تھا۔

''حالی میرے یار، مجھے ڈھکوسلہ سمجھتا ہے تو سمجھ مگر، مگر خود کو ڈھکوسلہ نہ سمجھ، حالی الجھنا چھوڑ دو، چھوڑنے کا سوچ رہے ہو مجھے حالانکہ مجھ سے زیادہ تو ان الجھنوں نے ستا کر رکھا ہے تمہیں۔'' وہ اسی طرح کھڑا تھا، سورج کا گولہ پوری طرح ڈوب گیا۔

وہ اپنے سارے احساسات برف کے سپرد کر کے آیا تھا، موسم کی ٹھنڈ اس کے دل ذہن دماغ پر برف کی طرح جم گئی تھی، بڑی خاموشی سے کھڑا تھا اور کچھ جیسے بولنے کے لئے نہیں تھا۔

''تم پر اپنے حق کھونے لگا ہوں حالی، بہت کمزور ہو گیا ہوں، بڑھاپے جتنا کمزور ہو گیا ہوں (خود پر اختیار کھو کر جب انسان روتا ہے تو ایسا لگتا ہے) جیسا فنکار لگ رہا تھا۔''

روتا ہوا بڑھاپا کیسا کمزور دکھتا ہے، یہ کوئی سامنے کھڑے پہاڑ جیسے حالار سے ہی پوچھ لیتا۔

پہاڑ ٹھٹھرنے لگا، فروری کے درمیانے موسم میں ٹھٹھرنے لگا تھا درخت آہستہ آہستہ خزاں رسیدہ ہو کر بکھرنے لگا، اندر ہی اندر جیسے بکھراؤ ہو رہا تھا، خزاں سردیوں کو ڈھانپ رہی تھی، پہاڑ پیروں میں گر گیا، گھٹنے پر جھک گیا، ریت کے ڈھیر کو چومنے لگا، حالار ابے کے سامنے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

''محبت تیرے کیا کہنے، تو ایسی حرارت ہے جو پگھلا دیتی ہے، موم کر دیتی ہے، موم کر کے جلا دیتی ہے، جلا کر کندن کر دیتی ہے۔'' وہ پگھل گیا ابے کے آنسوؤں نے موم کر دیا، غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، پانی کی طرح بہہ گیا۔

''بس چلے تو آپ کا ہر زخم بھر دوں، دھو دوں، صاف کر دوں، مٹا دوں، مگر ابا حالی بہت مجبور ہے، حالی تو خود بہت کمزور ہے۔'' ہمالیہ پوری طرح ڈھے گیا تھا، ابے نے حالی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

''کچھ نہ دے سکا تجھے میں سوائے سوچوں کے، مشکلوں کے، پریشانیوں کے، کچھ نہ بچا سکا تیرے لئے، تیرے مستقبل کے لئے لوگ تو اپنے بچوں کے لئے محل بناتے ہیں، میں تو گھر بھی نہ بنا سکا، میں نے تیرے لئے صرف محرومیاں، تلخیاں رکھ چھوڑیں، زندگی تنگ کر دی تجھ پر، تیرے پھول جیسے ہاتھ نرم ہاتھ محنتیں کر کر کے سخت ہو گئے۔'' وہ حالی کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولے، لہجے میں دکھ تھا، افسوس تھا، احساس تھا، لہجے میں کیا نہ تھا، لہجے میں سب کچھ تھا۔

☆☆☆

عدنان اسے شام تک گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا، دروازے سے باہر ہی چلا گیا، وہ بہت سے تھیلے تھامے اندر آئی۔

''وہ نہیں آیا نہ، مجھے پتہ تھا، پتہ تھا وہ نہیں آئے گا وہ اپنے مقصد کا ہے، مقصد پورا ہوا بس۔'' وقار نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا تھا اسے اکیلا آتے دیکھ کر۔

''مگر ایک حیران کن بات ہے وہ یہ کہ ہم نے لنچ آج ساتھ کیا ہے شام کی چائے بھی اور آفس سے واپسی پر لطیف ڈیری سے ربڑی بھی دلائی اور آئس کریم بھی لے آیا۔'' وہ بڑی آسائمنٹ سے بتا رہی تھی اور صنوبر بیگم حیرانی سے سن رہی تھیں، انہیں لگا امرت مذاق کر رہی ہے شاید۔

''تمہارے ساتھ اس کا رویہ شاید تمہاری اتنی محنت سے ہی ٹھیک ہوا ہے، تم اس کے لئے لڑی ہو بغیر کسی مقصد کے بغیر کسی منطق کے، میں نے سوچا تھا وہ جاتے جاتے تم سے معافی تو مانگ ہی لے گا اس نے اپنی کی ہوئی زیادتیوں، لڑائیوں، جھگڑوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔'' وقار صاحب کچھ مطمئن تو ہوئے تھے۔

''ہر کوئی مفاد پرست ہوتا ہے، اپنا مطلب نکال کر خوش ہوگا، اب اس لئے بیٹا بول لیا اور تم ہو گئیں خوش، صنوبر بیگم تھیں جن کو عدنان کی شکل تک پسند نہ تھی۔'' وقار بہت تیکھے انداز میں گھورنے لگے تھے انہیں۔

''کیا؟ جو دل میں ہے وہ کہہ دیں۔'' وہ کڑھتے ہوئے بولیں۔

''اب آپ دونوں لڑنا شروع کر دیجئے گا۔'' اس سے پہلے وقار کچھ کہتے وہ بول پڑی، وہ دونوں ایک دوسرے کو ایسے ہی دیکھنے لگی تھی۔

اس نے اس سین سے خود کو غائب کرنا ہی بہتر جانا اور چیزیں لے کر کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

وقار صاحب بے ساکھی کے سہارے کمرے کی طرف چلے گئے اور صنوبر بیگم کڑھتی سر جھٹکتی کچن کی طرف چلی گئیں، جہاں راشن کے کیبنٹ میں ادھ کھلے ورق کی ڈائری سسک رہی تھی اور بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

راشن کے کیبنٹ کے اوپر بنے ہوئے لکڑی کے سلیب کی درزوں سے کئی چیزوں کے قطرے پاؤڈر نیچے اس ادھ کھلے صفحے کو داغ دار کرتے ہوئے کئی قیامت ڈھا رہے تھے۔

☆☆☆

''میرے پاس جو عظیم دولت ہے ابا، وہ دولت تیری محبت ہے اور یہ محبت میرا سرمایہ حیات ہے، آپ میرا سرمایہ ہیں، سمجھ نہیں پاتا کہ کیسے دور کروں یہ ساری تکلیف، بہت مشکل ہے مگر ممکن کرنے کے لئے جانے کیا کرنا پڑے، میں جب آیا تھا تو سوچا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، ابا کی اداسی ختم ہو جائے گی، وہم دور ہو جائے گا مگر مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہاں اداسی اور وہم سے زیادہ بڑے مسئلے ہیں، مسئلے سمجھ سے باہر ہیں۔''

''نہ سوچ مسئلوں کا، بس آ ؤ اس وقت کو محفوظ کر لیں، حالی بہت غلطیاں کر دی ہیں میں نے، ساری زندگی لور لور پھرا ہوں، تھک گیا تھا، پھر تنہائی بھی اتنی کہ بزدل ہو گیا، زندگی کی جنگ میں، بہت کچھ کھو دیا حالی، بہت زیادہ، اب کھونے کے لئے کچھ نہیں بچا، تمہیں کچھ بتانا ہے، بلکہ بہت کچھ، بہت لمبی کہانیاں سسک رہی ہیں، مگر ابھی چلو۔'' وہ اس کے کندھے کا سہارا لے کر اٹھ گئے۔

''چل حالی نماز کے لئے مسجد جاتے ہیں۔''

''پتہ ہے ابا، وہ دن ضرور آئے گا، جب دل کی صفائی ہو گی، زخم دھل جائیں گے، روح اجلی ہو جائے گی اور وہ دن موت کا نہیں ہو گا، بلکہ وہ زندگی کا ہو گا، خوبصورت ترین دن، چلیں ابا یار اسی دن کے انتظار میں جیتے ہیں، بہت جی لئے آپ موت کی تمنا میں، اب زندگی کی بات کر کے دیکھ لیتے ہیں۔''

امید رنگین تتلیوں کی طرح جگمگاتی تھی، امید محبت کے ساتھ دوستی کرلے تو امید بہت اچھی ہو جاتی ہے اور محبت بھی، یہ ساری باتیں ان سے ان کی محبت کروا رہی تھی۔

☆☆☆

چیزیں وہیں بیڈ پر رکھ کر اس نے سیل فون چارج پر لگایا جو کئی گھنٹوں سے بند تھا اور پھر چائے بنانے کے لئے کچن میں آ گئی، کیبنٹ کے اوپر بنے سلیب کی صفائی کرتے ہوئے اسے ذرا احساس نہیں ہوا کہ کیچپ اور مصالحوں کے ذرے قطرے نیچے گر کر کیا نقشے مچا رہے ہیں، چائے کا ارادہ ایک طرف رکھ کر کافی کی نیت سے اس نے نچلا کیبنٹ کھولا تھا۔

کھولا ہی تھا کہ دنگ رہ گئی، سب سے آگے سسکتی ہوئی عمر رسیدہ کالی چادر اوڑھے، کانپتی بڑھیا جیسی ڈائری اسی احساس سے کانپ رہی تھی، سسک رہی تھی، ادھ کھلے صفحے پر کیا ہی ستم ڈھائے گئے تھے، کسی کی یادوں کی چنگاریوں پر مصالحوں کا چھڑکاؤ اور کیچپ ساس کا پینٹ بے ترتیبی سے پھیلا تھا۔

اس کے کانپتے ہاتھوں نے ڈائری اٹھالی، الماری کی تجوری سے کچن کی تجوری کا سفر خود بول رہا تھا، بلکہ چیخ رہا تھا۔

کانپتے ہاتھوں سے ڈائری تھامے دو لمحے کا سکتہ کافی تھا، اس کے بعد اس کی چیخ و پکار احتجاج کی صورت پورے گھر میں پھیل رہی تھی اور ہاتھوں میں سسکتی ہوئی ڈائری اپنی کہانی خود سنا رہی تھی۔

صفحہ تھا نمبر چار
تاریخ تھی بائیس جون
وقت تھا رات کا
اور کہانی تھی اس لمحے کی

(جاری ہے)

''مبارک باد''

ہر دلعزیز مصنفہ فرحت عمران کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نوازتے ہوئے پیاری سی بیٹی عطا کی ہے، جس کا نام اریشا عمران رکھا گیا ہے ادارہ حنا کی طرف سے فرحت عمران کو دلی مبارک باد۔

ہار یا جیت

روبی ایپا کے پاس اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے گئی تھی مگر لوٹی تو دل و دماغ پر دوگنا وزن تھا، ایپا نے اس کی کلاس لے کر ہزاروں خطائیں گنوادی تھیں۔

''تم تو ہو ہی بے وقوف، کتنا سمجھایا تھا تمہیں کہ یوں اس کی ہر بات میں جی حضوری نہ کرو، تم نے خود ہی اس کے سامنے اپنی ذات کو بے وقعت کیا ہے، اس لئے آج وہ تمہاری ذات کو فراموش کر کے اس طرح کی حرکتیں کر رہا ہے، تم نے خود ہی اس کو سر چڑھایا ہے، اب بھگتو۔'' شائستہ ایپا سخت غصے میں تھیں۔

''ایپا پلیز، اس طرح تو نہ کہیں، شوہر کا ایک مقام ہوتا ہے، میں نے تو وہی کیا جو ایک اچھی بیوی کو کرنا چاہیے اور آپ نہیں سنیں گی تو کس سے کہوں گی دل کی بات۔'' وہ روہانسی ہونے لگی تو ایپا کو اس پر ترس آ گیا، انہوں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔

''شوہر کے مقام و درجے سے مجھ کب انکار ہے پگلی، مگر اس چیز کو اتنا سر پر سوار کر لینا کہ خود اپنی ذات کی نفی ہو جائے، یہ خود اپنے ساتھ ہی ظلم ہے، زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے، ان مردوں کی تو نیچر ہی ہوتی ہے ادھر ادھر منہ مارنے کی، تمہیں شروع سے ہی اس پر سخت چیک رکھنا چاہیے تھا۔'' ایپا کی بات پر وہ سوچ میں پڑ گئی، سچ ہی تو تھا کہ اس نے کبھی دھیان کے معمولات کی کوئی خبر نہ رکھی تھی، دیر سویر پر بھی وہ جو بھی بہانہ گھڑتا وہ من وعن اس پر یقین کر لیتی۔

''اور ذرا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر غور سے اپنا حلیہ دیکھو کون کہے گا کہ تمہاری شادی کو صرف پانچ ماہ ہوئے ہیں، شادی کے سارے زیورات، لباس سینت کر رکھ دیئے ہیں، سنگھار سے تمہیں خود چڑ ہے تو گھر کا مرد باہر دلچسپیاں کیوں نہ ڈھونڈے گا، ارے وہ ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا ہے، ایک سے ایک طرح دار ماڈرن لڑکیاں دیکھتا ہو گا اور گھر آ کر تمہارا روکھا پھیکا حلیہ، اوپر سے کنیزوں جیسی جی حضوری، روبی میری بہن، آج کل مرد تابعدار بیوی کو بے وقوف سمجھتا ہے، اسے تو شانہ بہ شانہ چلنے والی عورت میں ہی کشش نظر آتی ہے۔'' ایپا نے اسے خاموشی سے فکر میں غلطاں دیکھا تو اس کی سوچ کا زاویہ درست کرنے کی ایک اور کاوش کی اور ان کی توقع کے مطابق تیر نشانے پر بھی لگا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ایپا، مگر آپ کو تو پتہ ہے میں شروع سے ہی سادگی پسند ہوں، اوپر سے آج کل تو طبیعت ہی عجیب گری گری رہتی ہے۔'' روبی نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاں سو تو ہے مگر بی بی یہ وقت تو سب عورتوں پر ہی آتا ہے، مگر سب تمہاری طرح سر جھاڑ، منہ پھاڑ نہیں پھرتیں، خیر اب تو ذہن پر مزید بوجھ نہ ڈالو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا، تم آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھو، میں تمہارے لئے جوس لے کر آتی ہوں۔'' ایپا اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا اور کچن کی جانب چلی گئیں۔

تو وہ سر بیڈ کے سرہانے رکھے تکیہ پر ٹکا کر ایک بار پھر ایپا کی باتوں پر سوچ بچار کرنے لگی ایپا کی باتیں اپنی جگہ سو فی صد درست تھیں مگر ریحان نے کبھی اپنے رویے سے بھی اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اسے نظر انداز کر رہا ہے یا اس میں دلچسپی نہیں رکھتا، بلکہ اس کی پریگنینسی کی بات تو وہ اور زیادہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا اگر وہ یہ بات ایپا سے کہتی تو ان کا موڈ مزید بگڑ جاتا، وہ اس معاملے میں زیادہ پر جوش یوں بھی تھیں کہ وہ روبی کو دل و جان سے چاہتی

تھیں اور ریحان سے اس کا رشتہ انہی کے توسط سے ہوا تھا، روبی اور ریحان کی شادی مکمل ارینج میرج تھی، ریحان ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں منیجر تھا اور اس میں ہر وہ خوبی تھی جو ایک معقول رشتے میں ہونی چاہیے، اپیا کو سب سے پہلے روبی کا ہی خیال آیا تھا، پھر وہ ریحان کے والدین کے ہمراہ، ریحان کو بھی اپنے میکے لے کر آئی تھیں، جہاں صبیح رنگت اور دلکش خدوخال کی مالک روبی پہلی ہی نظر میں ریحان کے والدین کو ہی نہیں، بلکہ ریحان کو بھی بھا گئی تھی۔

بس پھر چٹ منگنی پٹ منگنی والا معاملہ ٹھہرا تھا، ارینج میرج میں تو یوں بھی ایک دوسرے کے مزاج کی پرتیں آہستہ آہستہ کھلتی ہیں، روبی ایک سادہ مزاج مکمل گریلو لڑکی تھی، جس نے ایک وفا شعار بیوی کی طرح کچھ ہی دنوں میں خود کو ریحان کی پسند اور مزاج کے مطابق ڈھال لیا تھا، ادھر ریحان بھی اک بے حد محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا تھا اور شاید سب کچھ یوں ہی ٹھیک ٹھاک چلتا رہتا، اگر ریحان کے معمولات اسے شک و شبے میں مبتلا نہ کرتے اور جب انسان کا دل و دماغ کسی ایک نکتہ پر متفق ہو جائیں تو ہر خیال پھر اسی جانب چلا جاتا ہے اور اسی شبے کی تقویت کا باعث بنتا ہے، یہی روبی کے ساتھ ہوا تھا، اس نے ریحان کے معمولات نوٹ کرنا شروع کیے تو دیکھا کہ موبائل میں اس کی دلچسپی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے، نا صرف یہ بلکہ وہ اپنے موبائل کی چیل کی طرح چوکیداری کرتا، وہ ٹی وی دیکھ رہا ہوتا، کھانا کھا رہا ہوتا یا کوئی بھی اور کام، موبائل کو پل بھر کے لئے خود سے جدا نہ کرتا، اب اس کے موبائل پر مسڈ کالز بھی کثرت سے آنے لگی تھیں، جس کے جواب میں وہ فوراً مسکراتا ہوا کسی گوشہ میں موبائل لے جا کر چپکے چپکے باتیں کرتا، اکثر کال ریسو کرنے کے بعد گھر سے نکل پڑتا اور رات گئے لوٹتا اور روبی کے استفسار پر ٹال جاتا یا بہانے بازی کرنے لگتا، روبی نے محسوس کیا وہ اچانک بہت خوش رہنے لگا تھا، اکثر زیر لب مسکراتا رہتا یا بادسانگ کرتا اور گنگناتا رہتا، اکثر صبح بن سنور کر گھر سے نکل جاتا اور کئی کئی گھنٹے بعد لوٹتا، ایسے میں اگر روبی اسے کال کر لیتی تو وہ کال ڈراپ کر دیتا اور یہ تمام عوامل ہی اس کے شبہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جا رہے تھے، تب ہی اس نے اپیا سے تمام صورتحال ڈسکس کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس نے ریحان سے کہا کہ وہ صبح آفس جاتے ہوئے اسے اپیا کے گھر ڈراپ کر دے، ایسا عموماً ہی ہوتا ہے کہ وہ آفس جاتے ہوئے اسے اپیا کے گھر ڈراپ کر دیتا اور واپسی میں پک کر لیتا، ہمیشہ وہ واپسی پر کافی فریش ہوتی، اپیا کے بچوں کے ساتھ کھیل کر دل بھی بہل جاتا، مگر آج اس کے دل و دماغ کا بوجھ کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا تھا، گو کہ اپیا کی باتیں کچھ ایسی غلط بھی نہ تھیں، شاید اسی کو ریحان کو مٹھی میں رکھنے کا فن نہیں آیا تھا، اپیا تو اسی وقت ریحان کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کو تیار ہو گئی تھیں مگر وہ جانتی تھی کہ محض شک و شبے کی بنیاد پر ریحان سے بازپرس کرنا مناسب نہیں ہوگا، اسے اندازہ تھا کہ بات کھل جانے پر مرد اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں ایسے میں اگر وہ کھل کر من مانی کرنے لگا یا ضد میں آ کر کسی اور انتہائی قدم کا ارتکاب کر بیٹھا تو اس کی اپنی زندگی برباد ہو جاتی تھی کیونکہ بہر کیف غلطی مرد کی ہو یا عورت کی، خسارہ ہمیشہ عورت کے حصے میں ہی آتا ہے، سو اس نے ریحان سے روبرو بات کرنے کا فیصلہ تو ترک ہی کر دیا، البتہ اپیا کے ہی کہنے پر اس نے ریحان کی اس ڈھکی

چھپی روش کے عقب میں چھپے حقائق تک پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا، واپسی پر وہ معمول کے برعکس بالکل خاموش تھی، ریحان نے ایک دوبار اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ ہوں ہاں کر کے ٹال گئی۔

پھر آخر ایک دن اس کو موقع مل ہی گیا، ریحان باتھ لے رہا تھا اس نے چپکے سے ریحان کے موبائل کو چیک کیا، ان باکس میں کچھ دوستوں اور رشتے داروں وغیرہ بھیجے گئے میسج تھے، وہ میسج بھی زیادہ تر لطائف اور اقوال زریں کے فارورڈ میسجز میں سے ہی تھے، سینٹ آئٹمز میں بھی ایسی کوئی قابل گرفت چیز نہیں تھی، پھر اس نے کانٹیکٹ لسٹ پر نظر دوڑائی تو کسی انجان یا غیر عورت کا نام بھی نظر نہیں آیا، اس نے خاموشی سے موبائل اسی جگہ پر رکھ دیا، جہاں ریحان رکھ کر نہانے گیا تھا اور پھر اپنے معمولات میں مصروف ہو گئی، مگر ریحان کے آفس کے جاتے ہی اس نے فوراً اپیا کا نمبر ملایا اور اپنی تازہ ترین کارگزاری سے آگاہ کیا، مگر اپیا نے ایک بار پھر اسے اندیشوں میں مبتلا کر دیا۔

''زیادہ خوش فہمی میں نہیں رہو لڑکی، ممکن ہے ریحان وہ میسج فوراً ہی ڈیلیٹ کر دیتا ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ کانٹیکٹ لسٹ میں لڑکی کا نام اسی کے نام سے سیو ہو، یہ شادی شدہ مرد بڑے شاطر ہوتے ہیں، گھر والی اور باہر والی کو ایک ساتھ چکمہ دینے کے ماہر، تم آنے والی مسڈ کالز پر نظر رکھو اور ان نمبرز کو نوٹ کر لو۔'' اپیا نے اسے نئی ہدایات دیتے ہوئے فون آف کر دیا اور وہ جو واقعی خوش فہمی میں مبتلا ہونے لگی تھی ایک بار پھر شش و پنج میں پڑ گئی، اپیا کی باتوں کے بعد اس کے شک کو مزید تقویت ملی تو وہ ایک بار پھر سے موبائل کی تاک میں لگ گئی، اب کی بار اس نے

پلان کے عین مطابق سب سے زیادہ آنے والی مسڈ کالز کے نمبر کو نوٹ کیا، وہ نمبر کسی عمران نامی شخص کا تھا، روبی نے جلدی سے وہ نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کیا اور پھر ریحان کے آفس جاتے ہی وہ نمبر اپیا کو فارورڈ کر دیا تاکہ وہ اس کی جانچ پڑتال کریں، جواباً اپیا کی کال دوپہر تک آئی جب اس کا دل انجانے خدشے کے پیش نظر بیٹھے جا رہا تھا، مگر اپیا کی کال نے اسے مزید حیران پریشان کر دیا۔

''روبی تو کسی ہارڈ ویئر شاپ والے کا نمبر ہے، اس نے تو خود ہی معذرت کر کے کال ڈراپ کر دی کہ باجی آپ نے رانگ نمبر ڈائل کر دیا ہے، مجھے تو اتنی حیرت ہوئی ورنہ آج کل یہ مرد بھلا اتنے شریف ہوتے ہیں، ارے یہ تو موقع کی تاک میں لگے رہتے ہیں کہ عورت کی آواز سنائی دے اور اسے دوستی کی آفر دینا شروع کر دیں، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ شرافت کسی کی میراث نہیں ہوتی بعض دفعہ تو کچھ عورتیں بھی ایسے فلرٹ کرتی ہیں کہ مردوں کو بھی مات کر جاتی ہیں۔'' اپیا حسب عادت بات سے بات نکالے جا رہی تھیں جبکہ روبی اس سوچ میں مبتلا تھی کہ جانے ہارڈ ویئر کو ریحان سے کیا کام پڑ گیا تھا جو وہ اتنی کالز کر رہا تھا، گھر میں بھی ایسا کوئی مرمت کا کام نہ ہو رہا تھا، اس کی مسلسل خاموشی کو نوٹ کر کے اپیا نے اسے ٹوکا۔

''روبی تم اس حال میں اتنا ٹینشن مت لو، ماں کے ڈپریشن کا بچے پر بھی منفی اثر پڑتا ہے، تم خود کو سنبھال کر رکھو، تم ہو تو یہ بچہ بھی ہے اللہ سے اچھی امید رکھو، جلد یا بدیر سچ سامنے آ ہی جائے گا، تم خود کو بلاوجہ سوچ سوچ کر ہلکان مت کرو، ہم سب ہیں ناں تمہارے ساتھ، پلیز ڈونٹ کیئر آف یور سیلف۔'' اپیا نے ہمیشہ کی طرح اسے

تسلی اور ہدایتیں دیتے ہوئے فون آف کر دیا، مگر وہ بچی تو نہ تھی کہ یوں بہل جاتی، شادی شدہ سمجھدار عورت تھی، گھر کا شیرازہ بکھرنے اور اپنی زندگی میں سوتن کی آمد کا خیال ہی اس کے لئے سوہان روح تھا، اوپر سے ایک واضح صورتحال اور اپیا کی باتوں نے ریحان کے بجائے خود اسے ہی کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا، اس نے اپنا محاسبہ شروع کیا تو اپنا دفاع کرنا مشکل ترین امر لگنے لگا، حقیقتاً وہ اپنی ذات سے لاپرواہ رہنے لگی تھی جب کہ ابھی گھر کی مخصوص ذمہ داریوں کے علاوہ کسی قسم کی ایکسٹرا ذمہ داریاں بھی نہ تھیں اور اب جب سے وہ امید سے ہوئی تھی اس نے خود پر اور بیزاریت طاری کر لی تھی۔

ایسے میں اگر کبھی ریحان اسے آؤٹنگ کا کہتا بھی تو وہ ٹال جاتی، شروع کے دنوں میں تو اکثر نیند کی زیادتی کا شکار رہنے لگی تو ریحان تو اس سے دو باتیں کرنے کو بھی ترس گیا، وہ اکیلا ہی ٹی وی کمپیوٹر کے آگے بیٹھا دل بہلانے اور وقت گزارنے کی کوشش کرتا مگر آخر کب تک، جب عورت ذات ہی گھر اور گھر والوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دے تو مرد کو تو بہانہ چاہیے آزاد ہونے کا۔

''اف اللہ میں کیا کروں؟'' سوچ سوچ کر اس کی کنپٹیاں دکھنے لگی تھیں، جب غلطی میری ہے تو سدھارنا بھی مجھ ہی کو ہو گی، اس نے گویا خود سے عہد کیا، اس نے روزانہ سر شام ہی اچھی بیویوں کی طرح بج سنور کر ریحان کا استقبال کرنا شروع کیا، وہ لاکھ تھکن کا شکار ہوتی مگر ریحان کہیں بھی ساتھ جانے کو کہتا تو وہ انکار نہ کرتا، مگر اسے اپنی کوششیں لاحاصل ہی لگیں شاید وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، ریحان کے معمولات میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا، بلکہ اس کی مشکوک سرگرمیاں تو دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھیں، وہ رات کو مزید دیر سے گھر آنے لگا تھا، وہ آتے ہی سو جاتا اور روبی سارے رات جیسے انگاروں پر لوٹتی رہتی، اس نے اپنے شک کو سچ ثابت کرنے اس کی درازیں والٹ کھنگالنا شروع کیے تو اسے ایک اور انکشاف نے ہلا ڈالا، اس نے آفس سے کافی بھاری اماؤنٹ کا لون لے رکھا تھا جبکہ آج کل وہ روبی کو اکثر ہاتھ روک کر خرچ کرنے کی ہدایتیں بھی دیتا رہتا تھا، اب تو جیسے شک و شبے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی اور اپیا نے تو جیسے اس کے خیال پر صدق کی مہر ثبت کر دی۔

''ارے ہاں تو ایسی عورتیں ڈائن ہوتی ہے، مرد کو کنگال کر کے ہی چھوڑتی ہیں۔'' اس کے بعد تو روبی کا سکون جیسے غارت ہو کر رہ گیا، وہ مزید چڑچڑی ہونے لگی، ریحان نے اس کے بدلتے مزاج اور کتراؤ کو نوٹ تو کیا مگر اس کی طبیعت کے باعث اگنور کر گیا، بلکہ اس نے الٹا اپنے تمام کام خود کرنا شروع کر دیئے، وہ اپنا ناشتہ خود بنا لیتا، کپڑے ڈرائی کلین میں دے آتا، دونوں میاں بیوی کو اپنے اپنے طور پر چپ سادھی ہوئی خاموشی نے دونوں کی مابین ایک سرد مہری کی فضا قائم ہو چکی تھی، شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ جذبوں کا اظہار کرتے رہنا چاہیے نہیں تو یہ رویوں کو منجمد کر کے رشتوں کو توڑنے کے بربا ہو جاتے ہیں، ریحان نے روبی کی خاموشی کا نہ کوئی نوٹس لیا نہ ہی اس کے معمولات میں کوئی تبدیلی آئی، اس کی موبائل میں دلچسپی برقرار تھی اور گھر سے دوری بھی، جبکہ روبی کوئی بات ثابت نہ ہونے کے باعث ریحان سے دوٹوک بات کرنے سے کترا رہی تھی، مگر شک کی ناگن نے اسے ڈسنا شروع کر دیا تھا تو زہر دل و جان میں پھیل کر اس کی

زندگی کو اذیت ناک بنا رہا تھا، گو کہ اپیا اس کی پل پل کی خبر رکھتیں تاہم اس کی زرد پڑتی رنگت کو دیکھ کر اس دن ان کا ضبط بھی دم توڑ گیا۔

"بس اب بہت ہو چکی، اب تم اپنا بوریا بستر سمیٹو اور میرے گھر چلی آؤ، اس ریحان کو سبق سکھانا لازمی ہو گیا ہے، تم کوئی اس کی نوکرانی ہو اور اگر وہ تمہیں نظر انداز کر رہا ہے تو تمہیں کیا ضرورت ہے اس کے گھر کی چوکیداری کرنے کی، اگر تم اس حالت میں یوں گھٹ گھٹ کر مر گئیں تو اس کا تو راستہ ہی صاف ہو جائے گا، بس میں آج ہی تمہارے بہنوئی سے بات کرتی ہوں، اب ساجد ہی نمٹیں گے ریحان سے، تم اپنا سامان پیک کرو، ہم شام میں تمہیں لینے آ رہے ہیں۔" اپیا نے گویا حکم دیا اور موبائل آف کر دیا تو روبی گہری سانس لے کر سوچ میں پڑ گئی۔

سچ ہو تو کہا تھا اپیا نے وہ دن بہ دن فرسٹریشن کا شکار ہوتی جا رہی تھی، اچھا تھا کہ یہ آنکھ مچولی ختم ہو اور معاملہ ایک طرف ہو جائے، وہ کوئی لاوارث تو نہ تھی کہ یوں کڑھ کڑھ کر ختم ہو جاتی اور نہ کوئی ان پڑھ جاہل گنوار عورت کہ چپ چاپ ریحان کو اپنی من مانی کیے دینے دیتی، سو اس نے جی کڑا کر کے اٹیچی کیس تیار کرنا شروع کر دیا، اسی شام اپیا اور ساجد بھائی ریحان کے آفس سے واپس آنے کے فوراً بعد آ گئے، ریحان انہیں یوں اچانک دیکھ کر تو نہیں البتہ روبی کی تیاری دیکھ کر ضرور ٹھنک گیا۔

"کیا بات ہے؟ تم کہیں جا رہی ہو؟" اس نے روبی سے پوچھا تو اس کے بجائے اپیا نے انتہائی رکھائی سے جواب دیا۔

"ہاں وہ اب یہاں نہیں رہے گی، جب اس کی یہاں کوئی قدر ہی نہیں، تو میں اسے یہاں رہنے نہیں دوں گی، ماں باپ نہیں، مگر میں ابھی زندہ ہوں۔"

"کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں، کیا ہو گیا ہے آخر، کوئی مجھے ٹھیک سے بتائے گا؟" ریحان ہنوز الجھن میں تھا۔

"بتاؤ گے تم میاں ہمیں کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟" اس بار اپیا کے شوہر ساجد تن کر ریحان کے سامنے آ کھڑے ہوئے، صاف لگ رہا تھا کہ اپیا نے خوب مرچ مصالحہ لگا کر انہیں تمام روائیداد سنائی ہے۔

"ساجد بھائی پلیز آپ تو پہیلیاں نہ بجھوائیں، روبی تم ہی کچھ بولو۔" ریحان حیران پریشان باری باری سب کے ستے ہوئے چہرے دیکھ رہا تھا۔

"وہ کیا بولے گی، تم نے اسے بولنے کے قابل چھوڑا ہی کب ہے۔" اپیا ایک بار پھر اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئیں اور پل بھر اس کی تمام کوتاہیاں گنواتی چلی گئیں، ریحان کی آنکھیں پہلے حیرت سے پھیلیں، پھر سکڑیں اور بالآخر وہ سر تھام کر شکستہ انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک کہا آپ نے، غلطی میری ہی ہے، صرف میری۔" ریحان کے اعتراف نے روبی کو سر تا پا ہلا کر رکھ دیا اس کے قدم لڑکھڑانے لگے، قریب تھا کہ وہ گرتی اپیا نے اسے تھام لیا۔

"کیوں کیا تم نے یہ سب؟" اپیا ابھی تک غضب ناک تھیں۔

"میں روبی کو صرف ایک سرپرائز دینے کے لئے غلطیوں پر غلطیاں کرتا چلا گیا۔" ریحان نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"سرپرائز؟ کیسا سرپرائز۔" ساجد بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

"روبی کا اپنا گھر، جو اس کی شدید خواہش اور اس کا خواب تھا۔" ریحان نے روبی کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی چونک گئی۔
''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''
''وہی کہہ رہا ہوں جو آپ سن رہی ہیں بیگم صاحبہ!'' اب ریحان مسکرا رہا تھا۔
''یاد ہے ہماری شادی کے بعد ایک بار تم نے کہا تھا کہ اپنا گھر تمہاری سب سے بڑی خواہش ہے، تو میں نے کمپنی سے لون لے کر اور کچھ پیسہ جمع کر کے تین کمروں کا چھوٹا مگر بے حد خوبصورت اپارٹمنٹ لیا ہے، جو تمہارے نام ہوگا، یہ اپارٹمنٹ میرے ایک کولیگ نے بک کروایا تھا مگر تھوڑے عرصے بعد اس کے باہر جانے کی سیٹنگ بن گئی تو اس نے سیل کرنے ارادہ ظاہر کیا تو میں نے لون لے کر اس سے گھر خرید لیا، بس اس اپارٹمنٹ میں ہی کچھ کام وغیرہ کروانے کے چکروں میں لگا ہوا تھا، ادھر تمہاری ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے سو میں نے سوچا کہ جلد یہ کام مکمل کروا کے اپنے گھر میں شفٹ ہو جائیں، میں تمہیں پورا فلیٹ تیار کرا کے اچانک وہاں لے جا کر کھڑا کرنا چاہ رہا تھا تا کہ تمہاری چہرے پہ آنے والی خوشی کی دھنک دیکھ سکوں، بس اسی لئے ذرا راز داری سے کام لے رہا تھا اور محترمہ ساری قیاس آرائیاں خود ہی کرتی چلی گئیں اور مجھ سے استفسار کی زحمت بھی گوارا نہ کی بلکہ میری زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ بھی کر لیا؟'' ریحان نے باری باری سب کو دیکھا تو ساجد بھائی نے اپیا کو دیکھا اور اپیا نے روبی کو اور روبی ریحان کے شانوں پر سر ٹکائے روتی چلی گئی، اپیا اور ساجد بھائی کچھ کہے بنا خاموشی سے سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گئے تو ریحان نے روبی کے رخسار کی تمام نمی اپنی انگلیوں کے پوروں میں جذب کرتے ہوئے کہا۔
''میری پیاری بیوی صرف محبت کا اظہار کرنے سے ہی محبت کا حق ادا نہیں ہوتا، بلکہ ایک دوسرے کی خواہشوں کا احترام کرنا اور ایک دوسرے پر اعتماد کرنا ہی زوجین کی محبت کا اصل تقاضہ ہے۔''
''اور میں دنیا کی ان خوش قسمت بیویوں میں سے ہوں جنہیں اپنے شوہر کی محبت حاصل ہے۔'' ریحان کے سینے سے سر ٹکاتے ہوئے روبی کا انگ انگ سرشار تھا۔

☆☆☆

خواب نگر کی تتلی

سونیا چوہدری

گل تم نے کبھی محبت کی ہے؟

بے پناہ ٹوٹ کر چاہنے والی محبت؟

کسی کے رنگ میں رنگ جانے والی محبت؟

اپنے نام کے ساتھ اس کا نام جڑا دیکھنے والی محبت؟

جیسے مجھے حیدر سے ہے..... میری زندگی کی سب سے پہلی اور آخری خواہش! ہاں گل میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔

حیا سکندر سے، حیا حیدر ہونے کی، حیدر کے سوا کسی دوسرے مرد کا گزر بھی میرے خیال سے نہ ہوا تھا، شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری نسبت بچپن سے ہی طے کر دی گئی تھی، میرے پیدا ہوتے ہی تایا ابا نے مجھے حیدر کے لیے منتخب کر لیا تھا، اس وقت حیدر کی عمر تین سال تھی اور میرے ابو نے ہنسی خوشی اپنے بڑے بھائی کی بات کا مان رکھا تھا۔

میں بولتی جا رہی تھی اور وہ خاموشی سے مجھے سنتی جا رہی تھی۔

ہم دونوں اس وقت ایک کافی بار میں موجود تھیں۔

''اب میں ہی اپنی کہانی سناتی جاؤں گی یا تم بھی میرے سوال کا جواب دو گی؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''حیا!'' اس نے اپنے دونوں بازو ٹیبل پر پھیلا کر اپنے چہرے کو تھوڑا میرے قریب کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں میرا نام پکارا۔

''حیا مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

''کس بات کا ڈر؟'' میں نے اپنی دونوں بھنوؤں کو اچکا کر پوچھا۔

''محبت کا اقرار کر لینے کا ڈر۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''گل تم ہر بات پر ڈرتی بہت ہو اور اگر تمہیں کسی سے محبت ہے تو تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتی۔''

''تم مجھے ایک بات بتاؤ؟'' میں نے مگ کو تھامتے ہوئے کہا۔

''اگر تم دھوپ کی شدت سے تڑپ رہی ہو تو کیا سائے کو ناپسند کرو گی؟ پیاس لگ رہی ہو تو پانی سے انکار کرو گی؟ نہیں نا، تو پھر اگر تمہیں کسی سے بھی محبت ہو جائے تو تم انکار نہیں کر سکو گی چاہ کر بھی نہیں، اس کو دیکھتے ہی تمہارے آگے کی جانب بڑھتے قدم تھم جائیں گے، تمہاری چلتی سانسوں کی رفتار پہلے کی نسبت تیز ہو جائے گی، چلو اب جلدی سے مجھے بتاؤ کون ہے وہ؟'' میں واپس اپنے سوال پر آ رکی۔

ہم دونوں کافی ختم کر چکی تھیں اور اب واپس گھر کے راستے پر چل رہی تھیں۔

وہ سڑک کے دائیں بائیں لگے زرد، نارنجی اور سرخ پھولوں کو دیکھنے میں مگن تھی، جب میں نے اس کا بازو تھام کر اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا۔

''اب بتا بھی دو یار؟'' میری اس بے تابی کو

دیکھ کر وہ مسکرا دی۔
"حیا ہم دونوں ہر روز ان کچی پکی پیچ و خم کھاتی سڑکوں پر چلتے ہیں یہ سرخ پھول کی پتیاں۔" اس نے سڑک پر گری پتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہر روز یہاں گری ہوئی نظر آتی ہیں حیا۔"
اس نے پتیوں کو زمین سے اٹھاتے ہوئے ہولے سے مجھے پکارا۔
"رنگ، شکل و صورت سب کچھ نظر آتا ہے مگر خوشبو جوان پتیوں کی اصل شے ہے وہ دکھائی

نہیں دیتی، ہوا کے جھونکے محسوس تو ہوتے ہیں مگر نظر نہیں آتے، کچھ اسی طرح ہے میری محبت، وہ تمہیں نظر نہیں آسکے گی۔"

"اُف کل یہ کیا بات ہوئی؟ میری آنکھیں نہیں ہیں کیا جو مجھے نظر نہیں آسکے گی؟" میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"محبت کو دیکھنے کے لئے آنکھوں کا نہیں دل کا ہونا ضروری ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حیا!" میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

"کچھ روز پہلے......" وہ بولتے بولتے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی اور میں ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

"ابر آلود موسم میں گلوز اور مفلر پہنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ ایک کافی بار سے نکل رہا تھا اور میں داخل ہو رہی تھی، میرا دھیان موبائل کی جانب تھا، اس لئے اس سے ٹکرائی اور میرا موبائل نیچے گر گیا، پھر اس نے میرا موبائل اٹھا کر مجھے تھمایا اور سوری کہہ کر آگے بڑھ گیا، جبکہ غلطی تو میری ہی تھی حیا، مجھے سوری کہنا تھا لیکن اس نے موقع ہی نہیں دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری آنکھوں سے اوجھل بھی ہو گیا اور اس دن کے بعد اب تک نظر ہی نہیں آیا، لیکن حیا! اس دن کے بعد وہ مجھے بھولا نہیں، اس کی شہد رنگ آنکھیں اس کا مجھے مسکرا کر سوری کہنا اور پھر اچانک میرے سامنے سے ہٹ جانا اور دیکھتے ہی دیکھتے میری نظروں سے اوجھل ہو جانا، وہ سارا منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔" وہ مزید کچھ بولنا چاہتی تھی کہ میں بے اختیار اس کی بات کاٹتے ہوئے بول پڑی۔

"چلو چھوڑو جانے دو یار، یہ افسانوی باتیں، یہ پہلی نظر میں کسی کے پیار کا اسیر ہو جانا، یہ سب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" اس نے قدرے بے بسی سے مجھے دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کو اپنے لبوں پر سجاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، میری نظر اچانک ہاتھ میں پہنی گھڑی کی جانب پڑی۔

"اوہ مائی گاڈ، کل دو گھنٹے ہو گئے ہمیں گھر سے نکلے ہوئے۔" میں نے امی کی ڈانٹ کو دھیان میں لاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے ساتھ تقریباً گھسیٹنے والے انداز میں لے کر تیز تیز قدموں کے ساتھ چلنے لگی۔

"امو کی ڈانٹ مطلب میرا سارا دن بدمزہ گزرنے کا امکان۔" گھر پہنچنے سے پہلے ہی میری سماعتوں سے امو کی غصیلی آواز ٹکرانے لگیں۔

☆☆☆

میں کچن میں امی کے لئے چائے بنا رہی تھی جب اچانک مجھے کل کی باتیں یاد آنے لگیں، پہلی نظر میں بھی بھلا کوئی پیار ہوتا ہے؟ میں نے خود کلامی کرتے ہوئے سوچا اور نہ چاہتے ہوئے بھی شیلف سے اپنا موبائل اٹھا کر کل کے لئے میسج ٹائپ کرنے لگی۔

"کل کیا پہلی بار دیکھتے ہی تمہیں اس سے محبت ہو گئی؟" میں نے میسج سینڈ کر دیا اور اب بے چینی سے اس کے جواب کی منتظر تھی، میں کپ میں چائے ڈال رہی تھی جب سیل فون پر میسج ٹون کی آواز سنائی دی، میں نے جلدی سے سیل فون پکڑا اور میسج کھول کر پڑھنے لگی۔

"حیا! نہ جانے کیوں اس کی شہد رنگ آنکھیں، اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے یہ احساس کیوں نہیں ہوا کہ میں نے اس کو پہلی بار دیکھا ہے، اس کو دیکھ کر میرے دل میں ایک خواہش جاگی کہ میں ہر روز ان شہد رنگ آنکھوں

کو دیکھوں اور حیا کبھی کبھی ہم کسی کو پہلی بار ضرور دیکھتے ہیں، لیکن آخری بار نہیں۔'' اس نے مزید کچھ لکھا تھا لیکن امی کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں سیل واپس شیلف پر رکھ کر امی کو چائے دینے چلی گئی، لیکن میرا دھیان ابھی بھی گل کے میسج پر اٹکا تھا، کہ پہلی نظر میں بھی بھلا کوئی پیار ہوتا ہے؟ ہاں شاید گل جیسی بے وقوف لڑکی کو ہو گیا ہو گا۔

میری سوچ کے تسلسل کو ایک بار پھر امو کی آواز نے توڑا۔

☆☆☆

میں اس وقت اس کے گھر کے گارڈن میں موجود تھی، ان وادیوں کے شہر میں اس سنہری دھوپ کا اپنا ہی کچھ مزا تھا، گارڈن میں پڑے بڑے پتھروں کے بڑی مہارت کے ساتھ ایک چشمہ بنوایا گیا تھا، جس میں پانی بہتا ہوا نیچے ایک چھوٹے سے تالاب میں گر رہا تھا، جس میں رنگ برنگی مچھلیاں موجود تھیں، میں نے ایک سرخ رنگ کی مچھلی کو پکڑنے کے لئے ہاتھ پانی میں ڈالا اور مچھلی میرے ہاتھ میں آتے آتے پھسل گئی، میری پوری توجہ مچھلیوں کی جانب تھی، جب گل کی آواز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''حیا! جیسے یہ مچھلی تمہارے ہاتھ میں آتے آتے پھسل گئی ہے نا، اسی طرح اس کو دیکھتے ہی میرا دل پھسل جاتا ہے اور میں خود پر سے اختیار کھو بیٹھتی ہوں۔''

''کیا تم حیدر کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس کرتی ہو حیا؟'' اس نے تالاب میں کھیلتی ہوئی مچھلیوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا، میں بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''گل میں اس کی آنکھوں میں تب دیکھوں نا جب امو مجھے دیکھنے کا موقع دیں، وہ تو حیدر کے آتے ہی مجھے کسی مجرم کی طرح کمرے میں بند رہنے کا حکم دے دیتی ہیں، امو کہتی ہیں وہ اور میں کہیں ایک دوسرے سے دور نہیں بھاگے جا رہے، میں اس کی منگیتر ہوں اس لئے میرا اس سے شادی سے پہلے زیادہ بے تکلف ہونا انہیں پسند نہیں۔'' میں مزید بولنا چاہتی تھی لیکن اس کی دھیمی آواز میں کہی گئی بات نے مجھے خاموش کروا دیا۔

''حیا! تم بہت خوش قسمت ہو، تمہیں وہ بن مانگے مل گیا ہے جو بہت سے لوگوں کو منتوں مرادوں کے بعد بھی نہیں ملتا۔'' میں نے اس کی نیلی سیاہ آنکھوں میں دیکھا جن میں اس وقت بے بسی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور ایک بار پھر میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

''صرف ایک نظر میں ایسی افلاطونی محبت بھلا کیسے ممکن تھی؟ وہ بھی گل جیسی پاگل لڑکی کو جسے محبت کی الف ب تک کا اندازہ نہیں تھا، جو صرف بولنا ہنسنا جانتی تھی، آج اتنی خاموش آنکھوں میں صرف نمی لئے کھڑے تھی۔''

☆☆☆

آج فجر کے بعد سے ہی بارش کا سلسلہ جاری تھا، وہ فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر قرآن کی تلاوت کر کے آرام کرنے کی غرض سے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی، لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، جب کروٹیں لے لے کر تھک گئی تو وہ اٹھ کر باہر لان میں چلی آئی، اس نے بلیک فراک پر میرون رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی یہ ٹھنڈی ہوا اور سردی کی شدت اس کے گلابی گالوں کو مزید گلابی کر رہی تھی، باہر ابھی بھی ہلکی ہلکی رم جھم جاری تھی، ان وادیوں اور پہاڑوں میں گھرا یہ پنجاب کا شہر بارش سے اور بھی زیادہ نکھر گیا تھا، وہ چیڑ اور صنوبر کے درختوں کو عبور کرتے ہوئے باہر لکڑی کے پھاٹک تک آ گئی، جہاں چوکیدار پہلے

سے موجود تھا، وہ سردی کی وجہ سے کافی کپکپا رہا تھا۔

"بابا میں واک کے لئے جا رہی ہوں، کچھ دیر میں لوٹ آؤں گی اور آپ اپنے لئے خانساماں سے کہہ کر چائے بنوالیں کافی سردی ہو رہی ہے۔" گل نے اس کو ایسے ٹھٹھرتے دیکھ کر کہا۔

"جی بی بی جی!" چوکیدار نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر وہ باہر نکل آئی۔

چلبلی اور مستانی ہوا بار بار اس کے بالوں کو چھو کر گزر رہی تھی، آسمان پر ابھی بھی بادل نمایاں ہو رہے تھے، شاید بارش کا سلسلہ دوبارہ شروع ہونے کا امکان تھا، اس کے چلتے قدم ٹھہر گئے جب درختوں میں کہیں سے اچانک اسے کوئل کی کوک کی آواز سنائی دی، اس نے نظریں اٹھا کر اوپر درختوں کی جانب دیکھا، شاید اسی خوش آواز پرندے کی تلاش میں، درختوں کی شاخوں اور پتوں سے پانی کے کچھ قطرے اس کے چہرے پر آن گرے، اس نے ان پانی کی ننھی بوندوں کی نمی اور ٹھنڈک کو اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے مسکرا کو ہولے سے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا اور پھر سے اس پکی پکی خم کھاتی سڑک پر چلنا شروع کر دیا، شاید اسی شہد رنگ آنکھوں والے کی تلاش میں جسے چند روز پہلے اس نے یہیں کہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

حیدر میرے گھر میں موجود تھا، تائی امی نے کچھ تحائف بھجوائے تھے جو وہ میرے لئے کراچی سے لائی تھیں، میرا بس نہ چلتا میں کسی جنگلی بلی کی طرح ان پر جھپٹ پڑتی اور فوراً سے کھول کر دیکھنا شروع کر دیتی، پر امی کے سامنے تو جنگلی بلی نہیں بلکہ بھیگی بلی بن کر بیٹھنا پڑتا تھا، حیدر امی کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا اور میں آتش دان کے پاس بیٹھی اس کو دیکھ کر ایسے دانت دکھا رہی تھی جیسے وہ میری ٹوتھ پیسٹ کی کمرشل بنا رہا ہو، لیکن میری مسکراہٹ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی تھی جب امو نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ سمجھا دیا تھا کہ میری وہاں سے اٹھ جانے میں ہی عزت ہے ورنہ حیدر کے سامنے ہی جو امو میری عزت افزائی کرتی اس سے تو بہتر تھا اٹھ ہی جاؤں اور پھر میں نے ویسا ہی کیا، خاموشی سے کچن میں چلی آئی اور امی اور اس کے لئے کافی بنانے لگی۔

☆☆☆

باہر موسم کافی سرد ہو رہا تھا اور میرا گھر سے نکلنے کا بالکل کوئی موڈ نہیں تھا اسی لئے میں لحاف میں گھسی خشک میوؤں سے لطف اندوز ہو رہی تھی، امو کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لئے وہ سو رہی تھیں، تکیے کے نیچے پڑے موبائل کی وائبریشن نے اچانک سے مجھے چونکا دیا، میں نے موبائل پکڑ کر دیکھا تو گل کا میسج تھا، لکھا تھا "حیا وہ آج ہی نظر آیا اسے دیکھتے ہی مجھے لگا کہ میری رکتی سانس بحال ہو گئی ہیں، آج پھ نے اسے دیکھا تھا، اسے دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا، جیسے کسی پیاسے کو صحرا میں پانی مل گیا ہو۔

"تم نہیں جانتی حیا میں اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے کتنا تڑپی ہوں، کبھی بارش کی بوندوں میں بھیگتے ہوئے تو کبھی سردی کی شدت سے ٹھٹھرتے ہوئے اس کا کتنا انتظار کیا ہے، لیکن حیا وہ مجھے اتنی آسانی سے نظر نہیں آتا، جیسے چاند بادلوں میں کہیں چھپ جاتا ہے نا وہ بھی اسی طرح ان پیاروں میں کہیں کھو جاتا ہے۔" میسج پڑھنے کے بعد میں کتنی ہی دیر ساکت کھڑی رہی، پھر امو کی

آواز پر چونک کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

''حیدر کیا تمہیں پہلی نظر میں کسی سے پیار ہو سکتا ہے؟ کیا تم ایک نظر دیکھتے ہی کسی کو پاگلوں کی طرح چاہنے لگو گے؟'' میں نے حیدر سے فون پر بات کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں ایسا کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''بس ایسے ہی۔'' میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

''کہیں تمہیں تو نہیں ہو گیا کسی سے ایسا پیار؟'' اس نے مجھے چڑانے کی خاطر بولا۔

''نہیں مجھے نہیں میری دوست ہے نا گل؟ اس کو ہو گیا ہے، جوگیوں والا پیار۔'' وہ بلند آواز میں ہنسنے لگا۔

''تم لڑکیوں کو محبت بہت جلدی ہو جاتی ہے وہ بھی لیلیٰ مجنوں والی۔'' اس نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

اور میں نے مزید اس سے اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک دو اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

☆☆☆

ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے بنی تھیں، جہاں سے میری اور گل کی دوستی کا آغاز ہوا تھا وہ اکثر صبح واک کے لئے یہاں آیا کرتی تھی اور میں بس کبھی کبھار لیکن جب بھی آتی تھی گل کو وہاں ضرور پاتی تھی، ایک روز وہ کچھ اداس سی آنکھوں میں نمی لئے بیٹھی نا جانے کن سوچوں میں مگن تھی کے اس کو میری موجودگی کا بھی احساس نہ ہوا۔

''السلام علیکم!'' میں نے اس کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے اونچی آواز میں سلام کیا، اس نے آنکھوں کی نمی کو صاف کرتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور مجھے اجنبیت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

''آپ رو رہی ہیں؟'' میں نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے مختصرا جواب دیا۔

''آپ ڈیلی یہاں آتی ہیں؟'' میں نے بات چیت کا سلسلہ بڑھانا چاہا۔

''جی ہاں۔'' ایک بار پھر مختصرا جواب دیا۔

''کیا کرتی ہیں آپ؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''Nothing Special!'' اف پھر سے پھیکا سا جواب۔

''آپ بولتی بہت کم ہیں؟'' میں نے اس کی سیاہ نشیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا؟

''نہیں بس آج بولنے کا موڈ نہیں ہو رہا۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''کیوں آج کیا ہوا؟'' آخر میں اصل بات پر آ گئی جس کے لئے میں اس سے مخاطب ہوئی تھی کہ آج وہ اداس کیوں ہے؟

''بس یونہی آج اپنے بابا کی بہت یاد آ رہی تھی۔''

''اوہ تو بات کر لیں ان سے یا مل لیں، میرے ابو بھی دوبئی ہوتے ہیں، کبھی کبھار میں بھی بہت مس کرتی ہوں انہیں۔'' میں مزید بولنا چاہتی تھی لیکن اس کی بات نے مجھے خاموش کروا دیا، اس کے ابو کو کینسر تھا اور اب وہ اس دنیا میں نہیں تھے، میری طرح گل بھی اپنے پاپا کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی، مجھے اس کے ابو کا سن کر کافی دکھ ہوا تھا، باپ باغ کا وہ گھنا درخت ہوتا ہے، جس سے پورا باغیچہ ہرا بھرا لگتا تھا اور اس کے نہ ہونے سے بالکل ویران۔

میں کچھ دیر اس کے دکھ میں شریک رہی اور پھر اس کا موڈ اچھا کرنے کے لئے اپنی لائف کے کچھ ہنسی مذاق والے قصے سنانے لگی، بس پھر اسی دن سے میری اور گل کی دوستی کا آغاز ہوا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا، شرائط و دلائل سے بے نیاز مخلص دوستی اور پھر ہم روز ملنے لگیں، کبھی کبھی کافی بار کبھی پارک کبھی ایک دوسرے کے گھر اور کبھی ایسے ہی ان کچے پکے راستوں پر، گل مجھے کسی خواب نگر کی تتلی کی مانند لگتی تھی تو کبھی اپنے ہی خیالوں میں کھوئی کھوئی کبھی کھلی ہوئی اور کبھی مرجھائی ہوئی کلی کی طرح۔

ہم دونوں کافی بار میں موجود تھیں، وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں اس نے مجھے مخاطب کیا، اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا اور آنکھوں میں بے حد اداسی، جیسے اس کی آنکھوں سے کئی راتیں نیند خفا رہی ہو۔

''حیا!'' میں نے بہت دنوں سے اسے نہیں دیکھا، میں اسے ہر دن تلاشتی ہوں کسی قیمتی کھوئی ہوئی شے کی طرح، اس کے چہرے کی اضطرابی کیفیت مزید بڑھتی جا رہی تھی۔

''حیا! اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں مر جاؤں گی۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی، میں نے کرسی کھسکا کر مزید اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''گل تم ایسے کیسے کسی اجنبی شخص کے لئے اپنی زندگی برباد کر سکتی ہو؟'' میں نے بے بسی کے عالم میں کہا۔

''وہ اجنبی نہیں ہے حیا!''

''تو پھر کون ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ اس کا نام کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے مجھے اس سے محبت ہے، بے پناہ محبت۔''

''گل تم فضول میں ایک شخص کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔''

''وہ کوئی عام شخص نہیں ہے حیا، گل افشاں کی محبت ہے، پہلی اور آخری محبت۔'' بے چارگی کی انتہا تھی اس کے چہرے پر، وہ اس وقت سچ میں کسی خواب نگر کی تتلی کی طرح لگ رہی تھی، جو خواب نگر میں کہیں کھو چکی تھی اور شاید مزید کھونا چاہتی تھی اور میں جانتی تھی اگر خواب نگر میں کوئی کھو جائے تو اسے ڈھونڈنا کتنا دشوار ہو جاتا ہے اور مجھے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ خواب نگر میں اگر کسی کے خوابوں کا محل ٹوٹ جائے تو جینا کتنا مشکل ہوتا ہے اور مجھے گل کے خوابوں کا محل ٹوٹنے کے خیال سے بھی خوف آ رہا تھا، کیونکہ وہ تتلی کی طرح نازک لڑکی اپنے ٹوٹے خوابوں کے محل کی کرچیوں کی چبھن کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

یہ شہر کتنا خوبصورت تھا، یہ پہاڑوں کی ڈھلان، کچی پکی پیچ و خم کھاتی ہوئی سڑکیں، درختوں میں سے آنے والا پرندوں کا شور، پہاڑوں میں سے نکل کر یہ بہتے ہوئے چشمے، یہاں کی وادیاں کسی کو بھی اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتی تھیں، ہم دونوں ایک ایسی سڑک پر چل رہی تھیں جو اک جھیل کے بیچ و بیچ نکالی گئی تھی سڑک کے دائیں بائیں پانی تھا، جس میں بطخیں تیر رہی تھیں، یہ سڑک ایک پارک میں جا کر ختم ہوتی تھی، لیکن اسے تو یہاں کے خوبصورت اور دلفریب مناظر اپنی طرف مائل ہی نہیں کر رہے تھے، وہ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی، جب میں نے اس کی سوچ کے تسلسل میں اپنی آواز کا

خلل ڈالا۔
''گل! تم ہر وقت ایسے کھوئی کھوئی سی مت رہا کرو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''وہ اپنی سوچوں کے جیل خانے سے مجھے آزاد ہی نہیں کرتا۔'' چند ثانیے بعد اس نے جواب دیا۔
''حیا! وہ کسی آسیب کی طرح مجھ پہ حاوی ہو گیا ہے اور اب میں اس کے چنگل سے کبھی نہیں نکل پاؤں گی۔''
''گل! اگر اس نے تمہاری محبت کو ٹھکرا دیا تو؟ بس اسی ڈر سے آج تک اس کو بتانے کی کوشش نہیں کی حیا! تم بس اتنا سمجھ لو کہ وقت پہ میں نے اپنا فیصلہ چھوڑا ہے اور اس وقت کے انتظار میں ہر لمحہ مجھ پر ہنستا ہے، ہر لمحہ مجھے اک نئی موت مار رہا ہے، میں نہ جی رہی ہوں نہ مر رہی ہوں، بس ایک درمیانی کیفیت میں مبتلا ہوں، وہ مجھے جب بھی نظر آتا ہے نا تو کسی مقناطیس کی طرح مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے اور میں بنا کسی چوں چرا کے کھنچی چلی جاتی ہوں۔'' اس کی آواز میں بے بسی رچی تھی۔

☆☆☆

''بچپن میں ہی حیدر کے نام کا میرے دل میں ایک بیج بو دیا گیا تھا جو اب جوانی میں ایک گھنے درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا، بچپن سے جوانی تک میں نے صرف حیدر کو سوچا تھا لیکن گل!''

گل کی اس دیوانگی کو سمجھنے سے میں اب تک قاصر تھی، ہر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ دیوانگی کی شدت بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی اور میرے اندر کا خوف بھی۔
گل افشاں کی اس خاموش محبت کا خوف، جو گل کو کسی دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی، میرا اختیار نہیں تھا کہ میں اپنی عزیز و جان دوست کی محبت کو اس کے قدموں میں لا بچھاؤں۔
''میں اس شخص کو کہاں تلاشتی جس کا پتہ خود گل کے پاس بھی موجود نہیں تھا۔'' میں نے سوچتے سوچتے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں۔
''امو جان!'' میں نے بے حد پیار سے امو کو پکارا جو بیڈ پر لیٹیں ٹی وی دیکھنے میں معروف تھیں، انہوں نے میری جانب ایک نظر دیکھا اور پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
''امو وہ میں کہہ رہی تھی کہ......''
''ہاں کیا کہہ رہی تھی تم؟'' انہوں نے نظریں ٹی وی پر ہی جمائے ہوئے کہا۔
''وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ حیدر کی کال آئی تھی کیا میں اور وہ......''
اس سے پہلے کہ میں اپنے دل کی بات کہہ پاتی، امو نے خود ہی سوال سمجھ کر جواب بھی دے دیا، آخر ماں کس کی تھیں؟
''حیا! سکون سے گھر بیٹھی رہو، ہر وقت تمہاری ہڑک باہر کے لئے اٹھی رہتی ہے، نکاح کے بعد جب جی میں آئے، جتنی بار جی چاہے جہاں مرضی گھومنا۔'' بس امو شروع ہو چکی تھیں اور میرے پاس سوائے اس کے خاموشی سے انہیں سنتی جاؤں اور کوئی بھی راستہ نہیں تھا۔

☆☆☆

ہم دونوں اس کے گھر کی بالکونی میں کھڑی تھیں جہاں وادیوں کے اس پار سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور بادل گھروں کی بالکونیوں میں کمرے کی کھڑکیوں سے کمروں میں جھانکتے تھے، ایک چلبلی مستانی ہوا کا جھونکا اس کے بالوں کو چھو کر گزرا تھا، جس نے اس کے بالوں کو اس کے گلابی رخساروں پے بکھیر دیا، میں

نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور پھر سے باہر کا منظر دیکھنے لگی جو کہ بے حد دلفریب ہو رہا تھا وادی کی ہوا سرد بوجھل اور نم ہو چکی تھی، میں نے اپنے کندھوں سے سرکی ہوئی شال کو درست کرتے ہوئے اس خاموشی کے سلسلے کو توڑنا چاہا جو کافی دیر سے میرے اور گل کے درمیان حائل تھا۔

"گل دیکھو تو موسم کتنا سہانا ہو رہا ہے، یہ وادیوں پے جھکے ہوئے بادل۔" میں نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ نم ہوا، یہ درخت اور یہ کھلے پھول سب کچھ کتنا حسین لگ رہا ہے۔" میں بول رہی تھی جب اس کی آواز نے مجھے خاموش کروا دیا۔

"حیا!" اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں میرا نام لیا۔

"حیا! اگر میں کبھی ان وادیوں میں کہیں کھو جاؤں، کبھی نہ نظر آنے کے لئے تو تم مجھے یاد کرو گی کیا؟" اس نے ہلکا سا مسکرا کر پوچھا، لیکن میں جانتی تھی اس کی یہ مسکراہٹ پھیکی تھی۔

"گل! تم تو بھولنے والی شخصیت ہی نہیں۔"

"پھر میں اس کو کیسے بھول گئی حیا؟" اس نے بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا اور میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔

"گل! تم اپنی زندگی کیوں برباد کرنے پہ تلی ہو؟" میں نے اس کے بے بس چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کاش تم میرے دل کی حالت کو سمجھ پاتی حیا! تم کیا جانو میں تو اسی دن برباد ہو گئی تھی جب اس کو پہلی بار دیکھتے ہی اپنی زندگی کو اس کے نام لکھ دیا تھا۔" اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔

"گل! تم اسے بھول کیوں نہیں جاتی؟"

"آج یہ بات کہی ہے لیکن آئندہ ایسا سوچنا بھی مت۔" اس کے چہرے پر خفگی کے آثار جھلکے تھے اور میں نے مزید اس سے اس وقت الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

"آج تایا ابو اور تائی امی میری اور حیدر کی شادی کی تاریخ طے کرنے آئے تھے۔"

کیونکہ کچھ ہی روز میں ابو دبئی سے پاکستان آ رہے تھے اور ان کے آتے ہی شادی ہو جانی تھی، آخر کار بہت جلد میں حیا سکندر سے حیا حیدر ہونے والی تھی، میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے کا وقت نزدیک آ رہا تھا اور میں بے انتہا خوش تھی، میں اپنی خوشی گل سے شیئر کرنے چلی آئی۔

اب میں اور وہ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے بیٹھی تھیں، اس نے اپنے دودھیا رنگ پاؤں سے سیاہ رنگ کا کھسہ اتار کر دونوں پاؤں پانی میں ڈبو دیئے اور پانی سے کھیلنے لگی میں نے اسے بتایا کہ ابو کے آتے ہی میری شادی ہونے والی ہے، وہ سن کے خوش ہوئی تھی، لیکن گل کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے اسے کھونے کا خیال خوفزدہ کر رہا تھا۔

اس نے ندی کنارے بچھی گھاس پر بیٹھی ایک تتلی کو اپنے ہاتھوں میں سمو لیا، جو سردی کی وجہ سے اڑ نہیں پا رہی تھی اور اس کے ہاتھوں میں آتے ہی دم توڑ گئی، اس نے اپنی ہتھیلی کو میرے چہرے کے قریب لا کر بند مٹھی کھولی، جس میں پیلے اور سرخ رنگ کے پروں والی تتلی مقید تھی، میں نے اس مردہ تتلی کو غور سے دیکھا اور پھر گل کو کتنی نازک تھی وہ بھی بالکل اس تتلی کی طرح۔

"حیا! دیکھو یہ تتلی اس سردی کو برداشت

نہیں کر پائی اور دم توڑ گئی، جبکہ میرے اندر کا موسم تو باہر کے موسم سے بھی کئی گنا سرد ہے لیکن میں تو نہیں مری؟''
''گل!'' اس کی بات سے مجھے کچھ غیر معمولی سا احساس ہوا تھا۔
میں نے اسے یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی اور اس کی مسکراہٹ میں سوائے درد کے کچھ بھی نہیں تھا۔
''میں نے شاپنگ کے لئے جانا ہے حیدر کے ساتھ، امی نے بہت مشکل سے تائی امی کے کہنے پر اجازت دی ہے اس شرط پر کے تمہیں ساتھ لے کر جاؤں، تم چلو گی ناں گل؟'' میں نے التجائی انداز میں پوچھا کیونکہ اس کے موڈ کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا، وہ پہلے مجھے بغور گھورتی رہی اور پھر مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''چلو چلیں۔''
''اوہ تھینکس مائی ڈیئر فرینڈ۔'' میں نے خوشی سے اسے گلے لگا لیا اور فوراً سے حیدر کو کال کی کہ وہ مجھے اور گل کو کافی بار سے پک کر لے اور پندرہ منٹ بعد حیدر ہمارے پاس پہنچ گیا۔
''حیدر میٹ ہیر شی از گل افشاں اینڈ گل تم تو سمجھ گئی ہو گی یہ حیدر رہی ہے۔'' وہ میری بات پر پھیکا سا مسکرا دی، پھر ہم تینوں گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے، حیدر نے مجھے ڈھیر ساری شاپنگ کروائی لیکن گل تو گاڑی سے اتری نہیں تھی میرے لاکھ کہنے کے باوجود بھی، شاید وہ کباب میں ہڈی نہیں بننا چاہتی تھی، حیدر شاپنگ کے بعد مجھے اور گل کو گھر ڈراپ کر گیا تھا اور اب میں امو اور گل کو وہ ساری چیزیں دکھا رہی تھی، امو ہر چیز دیکھتی اور ایک ہی جملہ بار بار دہراتی چلی جاتیں۔
''ارے حیا تمہیں عقل کب آئے گی، ابھی تمہارا نکاح نہیں ہوا بنو جو تم نے ابھی سے اس کے خرچے کروانا شروع کر دیے، کیا سوچتا ہو گا وہ حیدر بھی۔''
''امی وہ تو کچھ بھی نہیں سوچتا ہو گا لیکن آپ ایویں اتنا کچھ سوچتی رہتی ہیں۔'' میری بات پر انہوں نے مجھے ایک نظر گھور کر دیکھا اور میں ان کی نظروں سے بچنے کے لئے گل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

''تم نے اس کو دوبارہ نہیں دیکھا؟'' میں نے اس کی گہری سیاہ نیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''دیکھا تھا گل، کل؟ اور سوچا کہ کاش نہ آج بھی نظر نہ آتا۔'' وہ یاسیت سے بولی۔
''کل کس وقت؟ کل تو ہم شاپنگ کرنے گئے تھے؟ تم جب شاپنگ مال تھے اور میں گاڑی میں بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی، وہ بھی اسی شاپنگ مال میں تھا۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں پہنی ہوئی رنگ کو گھماتے ہوئے کہا۔
''تو تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا؟ اور تم نے اس کے پاس جا کر اس کو روکا کیوں نہیں؟ اس سے بات کیوں نہیں کی؟'' میں نے ایک ہی سانس میں اتنے سوال کر ڈالے تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔
''اس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس کا چہرہ کسی جگنو کی طرح جگمگانے لگتا تھا۔''
''کیونکہ میں اس کو دیکھنے کے بعد زیادہ دیر اس کے سامنے کھڑی نہیں ہو پاتی، وہ کسی شمع کی مانند ہے حیا اور میں کسی پروانے کی صورت، جو اس کے قریب جاتے ہی اس کے لمس کی حدت کو برداشت نہیں کر پائے گی۔''
میں نے گل کے ساتھ واک کرنے کے بہانے حیدر کو بھی بلا لیا، ویسے تو ہماری پیاری امو

جان ملنے کا موقع نہیں دیتی تھیں، حیدر کام میں کچھ مصروف تھا اس لئے تھوڑا دیر سے آیا، میں اور گل کافی بلند پہاڑی پہ کھڑی تھیں اور اس خوبصورت نظارے کو دیکھ رہی تھیں، جب اپنے عقب میں مجھے حیدر کی آواز سنائی دی، وہ کافی ہانپتا ہوا آ رہا تھا اور میرے قریب آتے ہی مجھے اور گل کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''تم خواتین کو اس سے کم اونچائی کی لوکیشن نہیں ملی تھی۔'' اس کا سانس پھولا ہوا تھا، مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی لیکن گل اپنے ہی خیالوں میں گم تھی، وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے لگا اور میں گل کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

''جاؤ اس کے پاس بیٹھو جا کر اس سے باتیں کرو۔'' اس نے اپنی نظر سامنے پہاڑوں پر جماتے ہوئے کہا، میں نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا اور واپس حیدر کی طرف مڑنے لگی تو وہ ہم دونوں کے قریب آ کھڑا ہوا تھا، گل اس کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر ایک قدم دور ہوئی تھی اور وہ مجھ سے مخاطب تھا، جب گل کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''حیدر صاحب اگر آپ کو جو حیا نہ ملی تو آپ کیا کریں گے؟'' وہ پہلی بار حیدر سے مخاطب ہوئی تھی، ورنہ وہ مردوں سے یوں مخاطب نہیں ہوئی تھی، حیدر نے پہلے ایک نظر اسے غور سے دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔

''اس پہاڑ سے کود کر اپنی جان دے دوں گا۔'' یقیناً اس نے مذاق میں ایسا کہا تھا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہی ہیں اور ہمیں کوئی جدا نہیں کر پائے گا۔

''اور اگر وہ تمہیں نہ ملا تو تم کیا کرو گی گل؟'' میں نے بس یونہی اسی کا سوال اس سے بھی کر لیا۔

''میں اس پہاڑ سے سچ میں کود جاؤں گی۔''

''تو کود کے دکھاؤ؟'' حیدر نے بھنوؤں کو اچکا کر کہا۔

ایک دو اور تیسرے لمحے وہ ان پہاڑوں میں ہمیشہ کے لئے کھو جاتی اگر حیدر اس کا ہاتھ تھام کر اسے کودنے سے نہ بچاتا، میں نے لپک کر اسے حیدر سے الگ کیا۔

''تم سچ میں پاگل ہو گئی ہو کیا؟ اگر تم گر جاتی تو؟'' حیدر بے یقینی سے خاموش کھڑا اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جہاں موت کا کوئی خوف نظر نہیں آ رہا تھا، بلکہ وہ تو مسکرا رہی تھی، دل چیرنے والے انداز میں، میں ساکت کھڑی تھی۔

☆☆☆

دو دن پہلے ہی ابو دوبئی سے واپس آئے تھے اور میں بہت خوش تھی، آج شام ابو نے حیدر اور سب گھر والوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا اور سب آ چکے تھے۔

سیخ کباب، بریانی، قورمہ اور میٹھے میں ٹرائفل گاجر حلوہ اور کھیر کھانے پہ اچھا خاصا اہتمام دیکھ کر حیدر کا دل تو خوشی سے باغ باغ ہو گیا، وہ جب سے امریکہ سے آیا تھا تو نہ جانے اکثر فون پر ڈشیز کے نام لے کر ہنستا اور سیکھنے کی تاکید کرتا رہتا اور میں جواب میں ہر بار یہی کہتی کہ تمہیں بیوی کی نہیں بلکہ ایک عدد خانساماں کی ضرورت ہے جو تمہیں نئے نئے پکوان تمہاری مرضی کے مطابق بنا کر کھلاتی رہے، وہ میری اس بات پر دل کھول کر ہنستا اور بس ہنستا ہی چلا جاتا۔

انتظار کی گھڑیاں آخر کار اختتام کو پہنچی، آج میری مہندی کی رسم تھی، گھر میں بہت سے مہمانوں کی آمد ہو چکی تھی، خاندان ایک اور گھرانے دو تھے، ہر کوئی جی بھر کر تیاریوں میں

مگن تھا اور باہر ڈھول کی تاپ پر خاندان کے لڑکے دھمال ڈال رہے تھے، میں اور گل کھڑکی میں کھڑی باہر کے ماحول کو انجوائے کر رہی تھیں، جب عقب میں امو کی آواز سنائی دی۔

"چلو شکر ہے تم تیار ہو گئی، گل لے آؤ اب اس کو باہر رسمیں بھی ادا کرنی ہیں، ورنہ یہ تو کھڑکی میں کھڑی لڑکوں کا دھمال ہی دیکھتی رہے گی۔"

"امو آج تو مت ڈانٹیں۔" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا امو مسکراتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

آج میری رخصتی تھی، مطلب حیا سکندر سے حیا حیدر ہونے کا دن، میں ہوٹل کے برائیڈل روم میں تھی جب گل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، اس نے سی گرین کلر کی فراک پہنی تھی جس پے سلور موتیوں سے ہلکا ہلکا بڑی نفاست کے ساتھ کام کیا گیا تھا، وہ کسی نازک پری کی مانند لگ رہی تھی اور آج سے پہلے وہ کبھی اتنا سنوری تھی نہ پیاری لگی تھی، وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"ماشاء اللہ تم بہت پیاری لگ رہی ہو حیا، کہیں تمہیں آج میری نظر نہ لگ جائے۔" میں اس کی بات پر ہلکا سا مسکرائی۔

"حیا!" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"میں تمہیں ایک نصیحت کروں حیا؟ ہمیشہ اپنی محبت کی قدر کرتی رہنا، چاہنے والے بہت کم ملتے ہیں، اس دنیا میں، حیدر تم سے بے حد پیار کرتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے بے حد محبت دیکھی ہے، آج تمہاری شادی ہو رہی ہے، تم رخصت ہو کر اپنے گھر چلی جاؤ گی، آج کے بعد نہ جانے کب تم سے ملاقات ہو، ہو یا نہ ہو تم نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا حیا، میں تمہاری اس مخلص دوستی کے لئے تمہاری بے حد شکر گزار ہوں، اگر میں نے کبھی تمہارا دل دکھایا ہو تو آج کے دن مجھے معاف کر دینا۔" وہ بولتی جا رہی تھی اور بہت عرصے بعد میں اسے ایسے سن رہی تھی اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر کسی موتی کی طرح میرے ہاتھ پر آ گرا۔

"گل میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے اپنی آنکھوں کی نمی کو صاف کرتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔

☆☆☆

میں دلہن کے جوڑے میں سجی سنوری بیڈ پر بیٹھی حیدر کا انتظار کر رہی تھی، اتنی زیادہ جیولری اور میک اپ سے اب مجھے الجھن ہونے لگی تھی، میں نے اپنی جھکی نگاہیں اٹھا کر سامنے ڈریسنگ ٹیبل کی جانب دیکھا اور پھر بیڈ سے اتر آئی، زمین پر پاؤں رکھتے ہی مجھے ٹھنڈی ٹھنڈی گلاب کی نرم و ملائم پتیوں کا احساس ہوا، جو میرے استقبال میں کارپٹ پر بچھائی گئیں تھیں، کمرے کی لائٹ آف تھیں، لیکن کمرے میں کینڈل سجائی گئی موم بتیاں کمرے کو روشن کر رہی تھیں، کمرے میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک شیشے کا کیبنٹ تھا، جس میں بے شمار پرفیومز موجود تھے، حیدر کو پرفیومز بہت پسند تھے اور اسی کیبنٹ کے کونے میں فش فارم پڑا تھا، جس میں رنگ برنگی مچھلیاں تھیں اور ان کو دیکھتے ہی مجھے گل کی کہی گئی بات یاد آنے لگی۔

"حیا جیسے یہ مچھلی تمہارے ہاتھ میں آتے آتے پھسل گئی ہے نا، اسی طرح اس کو دیکھتے ہی میرا دل پھسل جاتا ہے اور میں خود پر سے اختیار کھو بیٹھتی ہوں۔" اس سے پہلے کہ مزید کچھ سوچتی مجھے اپنے عقب میں کھڑے حیدر کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور پھر میں

اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔
مہندی، رخصتی اور پھر ولیمہ، شادی کے تمام فنکشنز بہت اچھے سے اپنے اختتام کو پہنچے تھے، میں حیدر کا ساتھ پا کر بے حد خوش تھی، میں حیا سکندر سے حیا حیدر ہو چکی تھی اور یہ سوچ کر میرے اندر ایک خوشی کی لہر دوڑتی تھی، میں اور حیدر اپنے روم میں بیٹھے اپنی شادی کی تصویریں دیکھ رہے تھے جب میرا ہاتھ گل کی فوٹو پر آ کر رک گیا، وہ میرے ولیمے پر نہیں آئی تھی، میری کال کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا اور میں اس سے بے حد ناراض تھی، میں اس کی ہی سوچوں میں مگن تھی جب حیدر کی آواز نے میری سوچ کا تسلسل توڑا۔
''کافی نادان ہے تمہاری سہیلی۔'' اس نے غور سے گل کی فوٹو کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا اور موبائل پر اس کا نمبر پھر سے ڈائل کرنے لگی۔
شادی کے چوتھے روز ہم لوگ امریکہ چلے گئے تھے، حیدر کا کیونکہ وہاں پر سیٹ اپ تھا اس لئے اس نے مزید دیر نہیں کی، نیا ملک، نیا کلچر دیکھنے کی خوشی وہ بھی حیدر کے ساتھ، میں نے تو جیسے سارا وقت ہواؤں میں اڑتے ہوئے گزار دیا تھا، تین چار ماہ بعد جب ہم لوگ واپس آئے تو موسم میں کافی تبدیلی آ چکی تھی واپسی کے بعد آج پہلی بار میں امو کی طرف جا رہی تھی، میں گیٹ پار کر کے لوکاٹ اور صنوبر کے درختوں کو پیچھے چھوڑتی گھر کے اندر داخل ہوئی، امو صوفے پہ بیٹھیں کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، جب مجھے دیکھتے ہی مجھ سے یوں آ لپٹی جیسے کب سے ہم دونوں بچھڑی ہوں، امو کے گلے لگاتے ہی مجھے بے اختیار رونا آ گیا، شاید پہلی بار ان سے ایسے دور رہی تھی اس لئے، امو نے میرے ماتھے کا بوسہ لیا اور میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں، کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میں نے اور امو نے کھانا کھایا کھانے سے فارغ ہو کر اب ہم ماں بیٹی کافی کا مزا لے رہی تھیں۔
''حیدر نہیں آیا؟'' امو نے ایک گھونٹ کافی کا لیتے ہوئے پوچھا۔
''شام میں آئے گا، اسے کچھ کام تھا ابھی، شام میں ابا بھی گھر ہوں گے تو اس نے سوچا ان سے بھی مل لے گا۔''
میری شادی کے بعد ابو نے اپنا سارا بزنس یہیں پر شفٹ کر لیا تھا، وجہ امو جان کی تنہائی تھی۔
☆☆☆
امو کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گئیں تو میں ان کو بتا کر گل کو ملنے کے لئے چلی آئی۔
میں ان راستوں پر آج تنہا چل رہی تھی جن پر میں اور وہ تتلی مزاج نازک سی لڑکی چلا کرتے تھے، راستے میں آنے والا یہ کافی بار جہاں روز آ کر کافی پینا اور گل کی اداس باتیں سننا میرا معمول ہوا کرتا تھا اور پھر کچھ ہی دور فاصلے پر یہ جھیل جہاں وہ تتلیوں کے مردہ پروں کو تلاشتی تھی اور ان کے مل جانے پر انہیں اپنی ڈائری میں دفن کرتی تھی اور یہ درخت جن پر چڑھ کر میں اسے چڑیا اور چیلوں کے گھونسلوں سے انڈے نکال نکال کر دکھاتی تھی اور وہ مجھے حیران ہو کر پوچھتی تم انسان ہو یا بلی ہو حیا اور مجھے ہنسی پہ قابو پانا مشکل ہو جاتا، سارا راستہ ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے گزر گیا، میں اس کے گھر کے سامنے کھڑی تھی، دروازے پر چوکیدار موجود نہیں تھا، میں گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی، گھر کے گارڈن میں مجھے مالی بابا دکھائی دیئے، مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب چلے آئے۔
''سلام مالی بابا! کیسے ہیں آپ؟ اور یہ آج باہر چوکیدار بھی نہیں اور دروازہ بھی کھلا تھا؟ کہاں

گیا وہ؟'' میں نے ان سے پوچھا۔
''جب گھر میں کوئی مکین ہی نہ ہو تو چوکیدار کا کیا کام بی بی جی۔'' میں ان کی بات کو سمجھ نہیں پائی تھی۔
''کیا مطلب؟ کہاں ہیں آنٹی اور گل؟''
شادی کے بعد اب تک میرا گل سے رابطہ نہیں ہوسکا تھا اوپر سے مالی بابا کی بات نے مجھے کسی غیر معمولی پن کا احساس کروایا۔
''بڑی بی بی جی تو اپنے بھائی کے پاس انگلینڈ گئی ہیں جی اور چھوٹی بی بی جی......'' وہ کہتے کہتے رک گئے۔
''اور گل کہاں ہے؟'' انہوں نے میرے پوچھنے پر نظریں جھکالیں۔
''بتائیں نہ مالی بابا گل کہاں ہے؟'' میں نے اضطرابی سے پوچھا۔
''گل بی بی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔'' مالی بابا کی لرزتی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تو یوں لگا جیسے دل کی دھڑکن نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہے۔
''گل بی بی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔''
آہ.....کوئی کانٹا جیسے دل پہ آ چبھا ہو، انہوں نے مجھے بتایا کہ میری بارات والے دن جب گھر لوٹی تو آتے ہی سونے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلیں گئیں اور سونے کے بعد وہ صبح جاگیں ہی نہیں، مالی بابا ان کے گھر میں گل کی پیدائش سے بھی پہلے کی ملازمت کر رہے تھے اس لئے ان کو گھر کا فرد ہی سمجھا جاتا تھا اور گھر کی کوئی بات ان سے چھپی نہیں رہتی تھی۔
میں اپنے بھاری قدموں کو بڑھاتے ہوئے اس کے کمرے کے دروازے تک آ پہنچی، میں نے دروازہ کھولا، اندر داخل ہوئی تو کمرے میں خاموشی راج کر رہی تھی، کمرے کی ہر شے اپنی

اسی جگہ پر موجود تھی جہاں میں ہمیشہ سے دیکھتی چلی آرہی تھی، لیکن اس کمرے کی سب سے قیمتی چیز وہ آج یہاں دکھائی نہیں دے رہی تھی، گل افشاں مرگئی تھی؟ کیسی بے یقینی والی بات تھی۔

"حیا آج کے بعد نہ جانے کب ملاقات ہو، ہو یا نہ ہو۔" اس کا کہا گیا جملہ میری سماعتوں سے ٹکرایا۔

"حیا اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں مر جاؤں گی۔"

اس کی کہی گئی باتیں مجھے یاد آنے لگیں اور میں دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اس کے بیڈ کے قریب چلی آئی، مجھ میں مزید کھڑا رہنے کی سکت موجود نہیں تھی، میں بیٹھ گئی اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کا دراز کھول کر اس کی ڈائری اور موبائل کو نکالا، جو اکثر وہ یہیں پر رکھتی تھی۔

میں نے ڈائری کے پہلے صفحے پہ لکھی گئی نظم پڑھی۔

کہا تھا اک روز کسی نے مجھ سے
محبت کبھی نہ کرنا
محبت کبھی نہ کرنا
تم بہت ناداں ہو ابھی
تم بہت انجان ہو ابھی
تم محبت ابھی نہ کرنا
تم محبت کبھی نہ کرنا
محبت برباد کردیتی ہے
محبت پاگل کردیتی ہے
سنو لڑکی تم محبت ابھی نہ کرنا
تم محبت کبھی نہ کرنا
اس کی ان باتوں پر میں ہنس کر بولی
ناداں میں نہیں، ناداں تو تم ہو
جو محبت جیسے جذبے سے ڈرتے ہو
محبت برباد نہیں کرتی
محبت کبھی پاگل نہیں کرتی
محبت تو بس محبت ہے
محبت جیسا کوئی رشتہ نہیں
لیکن آج جب میں محبت میں برباد ہوئی
تو وہ شخص بہت یاد آیا
وہ جو بھی کہتا تھا
ٹھیک ہی کہتا تھا
کاش!
میں محبت ابھی نہ کرتی
میں محبت کبھی نہ کرتی
کہ محبت آباد نہیں
بلکہ برباد کرتی ہے
محبت برباد کرتی ہے!!!

کبھی کبھار انسان کا دل چاہتا ہے وہ روئے اور بس روتا ہی چلا جائے، لیکن چاہ کر بھی جب وہ رو نہیں پاتا تو آنسوؤں کا ایک گولا گلے میں پھنس سا جاتا ہے، جسے انسان نہ نگل سکتا ہے اور نہ باہر اگل سکتا ہے اور وہ لمحہ بہت اذیت ناک ہوتا ہے اور اس وقت میں اس لمحے سے گزر رہی تھی، میری آنکھوں میں بے یقینی تھی، میں نے ڈائری میں لکھی گئی تمام نظموں کو پڑھا۔

ڈائری میں کچھ صفحے موجود تھے، جن کو فولڈ کر کے رکھا گیا تھا، میں نے ان صفحوں کو کھولا اور ایک نظر پہلے صفحے پر پڑتے ہی میری آنکھ سے ایک آنسو کا موتی گرا اور اس صفحے میں جذب ہو گیا، میں نے تمام صفحوں کو ایک ایک کر کے دیکھا اور پھر اس کی ڈائری میں واپس رکھ دیئے، میں نے اس کا موبائل آن کیا اور فوٹو گیلری میں چلی گئی، جس میں گل کی اور میری تصویریں تھیں، ایک تصویر پر آ کر میرا ہاتھ رک گیا یقیناً یہ اسی شخص کی تصویر تھی جس کے ہاتھ سے بنائے گئے اسکیچز اس کی ڈائری میں موجود تھے، اس شخص کے لئے اس نے اپنی جان دے دی؟ اس شخص کو وہ یوں

پاگلوں کی طرح چاہنے لگی تھی؟

تو یہ وہ شخص تھا جس کو وہ میرے سامنے بیان کرتی رہتی تھی، لیکن یہ شخص تو ہو بہو حیدر جیسا تھا، جس کے لئے وہ سڑکوں پر کھڑی گھنٹوں اس کو ایک جھلک دیکھنے کے لئے انتظار کرتی تھی، سردی کی شدت میں پاگلوں کی طرح جس کے لئے خوار ہوتی تھی، جس شہد رنگ آنکھوں کے لئے وہ تڑپتی تھی، تو وہ یہ شخص تھا۔

"حیا سکندر کا حیدر۔" ہاں حیدر، میں نے اپنی آنکھوں سے بہتے اشکوں کو صاف کیا۔

جب اس نے پہلی بار حیدر کو میرے ساتھ دیکھا تھا تو اس نے اسے دیکھتے ہی نظریں چرالیں تھیں، اس لئے جب پہلی بار کافی بار میں، میں نے ان دونوں کا تعارف کروایا تو حیدر نے کہا تھا اس کو تو میں نے بارہا ان جانے پہچانے راستوں پر دیکھا ہے اور میں جانتی تھی وہ اسی شخص کی تلاش میں کھڑی ہوتی تھی، جس کی محبت میں وہ گرفتار ہو چکی تھی، وہ بھی کبھی نہ آزاد ہونے کے لئے، لیکن میں ہرگز یہ نہیں جان پائی کہ وہ حیدر تھا، آخر کیوں مجھے یہ احساس نہ ہوا کہ وہ میرے سامنے حیدر کا ذکر کرتی ہے؟ صرف اس لئے کہ میری اور اس کی بچپن کی نسبت تھی، اسی سوچ نے مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ آنے دیا کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی حیدر کو یوں اتنی بے پناہ محبت کر سکتا تھا اور جب ہم تینوں اس دن پہاڑ کی بلندی پر کھڑے تھے وہ پہلی بار حیدر سے مخاطب ہوئی تھی، اس نے پوچھا تھا اگر میں اسے نہ ملی تو وہ کیا کرے گا؟ تو حیدر نے بس یونہی کہہ دیا ان پہاڑوں سے کود جاؤں گا اور جب میں نے پوچھا تھا کہ اگر تمہیں وہ نہ ملا تو تم کیا کروں گی؟ اس نے کہا تھا وہ بیچ میں کود جائے گی، حیدر نے بے اختیار کہہ دیا تو کود جاؤ، وہ یقیناً اس دن کود جاتی اگر اس سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا حیدر اس کو اپنی جانب نہ کھینچ لیتا، جب حیدر نے اس کو گرنے سے بچایا تھا تو وہ حیدر کی بانہوں میں جکڑی تھی، حیدر کے اتنا قریب تھی کہ حیدر کی سانسوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر سکتی تھی اور اس لمحے ایک عجیب سی چبھن میرے دل کو محسوس ہوئی، میں نے بے اختیار اسے حیدر سے الگ کیا، میں کچھ لمحے حیدر کو کسی اور کے ساتھ برداشت نہیں کر سکی اور اس تنلی مزاج لڑکی نے اسے صبر سے اتنے کٹھن لمحوں کو گزار دیا اور میری رخصتی کے دن اس کی آنکھوں میں بار بار آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا تھا اور میں یہی سمجھتی رہی یہ سب میری جدائی کے آنسو ہیں اور اسی رات جب میں نے ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی کو حیدر کے نام کر دیا تو اس کے صبر نے جواب دے دیا ہو گا اور اسی لئے اتنی زیادہ سلیپنگ پلز کھا کر سو گئی کہ اسے کبھی بھی کوئی اس گہری نیند سے نہ جگا سکا، سوچتے سوچتے اب میرا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا، کبھی کبھی زندگی اس قدر مشکل ہو جاتی ہے کہ جینے کے تصور سے بھی خوف آنے لگتا ہے اور کبھی کبھار ہم ان راستوں کی مسافت پر نکل پڑتے ہیں جو ہماری منزل نہیں ہوتے، جیسے گل چل پڑی تھی اور جب اسے علم ہوا ہو گا کہ وہ اپنی منزل کو پانے سے پہلے ہی کھو چکی ہے تو اس نے ہمیشہ کے لئے چلتے قدموں کو روک دیا، وہ جان گئی تھی اس کی اور میری محبت ایک ہے۔

اس نے میری رخصتی سے قبل کچھ لمحوں پہلے مجھ سے کہا تھا حیا جس سے ہم محبت کرتے ہیں جس کے لئے ہم دن رات روتے ہیں، تڑپتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں، اسے ہی ہماری محبت کا احساس نہیں ہو پاتا اور ہم یہ سوچ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں کہ وہ نہ ملا تو کیا ہوا خوشی تو اسی بات

میں ہے کہ وہ جسے چاہے اسے وہ حاصل ہو جائے اور اس کی خوشی کے لئے ہم اپنی تمام خوشیاں قربان کر دیتے ہیں، اس وقت مجھے اس کی بات کا مطلب سمجھ نہیں آ سکا تھا، کہ وہ اس وقت ایسا کیوں کہہ رہی تھی، لیکن اب میں جان گئی تھی، اس نے اپنی تمام خوشیوں کو اور خود کو حیدر کی محبت اور میری دوستی میں قربان کر دیا تھا۔

☆☆☆

گل افشاں مرگئی تھی لیکن میرے لئے اب وہ ہمیشہ زندہ تھی، حیدر کی شہد رنگ آنکھوں میں، میں نے جب حیدر کو گل افشاں کی موت کے بارے میں بتایا تو وہ یقین نہ کر سکا اور جب یہ بتایا کہ وہ کسی اور سے نہیں تم سے محبت کرتی تھی، تمہیں پاگلوں کی طرح ان راستوں پر تلاشتی تھی تو اسے سن کر کافی شاک لگا تھا، میں نے گل کے ہاتھ سے بنے اسکیچز اس کے موبائل فون میں حیدر کی لاعلمی میں لی گئی حیدر کی تصویریں، حیدر کے لئے لکھی گئی نظمیں سب اس کو تھما دیا اور وہ ایک ایک اسکیچز کر کے دیکھتا چلا گیا، میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں نیم تاریکی تھی، اگلے ہفتے ہم امریکہ واپس جا رہے تھے اور میرا بالکل من نہیں تھا ان وادیوں کے شہر کو چھوڑ کر جانے کا، جہاں میری اور گل کی بہت سی اچھی یادیں تھیں رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن مجھے دور دور تک نیند کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے، مجھے گل کی بہت یاد آ رہی تھی، میری آنکھوں سے بہتے خاموش آنسو اب ہچکیوں اور سسکیوں کی شکل اختیار کر چکے تھے، میرے نزدیک سویا حیدر مجھے روتا دیکھ جاگ اٹھا۔

''حیا کیا ہوا؟ تم رو کیوں رہی ہو؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''حیدر!'' میں نے اس کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔

''حیدر! وہ ہر روز میرے پاس آتی ہے، میرے پاس بیٹھتی ہے، مجھ سے باتیں کرتی ہے، میرے ساتھ ہنستی ہے اور ہنستے ہنستے رو دیتی ہے اور اس کے آنسو، حیدر اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو مجھے سونے نہیں دیتے۔''

''بس کرو حیا ایسے رو رو کر اپنی طبیعت خراب مت کرو۔'' وہ مجھے تسلیاں دے رہا تھا، اس کی انگلیاں میرے بالوں سے کھیل رہی تھیں۔

''حیدر وہ تم سے محبت نہیں عشق کر بیٹھی تھی، یہ سوچے سمجھے بنا کہ تم کون ہو، کیا ہو کس کے ہو۔'' میری آنکھوں کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''حیا اس دل پر کسی کا بھی اختیار نہیں ہوتا، کب کس پر مر مٹے ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔'' وہ مزید کچھ بول رہا تھا لیکن میری دھیمی آواز نے اس کو چپ کروا دیا۔

''حیدر تم مجھے صبح گل کے پاس لے چلو گے نا، پلیز حیدر۔''

میں بہت دن سے اس کے پیچھے پڑی تھی کہ مجھے قبرستان لے چلو مجھے گل سے ملنا ہے، لیکن وہ میری بگڑی ہوئی طبیعت کی وجہ سے اپنی مصروفیات کا بہانہ کر کے ٹال دیتا، لیکن آج میری ضد کے سامنے اس نے ہار مانتے ہوئے صبح لے جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

حیدر کے ہمراہ میں قبرستان چلی آئی جہاں ہو کا عالم طاری تھا، اس کی قبر کی جانب بڑھتا میرا

ایک ایک قدم ڈگمگا رہا تھا، قبر کے قریب آتے ہی میری آنکھوں سے ایک بار پھر آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا، میں اس کی قبر کے سرہانے بیٹھی ماتم کناں تھی اور حیدر سامنے کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔

اس نے کہا تھا۔

"حیا اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں مر جاؤں گی۔"

اس کی آواز میں سوز تھا، جواب سمجھ میں آ رہا تھا، اس نے کہا تھا وہ مر جائے گی اور وہ سچ میں مر گئی۔

حیدر نے اس کی ڈائری پڑھی تھی تو بہت دیر تک خاموش رہا تھا۔

ڈائری کے آخری صفحے پر لکھا تھا۔

"میں آج جان گئی ہوں حیدر کہ آپ حیا سے کتنی محبت کرتے ہیں اور آپ کی زندگی میں مجھ جیسی عام لڑکی کی بھلا کیا اہمیت ہو گی، میں جانتی ہوں آپ مجھ سے محبت نہیں کر سکتے، لیکن میں تو آپ سے عشق کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔"

حیدر نے کبھی اس سے محبت نہیں کی تھی لیکن اس کی لکھی گئی آخری تحریر نے آج حیدر کی آنکھوں کو بھی اشکبار کر دیا تھا، محبت چاہے یکطرفہ ہی کیوں نہ ہو اگر اس میں صدق ہو تو اپنا آپ منوا کر رہتی ہے، دوسرے کے دل کو چیر کر اس تک پہنچ جاتی ہے اور میں نے اس بات کو آج حیدر کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تسلیم کیا تھا اور حیدر کی آنکھوں میں آج اس کے لئے نمی دیکھ کر جیسے میں ہلکی ہو گئی تھی، میرے سر سے کوئی بہت بھاری بوجھ کم ہوا تھا، میں یہی چاہتی تھی کہ حیدر ایک بار اس کی محبت کو ضرور تسلیم کرے، وہ محسوس کرے کہ یہ خاک ہوئی لڑکی اس کی اک نظر کو کتنا تڑپی ہے، اس کی ان شہد رنگ آنکھوں پر ہمیشہ کے لئے مرمٹی ہے، گل نے اپنی دوستی کا مان رکھا تھا تو مجھے بھی کچھ فرض ادا کرنا تھا، میں نے آج اس کی محبت کو اس کے قدموں میں لا کھڑا کیا تھا، وہ جن شہد رنگ آنکھوں پر جان دیتی تھی آج انہی آنکھوں میں اس کے لئے آنسو تھے۔

اب گل ہمیشہ زندہ تھی، میری یادوں میں اور حیدر کی آنکھوں میں قبرستان کے سناٹے میں اندھیرے گھل مل رہے تھے، حیدر نے میرا ہاتھ تھاما اور واپسی کی طرف قدم بڑھائے۔

میں نے چلتے چلتے ایک بار واپس مڑ کر دیکھا۔

جہاں گل افشاں کھڑی مسکرا رہی تھی اور آج اس کی مسکراہٹ مجھے پھیکی نہیں لگ رہی تھی آج اس کی آنکھوں میں اک عجیب سی خوشی دکھائی دے رہی تھی، اس کے شفاف چمکتے چہرے پر کوئی بے چینی کسی قسم کے اضطراب کے آثار نہیں تھے، آج صرف سکون ہی سکون تھا، اس کی آنکھوں میں اس کے چہرے پر اور وہ سکون صرف حیا دیکھ سکتی تھی۔

☆☆☆

سمیس کرن

وہ جب بشیر احمد کی منکوحہ بن کر اس کی زندگی، اس کے گھر میں داخل ہوئی تھی تو بہت مدت تک یہ دخیل صرف اس کی ذات کے ظاہر میں تھا، وہ بہت انجان و بے خبر تھی، بہت معصوم و سادہ دل وانجان، ہر بات سے، دنیا سے، یا شاید اس کی دنیا کچھ اور ہی تھی، رنگوں کی، خوشبوؤں کی، کتابوں کی، خوابوں کی، ان خوابوں میں ایک دھندلا سا عکس اس کے خوابوں کے شہزادے کا بھی تھا، مگر یہ دھندلا سا عکس اس کے بے تحاشا حسین وجمیل باپ سے بہت ملتا تھا، وہ شہزادہ جب اپنے غلافی پپوٹوں سے بجی مخمور آنکھیں اٹھا کر اسے "میری غزل" کہہ کر پکارتا تو وہ خواب میں بھی ہڑبڑا اٹھتی۔

باپ پروفیسر تھا اور بڑی اولاد یہ بیٹی ہی تھی جس نے اپنی پروفیسری ساری کی ساری اسی کو گھول کر پلا دی تھی، بقول اس کی ماں کے، لیکن جب بشیر احمد کا رشتہ آیا تو اس کے پڑھے لکھے ماں باپ نے کچھ بھی نہ سوچا، نہ اس کے خوابوں کا نہ ماحول کے فرق کا، نہ ذہن و مزاجی تفاوت کا موازنہ کیا گیا، اس کی ماں نے اس کے احتجاج پر بس اتنا کہا تھا۔

"اے موا یہ کوئی سائنسی تجربہ ہے کہ پہلے یہ پرکھو، وہ دیکھو، جو دیکھنے بھالنے کی باتیں ہیں سب ہم نے دیکھ بھال لیں۔"

ہاں تو بس دیکھا اور سوچا گیا تو یہ کہ ایک پرائیوٹ کالج میں پڑھانے والے غریب ایماندار پروفیسر کی بیٹی کے لئے اتنے اونچے گھر سے رشتہ آیا ہے جس کے پیچھے بہن بھائیوں کی ایک لمبی قطار ہے۔

ماں باپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کرشن چندر کی پرکاش وتی نے بھی تو یہی کہا تھا۔

"خبر نہیں پڑھا کر سکھا کر ہر طرح کے عیش و آرام دے کر ماں باپ ہمیں ذبح کیوں کر ڈالتے ہیں، شاید یہ بھی ایک رسم ہوگی۔"

لیکن وہ صرف خوابوں کی باسی ہی نہیں تھی، حقیقت پسند بھی تھی، کتابوں نے اسے خواب ہی نہیں ننگی حقیقتیں بھی دکھائی، سمجھائی و بجھائی تھیں، وہ جانتی تھی اسے ذبح ہونا پڑے گا کیونکہ تقدیر سب کو سب کچھ تو نہیں دے دیتی نا۔

وہ خود ترسی کی انتہا پر جا کر سوچتی، والدین بھی کیا کریں، کسی سانچے میں من پسند بر تیار ہوتے نہیں اور جب عمر رسیدہ کنواریاں چاندنی راتوں میں ہیجانی دوروں سے بے حال ہو ہو جاتی ہیں تو بوڑھے والدین سوچتے ہیں کاش کسی بھی استھان پر ان کو ذبح ہی کر دیا ہوتا۔

اس نے خاموشی سے خود کو اس سب کے لئے تیار کر لیا بالکل ویسے ہی جب گائے کو ذبح کیا جاتا ہے تو وہ زبان دانتوں تلے لے لیتی ہے۔

سو جب وہ بیاہ کر آئی تو اس نے بڑی حیرت اور تجسس سے ہر شے کو اس انجانی دنیا کو دیکھا، اس کے شوہر کا، بلکہ اس کے سسرال کا آبائی و خاندانی پیشہ کپڑے کا کاروبار تھا، جہاں کپڑے کے بیوپاری دھاگے کے تانے بانے اور نمبروں کی باتیں کرتے اور جہاں خرانٹ خرانٹ سی موٹی تازی عورتیں ہاتھوں میں ٹھوس سونے کے کنگن اور انگلیوں میں کھنسی موٹی موٹی انگوٹھیاں

ڈالے آنکھیں گھما گھما کر خاندانی داؤ پیچ کی باتیں کرتیں، فضول قسم کے مذاق کرتیں تو اسے منٹو کی "ننگی آوازیں" یاد آنے لگتی بلکہ جیسے اس کے اندر وہ آوازیں کرلاتی پھرتیں، کبھی روتیں کبھی دھمال ڈالتیں۔

اور ان باکمال عورتوں کے درمیان وہ ایک انجان و نالائق لڑکی ٹھہرتی جب باتیں کرتے کرتے بڑے آرام سے وہ موٹی موٹی فحش گالیاں ایسے بکتیں جیسے کوئی مولی گاجر کتر لی ہو، تو وہ سہم کر دبک جاتی اور اس کے دبکنے پر وہ آنکھوں، زبانوں، ہاتھوں سے اس کا ٹھٹھا اڑاتیں۔

گھر کے مرد و خواتین آپس میں بیٹھتے تو خاندانی سیاست و جھگڑے زیر بحث لائے جاتے، کاروباری گر اور منافع زیر بحث آتے، اس کی ساس و نندیں آنکھوں میں حقارت بھر کر اسے دیکھتیں اور بڑے مغرور انداز میں مہنگے اور برانڈڈ کپڑوں کا ذکر کر کے اسے مرعوب کرنے کی کوشش کرتیں، وہ مرعوب تو کیا ہوتی، بس ذہنی طور پر ان سے دور ہوتی چلی گئی، اسے یہ سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ وہ ان سب کے درمیان بیٹھ کر کیا بات کرے، اس کا بت وہاں بیٹھا رہتا، خاموش بے جان اور روح اپنے گھر شام کی چائے پینے چلی جاتی۔

وہ شام، وہ چائے جہاں وہ اور اس کا باپ ادبی و علمی گرما گرم بحث چھیڑ بیٹھتے جو کبھی میل شاونزم سے ہوتی، مذہب کا احاطہ کرتی، سگمنڈ فرائڈ کو کھنگالتی، انسانی نفسیات کی پرتیں کھولتی، فلسفہ کے اصول بیان کرتے کرتے بیچ میں کہیں طب آجاتی اور طب کی بات کرتے کرتے ایک دم سے کہیں مرزا غالب آ دھمکتے! اور کبھی...... بحث میں کھوئی ہوتی کہ کوئی اس کا کندھا جھنجھوڑتا تو بت میں روح واپس آجاتی، وہ آنکھ اٹھا کر دیکھتی تو سسرال والوں کے تمسخرانہ اشارے جی کو الجھاتے اور وہ خاموشی سے اٹھ جاتی۔

شوہر اس کا ایسا برا بھی نہ تھا، کھانے پینے

کہ دم گھٹ کر موت آ جائے، خواہش تب بھی مر
جاتی ہے جب پیاس اتنی بھڑک اٹھے کہ بھڑک کر
اپنی آگ میں خود جل مر جائے اور تیسری صورت
تب پیش آتی ہے کہ دونوں عوامل گڈمڈ ہو کر بدن
کے رطوبتی ہارمونز نظام کو بگاڑ دیں اور وہ تینوں
صورتوں کی زد میں آ کر کچلتی جا رہی تھی۔

کبھی اداسی و خاموشی حد سے زیادہ بڑھ
جاتی تو وہ چھوٹی بہن کی دی تسلی سے خود کو
بہلانے لگتی، اس کی چھوٹی بہن بڑے ادنیٰ متوسط
طبقے میں بیاہی گئی تھی اور مالی حالت کافی پتلی تھی،
اس کو یاد کر کے وہ خود کو بڑی اور ڈھیروں تسلیاں
دیتی۔

اس کی اسی بہن نے اس کی شادی پر اس کی
ساس کے نخروں پر شفق کے چہرے پر پھیلتی مایوسی
پر اس کو بہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھنا باجی، کچھ عرصے کی بات ہے، پھر تم
بھی انہیں میں سے ہو جاؤ گی، مہنگے تھانوں سے
لے کر کپڑا پہن کر لمبی سی گاڑی میں زیوروں سے
لدی پھندی موٹے موٹے کنگن اور بھاری بھاری
انگوٹھیاں ہاتھوں میں گھماتی نخوت سے ناک
چڑھاتی جب اس غریب خانے میں آیا کرو گی نہ تو
یہ کتابیں، یہ شاعری، فلسفہ خود کو منوانے کی دھن و
لگن اپنی شناخت کا بھوت سب بھول جاؤ گی،
بچوں کی فوج تمہیں ٹکنے دے گی تب نا، دیکھا
نہیں تمہاری جیٹھانی کے کتنے بچے ہیں، اللہ توبہ
مجھ سے تو گنے ہی نہیں جاتے۔'' اس نے مصنوعی
غصے سے چھوٹی کو گھورا۔

''اللہ توبہ کتنی پیاری لگ رہی ہو تم سے حور
لگ رہی ہو، ساتھ میں ہال میں ہوتی دوسری
شادی سے لوگ، عورتیں آ کر تمہیں دیکھ رہی ہیں،
بس بشیر احمد پر تو آج بجلیاں گریں گی۔'' وہ
افسردگی سے مسکرا دی کہ ابھی تو اس کی نند نخوت
سے ناک چڑھا کر کہہ گئی تھی۔

''گھر جا کر منہ دھلوا کر میک اپ کریں
گے، ذرا اچھی تیار نہیں ہوئی۔''

اس کے ذہن میں جو گونج رہی تھی، ذرا اچھی
تیار نہیں ہوئی، ان دو جملوں، متضاد رنگ فقروں
کی تکرار ہونے لگی، دل ڈوبنے لگا، اس نے گھبرا
کر بہن کا ہاتھ تھام لیا، اس کا بدن ٹھنڈا یخ بستہ ہو
رہا تھا۔

بہن نے پھر اسے چھیڑا۔

''ارے باجی سیٹھانی بننے جا رہی ہو، بالکل
اس کی فکر کی، دیکھنا کچھ عرصے کی بات ہے پکی
پکی سیٹھانی بن جاؤ گی رعب داب والی موٹی
تازی، لال لال آنکھوں میں مصنوعی غصہ و
غرور۔''

اور سب کچھ ایسا ہی تھا، وہ واقعی سیٹھانی بن
گئی تھی، سونے سے پیلی ہوئی قیمتی کپڑوں میں
لپٹی اور گاڑیوں میں دھنسی مگر نہ تو دل اس کا بدلنا
تھا نہ بدلا، ہاں تمکنت و وقار آ گیا، چہرے کی
معصومیت و پاکیزگی میں گھلا وقار اسے اور بھی
جاذب نظر بنا دیتا اور کہنے والے کہتے تھے یہ
خاموش چپ چاپ سی سیٹھانی دل کی بڑی اچھی،
سچی اور کھری ہے، پر کوئی نہ جانتا تھا کہ سیٹھانی
نے صبر کا لمبا گھونٹ بھر رکھا ہے اور پھر صبر تڑختا
بھی کیسے، یہ تو اور گہرا لمبا گھور ہو گیا تھا کہ ابا جی
بھی نہ رہے تھے اور ابا کے ساتھ جیسے ہر شے دفن
ہو گئی تھی، بہن بھائی اپنی دنیاؤں میں مصروف و
مگن اور ماں اکیلی و مجبور اس کو کیا وہ دکھی کرتی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا دکھ جو دنیا میں کسی کو
کچھ ہی نہ آتا ہو اس کو بیان کرنے زبان دینے
میں بڑی جھجک سی آ جاتی کہ فوراً فتویٰ شکر صادر
ہوتا، فٹ سے لوگ کہہ دیتے۔

''شکر کرو بی بی شکر۔''

اوڑھنے کی تنگی نہ تھی، خدمت کو نوکروں کی ریل پیل تھی، غرض تن کو آسودہ کرنے کو ہر نعمت میسر تھی تو من کو کون پوچھتا ہے؟ اور پھر عورت کا من وہ تو بس آسودہ کرنے کے لئے پیدا کر گئی ہے، اس کے من اور ذہن کو تسلیم ہی کہاں کیا گیا ہے جو اس کی آسودگی کی پروا کی جائے، موسن مر بھی گیا تو کیا ہوا؟

ایک سمجھوتہ تھا جو اس نے اپنے حالات سے کر لیا تھا اور اس کے اردگرد بسنے والوں نے سمجھ لیا تھا کہ شفق خاموش طبع ہے یا پھر ہم سے ہی بات کرنا پسند نہیں کرتی، جو بھی ہے، جیسا بھی ہے کے اصول پر اس کی عادت سمجھ کر صبر کر لیا تھا۔

کئی دفعہ اس نے کوشش کی اپنے شوہر کو اپنے ڈھب پر لانے کی مگر جو چیزیں گھٹی میں پڑی ہوں وہ کیفیت سے بڑھ کر رویے بن جاتے ہیں اور رویے آپ کی اصل فطرت کے عکاس ہوتے ہیں اور فطرت گھٹی میں پڑی فطرت کم ہی چھٹتی ہے، انہیں چھوڑنے کو بڑی زور آور اور تناور محبت و جذبہ و جنون چاہیے۔

اور اسے اپنی بیوی سے محبت تو تھی مگر ایسی بھی نہیں، وہ جو کبھی بڑے شوق سے اقبال کے فلسفہ خودی کا ذکر چھیڑتی یا پھر کسی بے جان سی فرسودہ مشرقی رسم کو مذہبی روایت کے طور پر مانے جانے رویے کو خوب صورت دلیلوں کے ساتھ رد کرتے ہوئے لاشعوری طور پر منتظر رہتی کہ شاید کسی جملے یا دلیل کی داد ملے گی یا کوئی تنقیدی تبصرہ جملہ، وہ دل میں سوچتی، ابا تو عش عش کر اٹھتے اس جملے پر، زندگی میں ابا جیسا باکمال مرد کسی اور دیکھنے ہی نہ دیتا تھا، نہ اس نے دیکھنے کی، ڈھونڈنے کی زحمت کی، جہاں ماں باپ نے کھونٹا باندھا بندھ گئی اور اب جو وہ اس کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کر رہی تھی، اپنی باتوں سے اس کے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتی مگر وہ بے چارہ مروت میں عدم دلچسپی کے ساتھ ہوں ہاں کر کے رہ جاتا یا ان سنی کر کے بچوں کو ٹوکنے لگتا۔

اور ایک دن تو حد ہی ہو گئی، وہ منٹو اور عصمت چغتائی کی بات کر رہی تھی، بات کا آغاز ہی ہوا تو اس کے میاں نے ٹوک کر پوچھا۔

”کیا یہ دونوں حضرات شاعر ہیں؟“

وہ ٹکر ٹکر اس کا منہ تکنے گئی، اسے یوں لگا کہ اب تک وہ کسی دیوار سے سر پھوڑ رہی تھی، خلا میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، اس کا سانس بند ہونے لگا، مراجعت واپسی کا سفر اندر ہی اندر شروع ہو گیا، واپس اندر اپنے خول میں سمٹنے کا سفر، اس نے جان لیا کہ اس میں اور اس کے شوہر میں ذہنوں کی دوری کا سفر کبھی پٹنے والا نہیں اور یہ کہ یہ مرد میرے چار بچوں کا باپ ہے، اس لئے اس کا ساتھ بہت ضروری ہے، کبھی کبھی وہ من میں ہنستی کہ ابھی اتنی عدم مطابقت، اتنی دوری کہ میری روح میرا وجود تو جیسے کچے گھڑے کی طرح نیارا کنوارا ہے اور چار بچے اور جو اگر...... اس سے آگے سوچ کر وہ لاج سے خود اپنے اندر سمٹ جاتی۔

دل بہت زیادہ اداس ہو جاتا تو ہلدی کی گانٹھوں میں دبی کرشن چندر کی پرکاش وتی اور کپڑے پر تو ہی تو لگتی تھی، اس کے وجود سے وہ توانائی حاصل کرتی تھی اور یا پھر درد حد سے بڑھ جاتا تو ”مینڈا سائیں“ اذیت جو زخم کو چھیلنے سے حاصل ہوتی ہے، شاید یہ خود کو زندہ رکھنے کی لاشعوری کوشش تھی کہ ہر جذبہ و احساس و خواہش اندر ہی اندر ایک جامد چپ میں دفن ہو جاتا تھا، خواہش کو موت آنے لگی تھی، خواہش کی موت اس وقت ہوتی ہے جب جبر کا کیل پا اسے اتنا دبا دے

سو وہ بچ بچ صبر کے ساتھ شکر بھی کرتی تھی
کہ اپنے من کی قربانی دے کر اس نے تن آسائشی
تو دی، اپنے بچوں کا محفوظ مستقبل، اس کے
چاروں بچوں کے نام ابھی سے وسیع جائیداد تھی،
ہاں خاندانی روایت کے برعکس ایک احسان اس
کے شوہر نے ضرور کیا تھا کہ اس کے بچے اعلیٰ
اسکول میں تعلیم پا رہے تھے، سو زندگی آرام سے
گزر رہی تھی۔

اب تو شفق اپنے بنگلے میں اٹھ آئی تھی، یوں
تو گھر کے سبھی کاموں کے لئے نوکر تھے مگر اوپر
کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے اسے ایک
چھوٹی بچی رکھنی پڑی، عادتیں رویے ہوتے ہیں،
دل کی جو بھی کیفیت ہو، عادتیں رویے بن کر اپنا
اظہار کرتے ہیں، اپنے آپ کو منواتے ہیں،
عادتیں اور رویے بگڑ جلدی جاتے ہیں، بنتے بنتے
وقت لگتا ہے سو ان آسائشوں کی بھی وہ عادی ہو
چکی تھی اور یہ عادتیں اس کے رویوں میں ڈھل
چکی تھیں۔

یہ کمسن بچی جو اوپری کاموں کے لئے رکھی
گئی تھی اسے محسوس ہوتا کہ چپ چپ سی پھرتی
ہے، سوائے ضروری بات کے لب نہ کھولتی، جو
کام دیا جاتا وہ نپٹا کر خاموشی سے یوں بیٹھتی جیسے
کوئی سہمی چڑیا دبکی بیٹھی ہو، حتیٰ کہ اس نے محسوس
کیا کہ خانساماں اور اس کی بیوی تک سے وہ بے
تکلف نہ ہوئی، خانساماں اور اس کی بیوی حیدر
آبادی تھے، بڑے تمیز و ادب سے بات کرنے
والے، ان کے گھروں میں خاندانی ملازم تھا یہ
خاندان، اس کی بیوی صفائی اور کپڑوں کا کام
سنبھالتی اور بچی سمجھتے ہوئے اس کا خاصا خیال
کرتی تھی، شفق کی چھوٹی بیٹی جو کہ اس کی ہم عمر
تھی، سے وہ کبھی کبھار بات کرتی نظر آ جایا کرتی
اور بس۔

اس نے ایک دو دفعہ اس بات کا تذکرہ
اپنے بہت مصروف شوہر سے کیا، مگر اس نے
حسب معمول عدم توجہی سے ٹال دیا یا پھر اس کو
ڈانٹ دیا اور مشورہ دیا کہ بیوی خواہ مخواہ کسی کے غم
میں مبتلا نہ ہوا کرے۔

وہ بھی حسب معمول خاموش ہو رہی،
احتجاج کا اپنا اپنا طریقہ ہے، اس کی خاموشی ہی
اس کا احتجاج تھا شاید، مگر اس طریقے کو قرینہ بھی
کراتا ہے کوئی یا سمجھے تب نا۔

ایسا نہیں تھا کہ اس کا شوہر اپنی طرف سے
بات کرنے کی، آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتا تھا،
اس کی طرح اس نے بھی کئی بار کوشش کی اس کو
اپنے بارے میں بتا کر دلچسپی پر آمادہ کرنے کی، وہ
اپنی دکان، ڈائینگ، کپڑے کی بنوائی، کھپائی، تانا
بانا وغیرہ کے بارے میں بات کرنے لگتا، کسی
پارٹی کی طرف کتنے کروڑ لگے ہیں، مگر شفق کو
جمائیاں آنے لگتیں اور وہ اس کی عدم دلچسپی
دیکھتے ہوئے چپ کر جاتا، پھر مرد تھا، اس کا
احساس کمتری اس کے مردانہ زعم کو للکارتا تو وہ
اسے اور بھی نظر انداز کرنے لگتا۔

اس دن ایک مدت کے بعد جانے کیسے اس
کی کالج کی پرانی اور اکلوتی دوست کا فون آیا،
ایک مدت کے بعد جیسے زبان کا تالا کھلا، پرانی
یادیں تازہ ہوئیں، کچھ نظمیں سنی اور سنائی گئیں،
ایک سے شوق و ولولے تھے جو دہرائے گئے،
زندگی میں کیا کھویا کیا پایا، پڑھی گئی کتابوں پر
تبصرے ہوئے، غرض باتیں بے شمار جیسے زنگ لگا
تالا ٹوٹ جائے اور جانے کس بات پر کھلکھلا کر
ہنس پڑی۔

کسی کام سے اندر آتے اس کے شوہر نے
بڑے تعجب اور قدرے شاکی نظروں سے اسے
دیکھا جیسے کہتا ہو، تمہارے یہ بے ساختہ قہقہے مجھ کو

دیکھ کر کیوں کھو جاتے ہیں؟ مگر شکوہ کرنا اپنی انا کے خلاف سمجھا اور الٹے پاؤں مڑ گیا، وہ اپنی نظروں میں جیسے چور بن گئی، اسے لگا درمیان میں کچھ برف اور آ گری ہے۔

☆☆☆

وقت کا کام ہے سو گزر ہی جاتا ہے، بچے بڑے ہو رہے تھے، اپنے کاموں اور پڑھائی میں معروف تھے اور اس کے اتنے بڑے گھر میں شفق اور وہ بھی دونوں خاموش خاموش پھرا کرتے۔

خانساماں کی بیوی اسے بڑے عرصے سے کہہ رہی تھی۔

"بی بی صفائی کے لئے ایک ماسی اور رکھ لیں، اکیلے مجھ بوڑھی جان سے اتنا کام نہیں سنبھالا جاتا۔"

سو اس کی درخواست پر ایک عارضی صفائی والی رکھ لی گئی جو کام نپٹا کر چلی جاتی، اس کام والی کو آتے ہوئے ابھی ہفتہ ہی ہوا تھا کہ وہ بھی جوش سے جاگتی ہوئی آئی، شفق نے پوچھا۔

"نسیم کیا ہوا؟" نسیم قدرے جوش سے بولی۔

"باجی یہ ہمارے ہی گاؤں کی ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

اسی دن صبح کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا، وہ اپنے کمرے میں ہی تھی، اس کا شوہر اپنے کھاتے سمیٹتے ہوئے دکان پر جانے کی تیاری میں معروف تھا، کچن اس کے بیڈ روم سے قریب ہی تھا کہ اس نے کچن میں تیز تیز باتوں کی آوازیں سنیں جیسے کوئی بڑے جوش و خروش و ولولے سے بول رہا ہو، مدتوں کی رکی باتیں ختم ہونے کو نہ آئیں، بات سے نئی بات ایک بہانہ بنا کر گلے آ لگے، ایک جوش و ولولہ سرخوشی تھی ان آوازوں میں، ایک آہنگ تھا ان تیز ملی جلی آوازوں میں اور زبان بھی وہ دیہاتی لہجہ پنجابی کا کہ اس کو سمجھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

خاموش چپ چاپ گھر جو شفق کے سناٹوں کا عادی تھا، جہاں بچے اسکول میں تھے، آوازیں بڑی نمایاں ہو رہی تھیں۔

وہ اور اس کا شوہر حیران استفہامیہ نظروں سے تیزی سے بیڈ روم سے نکلے تو دیکھا کہ نسیم اور وہ نئی صفائی والی جو کہ بقول نسیم اس کے گاؤں سے تھی، بڑے محو انداز میں ایک دوسرے میں گم اپنی سرائیکی بولی میں تیز تیز باتوں میں معروف تھیں۔

شفق ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھے گئی، پاس کھڑے شوہر نے دیکھا کہ پہلے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں اور پھر وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ جانے کیوں ایک دم سے کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی۔

اس کے شوہر نے اس کی طرف دیکھا اور آج پہلی بار یہ ہوا کہ وہ اپنی بیوی کی خاموشی بھید بھری خاموشی اور اس کے اندر اترتے سناٹے کا راز پا گیا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے کوئی سامنے پڑی شے آنکھوں کا پردہ ہٹ جانے سے واضح نظر آنے لگتی ہے، ایسا بھید کھلا راز جس سے وہ واقف ہوتے ہوئے بھی انجان تھا، آج اپنی روح سے اس پر آشکار ہو گیا مگر آج بھی اس کے پاس الٹے پاؤں مڑ جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

تحریم محمود

اے ابن آدم

حفاظت کرو تم اللہ کے اوامر کی اللہ تم کو دنیا کی آفتوں سے محفوظ رکھے اور حفاظت کرو اللہ کے حق کی تو پائے گا اسے سامنے اور جب تو مانگنا چاہے تو اللہ سے مانگ اور جب تو مدد چاہے تو اللہ سے مانگ اور یقین کرو، اگر ساری دنیا مل تم کو نقصان پہنچانا چاہے نہیں پہنچا سکتی اور ساری دنیا مل کر تم کو نفع دے تو وہ تم کو نہیں دے سکتی۔

شازیہ بٹ، میانوالی

احمد بن نصرؒ کا تقویٰ اور استقامت

احمد بن نصرؒ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم گزرے ہیں، مشہور عباسی خلیفہ واثق باللہ نے ان کی اس حق گوئی پہ کہ یہ خلق قرآن کے قائل نہ تھے، انہیں برسر عام قتل کرا دیا، ابراہیم ابن اسماعیلؒ فرماتے ہیں کہ جب ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تو لوگوں نے سنا کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد مجھے بھی (احمد بن نصرؒ) اشتیاق ہوا کہ اس واقعے کو دیکھوں، چنانچہ جب رات کا سناٹا بڑھ گیا اور ہر طرف تاریکی چھا گئی تو میں نے سنا ان کے سر سے آواز آ رہی تھی۔

ترجمہ:۔ ''کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ اس لئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، چھوڑ دیے جائیں گے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے۔'' یہ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اسی رات میں نے خواب دیکھا کہ ان پر حریر و دیباج کے کپڑے ہیں اور سر پر تاج ہے، میں نے دریافت کیا ''میرے بھائی، اللہ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا۔

''میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور جنت عطا فرمائی۔'' ایک دوسرے بزرگ ابو جعفر انصاریؒ نے بھی حضرت احمد بن نصرؒ کو خواب میں دیکھا تو وہ فرما رہے تھے کہ ''اس شہادت کی وجہ سے میرے رب نے مجھے اپنا دیدار نصیب فرمایا۔''

کرن اصغر، ملتان

امام ابو حنیفہؒ اور فکر آخرت

یزید بن کمیتؒ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے، جماعت میں امام ابو حنیفہؒ بھی شامل تھے، امام نے ایک رکعت میں۔

ترجمہ:۔ ''جس وقت کہ زمین ہلا دی جائے گی۔'' تلاوت کی، جب نماز ختم ہو گئی اور لوگ مسجد سے چلے گئے تو میں نے امام ابو حنیفہؒ کو دیکھا وہ بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے، میں نے سوچا کہ اس وقت انہیں کچھ کہنا مناسب نہیں ہے، پھر چراغ کی لو مدھم کر دی اور اپنے گھر چلا گیا، صبح جب میں فجر کی اذان کے لئے آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنی ڈاڑھی پکڑے ہوئے کہہ رہے تھے، ''بزرگ و برتر ہے وہ ذات جو ایک ذرہ بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دے گا اور برائی کا بدلہ برائی سے دے گا، اے اللہ! بچا اپنے غلام نعمان کو

عذاب آخرت سے۔"

امبرین ناز، لاہور

اقوال حضرت مجدد الف ثانیؒ

☆ حادثات دنیا کی تلخی کڑوی دوا کی مثل ہے۔
☆ گناہ کے بعد ندامت بھی توجہ کی شاخ ہے۔
☆ عجب یہ ہے کہ اپنے اعمال صالحہ اپنی نظر میں پسندیدہ دکھائی دیں۔
☆ اللہ کے دشمنوں سے الفت کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی ہے۔
☆ اللہ تعالیٰ کے کرم پر مغرور ہونا اور عفو کی امید پر گناہ کرنا شیطان کا کھلا فریب ہے۔
☆ احسان سب جگہ بہتر ہے، لیکن ہمسایہ کے ساتھ بہترین ہے۔
☆ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ آزادی ہے، خواہ مومن کی ہو کافر کی۔

نائلہ شاہ، پاکپتن

کام کی باتیں

☆ اپنے گناہوں کا احساس ہی توبہ ہے۔
☆ اگر آپ دوسروں سے اپنی قدر کروانا چاہتے ہیں تو پہلے دوسروں کی قدر کیجئے۔
☆ زندگی میں خوشی دینے والے تو یاد رہتے ہیں، مگر دکھ دینے والے لوگ زیادہ یاد رہتے ہیں۔
☆ اپنی شخصیت کو سنوارنے اور زندگی بنانے میں اتنے مصروف ہو جاؤ کہ دوسروں پر تنقید کرنے کے لئے تمہارے پاس وقت نہ رہے۔
☆ انسان عقل و اخلاق سے پہچانا جاتا ہے مشکل سے نہیں۔
☆ اگر آپ کا دل حسین ہے تو آپ بھی حسین ہیں۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا گناہ کسی کے دل کو چوٹ پہنچانا اور تکلیف دینا ہے۔
☆ کسی کو پانے کی تمنا مت کرو بلکہ اپنے آپ کو اس قابل بناؤ کہ لوگ تمہیں پانے کی تمنا کریں۔
☆ سکون حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ پہلے دوسروں کو سکون پہنچاؤ، کیونکہ سکون دینے والے کو ہی سکون ملتا ہے۔
☆ وقت انسان کو وہ سبق سکھاتا ہے جو استاد نہیں سکھاتا۔
☆ وفا کا سبق اس پھول سے سیکھو جو مسلنے والے کے ہاتھ میں بھی خوشبو بساتا ہے۔
☆ کسی کا راز چھپانا امانت ہے۔
☆ کتاب کو کبھی زمیں پہ گرنے مت دو، کیونکہ یہ آپ کو زمین سے آسمان تک پہنچاتی ہے۔
☆ اس دن رونا چاہیے جو نیکی کے بغیر گزار دیا ہو۔
☆ زبان بند رکھنا سب سے بڑی عبادت ہے۔
☆ علم دل کو ایسے زندہ کرتا ہے جیسے بارش زمین کو۔
☆ ہر مشکل انسان کا امتحان لینے آتی ہے۔
☆ سچی خوشی کا ایک لمحہ دکھوں کے ہزار لمحوں پہ بھاری ہے۔

حفصہ شفیق، کھاریاں

زاہدوں کی تلاش

ایک بادشاہ کو ایک مہم پیش آ گئی اس نے منت مانی کہ اگر میں اس مہم میں کامیاب ہو گیا تو زاہدوں کو درہم دوں گا، اللہ نے اس کی مراد پوری کر دی تو اس نے منت کی رقم ایک خاص غلام کو

دی اور حکم دیا کہ اسے زاہدوں میں بانٹ دو، یہ غلام بڑا عقل مند تھا، وہ تمام دن گھومتا رہا اور شام کو واپس آ کر تمام رقم پوری کی پوری بادشاہ کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ "جائے پناہ! میں نے ہر چند ڈھونڈا، لیکن مجھے کوئی زاہد نہیں ملا۔" بادشاہ نے کہا کہ "کیا بکتا ہے، میرے علم کے مطابق تو اس ملک میں چار سو سے کم زاہد نہ ہوں گے۔"
غلام نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔
"عالم پناہ! جو زاہد ہے وہ لیتا نہیں اور جو لیتا ہے وہ زاہد نہیں۔"

اُم ربا، لاہور

تقدیر کے سامنے تدبیر

ایک مریض پہلو کے درد کی وجہ سے تڑپ رہا تھا، طبیب نے اسے دیکھا اور کہا۔
"مجھے تعجب ہو گا اگر اس نے آج کی رات پوری کر لی کہ اس نادان نے ایک زہریلی گھاس کھائی ہے، جس کی وجہ سے اس کا زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔" صبح ہوئی تو لوگ حیران رہ گئے کہ مریض شفایاب ہو چکا تھا اور طبیب اس رات سوئے عدم روانہ ہو گیا تھا۔
"سچ ہے کہ تقدیر کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔"

فاخرہ ریاض، احمد پور شرقیہ

دکھ بولتے ہیں

جب سینے اندر سانس کے دریا ڈولتے ہیں
جب موسم سرد ہوائیں
چپ سی گھولتے ہیں
جب آنسو پلکیں رولتے ہیں
جب سب آوازیں اپنے اپنے بستر پر سو جاتی ہیں
تب آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہیں
دکھ بولتے ہیں

رابعہ عثمان، کراچی

خیال میرا خوشبو سا

☆ سورج نے کبھی اپنی روشنی کے دلائل نہیں دیے، جو کسی مقصد کے لئے مرتے ہیں وہ مرتے نہیں اور جو بے مقصد جیتے ہیں وہ جیتے نہیں۔
☆ لوگ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں، بحث کو نہیں چھوڑتے۔
☆ اپنی لاعلمی کے احساس کا نام ہی علم ہے۔
☆ اگر شخصیت میں پختگی ہو تو عادات میں سادگی خود بخود آ جاتی ہے۔
☆ اگر تم والدین کی باتوں پر توجہ دو تو لوہے کی پتھر کی سلیں بھی تمہارے ہاتھوں موم بن جائیں گے۔
☆ ہمیشہ اپنی نشست و برخاست ان لوگوں میں رکھو جن کو دیکھ کر اللہ یاد آئے۔
☆ انسان کو خیالات کا بلند ہونا چاہیے، باتوں کا نہیں، کیونکہ ایک چھوٹا پرندہ اونچی عمارت پر بیٹھ کر عقاب نہیں بن جاتا۔
☆ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ آپ کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔
☆ زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں یا تو ہر بات پہ یقین کر لو یا ہر بات پہ شک۔
☆ خوشبو اور مسکراہٹ دو اہم خزانے ہیں، پہلے کو اپنے تک محدود رکھو اور دوسرے کو دوسروں پر نچھاور کرو۔

علی رضا، فیصل آباد

☆☆☆

بیاض

تسنیم طاہر

ارم حیدر ---- کراچی

نہ ہوا نصیب قرار جاں ہوس قرار بھی اب نہیں
ترا انتظار بہت کیا ترا انتظار بھی اب نہیں
تجھے کیا خبر مہ وسال نے ہمیں کیسے زخم دیے یہاں
تری یادگار تھی اک خلش تری یادگار بھی اب نہیں

....

نہ گلے رہے نہ گماں رہے نہ گزارشیں ہیں نہ گفتگو
وہ نشاط وعدہ وصل کیا ہمیں اعتبار بھی اب نہیں

....

عشق سمجھے تھے جس کو وہ شاید
تھا بس اک نارسائی کا رشتہ
میرے اور اس کے درمیان نکلا
عمر بھر کی جدائی کا رشتہ

رابعہ نور ---- لاہور

میں اس کو بھول گیا ہوں وہ مجھ کو بھول گیا
تو پھر یہ دل پہ کیوں دستک سی ناگہانی ہوئی
کہاں تک اور بھلا جاں کا ہم زیاں کرتے
بچھڑ گیا ہے تو یہ اس کی مہربانی ہوئی

....

یہ کیسے لوگ ہیں صدیوں کی ویرانی میں رہتے ہیں
انہیں کمروں کی بوسیدہ چھتوں سے ڈر نہیں لگتا
یہ ممکن ہے وہ ان کو موت کی سرحد پہ لے جائیں
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا

....

میں گوشہ صحرا میں ہوں اور جوئے رواں ہوں
ہوتے ہیں مرے لمس سے سیراب پرندے
یہ ربط کسی فصل کا پابند نہیں ہے
میں دریا ہوں اور ہیں مرے احباب پرندے

اریبہ شاہ ---- فیصل آباد

روز مل کر بھی کم نہیں ہوتا
دل میں وہ فاصلہ ہے برسوں سے
کس کو آواز دے رہے ہو سلیم
شہر یہ سو رہا ہے برسوں سے

....

درد سے میرا دامن بھر دے یا اللہ
پھر چاہے دیوانہ کر دے یا اللہ
میں نے تجھ سے چاند ستارے کب مانگے
روشن دل بے دار نظر دے یا اللہ

....

سورج سی اک چیز تو ہم سب دیکھ چکے
سچ مچ کی اب کوئی سحر دے یا اللہ

شافعہ اعوان ---- ملتان

نوحہ گران شام غم تم نے سنا نہیں مگر
کیسا عجب درد تھا تیز ہوا کے شور میں
میرے مکان کی چھت پہ تھے طائر شب ڈرے
جیسے پیام مرگ تھا تیز ہوا کے شور میں

....

خیر و شر کی خبروں کو مانتے تو سب ہی ہیں
کس کو ہوش رہتا ہے جبر اور ضرورت میں
دونوں درد دیتی ہیں آہ سرد دیتی ہیں
فرق کچھ نہیں ایسا نفرت و محبت میں

....

ایک سیدھی بات ہے ملنا نہ ملنا عشق میں
اس پہ سوچو گے تو یہ بھی مسئلہ بن جائے گا

میرے سینے میں ابھی اک جذبہ بے نام ہے
ضبط کرتے کرتے حرف مدعا بن جائے گا
ہما کاشف ---- ملتان

مل گیا تھا سکون نگاہوں کو
کی تمنا تو اشک بھر آئے
گل ہی اکتا گئے ہیں گلشن سے
باغباں سے کہو نہ گھبرائے

....

اس جگہ عقل نے دھوکے کھائے
جس جگہ دل ترے فرمان گئے
کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ امنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے
شہلا خان ---- سکھر

نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لئے
کہاں کے عشق و محبت کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لئے

....

یہ دن رات یہ لمحے مجھے اچھے سے لگتے ہیں
تمہیں سوچوں تو سارے سلسلے اچھے سے لگتے ہیں
بہت دور تک چلنا مگر پھر بھی وہیں رہنا
مجھے تم سے تبھی تک فاصلے اچھے سے لگتے ہیں

....

دسمبر کی شب آخر نہ پوچھو کس طرح گزری
یہی لگتا تھا ہر دم وہ ہمیں کچھ پھول بھیجے گا
ام رومان ---- جہلم

تم آئے ہو تو آؤ وفا کی بات کریں
وفا کی بات میں ہر بے وفا سے کرتا ہوں

....

ہر شخص کبریا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
دعوا مرا بجا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
سجدہ کروں تجھے تو کافر کہیں گے لوگ
یہ کون سوچتا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

....

حوادث سے الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے بربادیوں پر اشک برسانا نہیں آتا
کسی کا پیار کسی کی دعا ضروری ہے
دیار جس میں تازہ ہوا ضروری ہے
رافعہ اسلم ---- قصور

ہم نے لہو کے دیپ جلائے تو تھے ندیم
پر شہر آرزو میں چراغاں نہ ہو سکا

....

تیرے ہر رویے میں بدگمانیاں کیسی
جب تلک ہے دنیا میں اعتبار دنیا کر
جس نے زندگی دی ہے وہ بھی سوچتا ہو گا
زندگی کے بارے میں اس قدر نہ سوچا کر

....

وہ کر رہے تھے اپنی وفاؤں کا تذکرہ
دیکھا مجھے تو بات کا پہلو بدل گئے
ندا ---- لاڑکانہ

کہنے کو اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں
امجد مگر وہ شخص مجھے بھولتا نہیں

....

عمر بھر کی ہیں سانسیں یہ دوریاں یہ فاصلے
تم چاہو تو کچھ عجب نہیں یہ پل میں سر ہو جائیں

....

جب لوگ ہی جذبوں کی توقیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
دو گز ہی زمین سب کا جب آخری مسکن ہے
ہم کوئی مکان اپنا تعمیر نہیں کرتے
ساجدہ خان ---- اسلام آباد

ہم سے فرعون کے لہجے میں بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ جاتے ہیں

....

گردشیں لوٹ گئیں میری بلائیں لے کر
گھر سے جب نکلا تھا میں ماں کی دعائیں لے کر

....

جھولی میں کچھ نہیں تو اک آس ہی رہے
ایسی خبر سنا کہ دلوں کو زیاں نہ ہو
میری طرف نہ دیکھ مگر دیکھ لے ذرا
تحریرِ زخم زخم کہیں رائیگاں نہ ہو

مدیحہ تبسم ---- کوئٹہ

وہ ایک پل کی مسافت پہ تھا مگر مجھ میں
نہ جانے کس نے کہا تھا زمانہ پڑتا ہے
عجیب طرح سے اس نے بنائی ہے دنیا
کہیں کہیں تو یہاں دل لگانا پڑتا ہے

....

میں تو اڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لئے
بھر گیا ہے دل مگر مجھ سے مرے صیاد کا

....

اس دل میں شوق دید زیادہ ہی ہو گیا
اس آنکھ میں مرے لئے انکار جب سے ہے

فرحت ساجد ---- کھاریاں

جس کی آواز میں سلوٹ ہو نگاہوں میں شکن
ایسی تصویر کے ٹکڑے نہیں جوڑا کرتے
جمع ہم ہوتے ہیں تقسیم بھی ہو جاتے ہیں
ہم تو تفریق کے ہندسے نہیں جوڑا کرتے

....

موسم تھا دلفریب ہوائیں تھیں من چلی
برسا تھا تیری یاد کا ساون گلی گلی
تم سے نہیں کہا تھا کہ شعلہ بدن ہیں لوگ
اب کیوں دکھ رہے ہو ہتھیلی جلی جلی

....

اگر پڑ جائے عادت آپ اپنے ساتھ رہنے کی
یہ ساتھ ایسا ہے جو انسان کو تنہا نہیں کرتا

عاصمہ راشد ---- راولپنڈی

سفر کے شوق میں چل تو پڑے ہو تم گھر سے
دکھوں کے گرد سے دامن نہ اپنا بھر لانا
عجب فضا ہے جہاں سانس لے رہے ہیں ہم
گھروں کو لوٹ کے آنا تو چشم تر لانا

....

مجھ کو تو وہی جان سے پیارا تھا جہاں میں
وہ شخص جسے مجھ سے عداوت بھی بہت تھی

....

نشتر چھپے ہوئے تھے رگ جاں کے آس پاس
وہ چارہ گر تھا اور مجھے ڈر اسی کا تھا

زاہدہ علی ---- کراچی

رہبروں کے ضمیر مجرم ہیں
ہر مسافر یہاں لٹیرا ہے
معبدوں کے چراغ گل کر دو
قلب انساں میں اندھیرا ہے

....

یہ بات خاص نہیں پتھروں کی بستی میں
نہ پوچھ ٹوٹ گیا دل کا آئینہ کیسے

....

چاہت میں ہم نے طور پرانے بدل دیئے
جذبہ ہر اک سنبھال کے خانے بدل دیئے
روکے کہاں رکے ہیں محبت کے قافلے
بس یوں ہوا کہ دل نے زمانے بدل دیئے

فوزیہ غزل ---- شیخوپورہ

وعدہ خلافیوں سے کھلا مجھ پہ اس کا ظرف
تھا آدمی میں جس کو خدا مانتا رہا

....

ملا تو اور بھی تقسیم کر گیا مجھ کو
سمیٹنی تھیں جسے میری کرچیاں محسن

☆☆☆

اے کاش

کاش میں وزیر پانی و بجلی ہوتا
یہ کہہ کر اتنے ہزار کا شاٹ فال ہے
سیر سپاٹے کرتا پھر......!
نئے میٹر، نئے ٹرانسفارمر کی مد میں
کئی کئی لاکھ کمیشن کھاتا
وقفے وقفے سے
لوڈشیڈنگ کے بھاری بم گراتا اور خوش ہو کر گنگناتا رہتا
جب رات کو پورا ملک جاگتا رہتا
تو میں اے سی والے کمرے میں بیٹھ کر ریس گنتا رہتا
کاش! میں وزیر پانی و بجلی ہوتا

عاصمہ راشد، راولپنڈی

ازدواجیات

☆ ''تم نے مجھے بتایا تھا کہ ان صاحب کو عورت سے نفرت ہے، لیکن وہ اس محفل میں ایک عورت کے ساتھ خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں اور بہت خوش نظر آ رہے ہیں، آپ نے کیسے کہہ دیا تھا کہ انہیں عورت سے نفرت ہے؟''

''یہ وہ عورت نہیں ہے۔'' جواب ملا۔

☆ ''کیا واقعی اعدادوشمار سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی اکثر مردوں کو خودکشی سے باز رکھتی ہے؟''

''جی ہاں...... اور اعدادوشمار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خودکشی مردوں کو شادی سے باز رکھتی ہے۔''

☆ ''بیگم! تمہیں کچن میں گئے تین گھنٹے ہو گئے ہیں، کیا چانپیں ابھی تک تلی نہیں جا سکیں؟''

''تلی تو میں نے لی تھیں، لیکن وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں، تلی نہیں تھیں، اس لئے میں نے انہیں بھون لیا، لیکن بھوننے سے وہ جل گئیں، اب اگر آپ ذرا دیر اور صبر کریں تو انہیں ابال کر لا رہی ہوں۔''

اریبہ شاہ، فیصل آباد

انداز بیاں اور......

سسرالی رشتہ داروں سے تعلقات اچھے نہ ہونے کے لئے وجوہات کا ہونا ہرگز ضروری نہیں، یہی کافی ہے کہ وہ سسرالی رشتہ دار ہیں، بچوں پر ان باتوں کا ہرگز اثر نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس چپقلش سے لطف اندوز ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر امی سویرے سویرے حلوہ اور روسٹ تیار کر رہی ہیں تو آج نانی جان آئیں گی اور اگر امی صبح سے اپنا سر دوپٹے سے باندھے ہائے ہائے کر رہی ہیں اور دوپہر کو پچھلے تین چار روز کے بچے کھچے کھانے جن میں دال سرفہرست ہے، کھانے کو ملیں گے تو دادی جان آ رہی ہیں۔

اگر عید پر ماموں جان دس روپے دے کر گئے ہیں تو اس نوٹ کو ہر سو باقاعدہ پرچم کی طرح لہرایا جائے گا اور اگر چاچا جان سو روپے دے کر

جائیں تو اس نوٹ کو جعلی قرار دیا جائے گا۔
''مستنصر حسین تارڑ کی ''گدھے ہمارے بھائی ہیں۔'' سے اقتباس

امبر ناز، ملتان

ہری مرچیں

☆ بس میں بیٹھا ہوا ایک بچہ وقفے وقفے سے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کے برابر میں بیٹھے آدمی نے قدرے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔
''بیٹا! کیا یہ گھڑی واقعی ٹائم بتاتی ہے؟''
''نہیں انکل! بتاتی تو نہیں، خود دیکھنا پڑتا ہے۔'' بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔
☆ بیٹا گرمیوں کی چھٹیوں میں ہوسٹل سے گھر آیا تو باپ نے اس کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں بات چیت شروع کرتے ہوئے پوچھا۔
''بیٹا! کالج میں تمہیں سب سے مشکل کام کیا لگتا ہے؟''
''دانتوں سے کولڈ ڈرنک کی بوتل کھولنا۔'' بیٹے نے جواب دیا۔
☆ لڑکی: ''کیا آپ میرے چہرے سے ایک چیز ہٹا سکتے ہیں۔''
لڑکا: خوش ہوتے ہوئے۔
''ہاں ہاں! بولو کیا؟''
لڑکی: ''اپنی منحوس نظر۔''
☆ میاں، بیوی مارکیٹ جا رہے تھے تو ایک فقیر نے کہا۔
''شہزادی! پانچ روپے دے دو، میں اندھا ہوں۔''
شوہر نے کہا۔
''بیگم ضرور دے دو، تمہیں شہزادی کہہ رہا ہے تو یقیناً اندھا ہوگا۔''

رابعہ نور، قصور

اردو زبان ہماری

☆ اسد۔ ''ہاں یار ڈیوڈ! تم ایک مہینے ہمارے پاکستان کی سیر کر کے واپس لوٹے ہو، اب تو تمہیں اچھی خاصی اردو آنے لگی ہوگی؟''
ڈیوڈ! ''تھوڑی تھوڑی وہ بات، جو لوگ زیادہ بولتے ہیں۔''
اسد! ''وہ کیا؟''
ڈیوڈ! ''بجلی جانے والی ہے بجلی چلی گئی ہے۔''
☆ ایک پاکستانی (فرانسیسی ہوٹل میں فرانسیسی لڑکی سے) ''تمہیں اردو آتی ہے؟''
فرانسیسی لڑکی، ''ہاں تھوڑی تھوڑی۔''
پاکستانی، ''کتنی؟''
فرانسیسی لڑکی۔
''ایک رات کی گفتگو کے دس فرانک۔''
☆ پرانے زمانے کے ایک استاد صاحب بڑی ثقیل قسم کی اردو بولا کرتے تھے اور ان کی اپنے شاگردوں کو بھی نصیحت تھی کہ جب بھی بات کرنی ہو تو تشبیہات، استعارات، محاورات اور ضرب الامثال سے آراستہ و پیراستہ اردو زبان استعمال کیا کرو۔
ایک بار دوران تدریس استاد صاحب حقہ پی رہے تھے، انہوں نے جو زور سے حقہ گڑگڑایا تو اچانک چلم سے ایک چنگاری اڑی اور استاد جی کی پگڑی پر جا پڑی، ایک شاگرد فوراً اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے ادب سے گویا ہوا۔
''حضور والا! یہ بندہ ناچیز حقیر پر تقصیر ایک روح فرسا حقیقت حضور کے گوش گزار کرنے کی جسارت کر رہا ہے، وہ یہ کہ آپ لگ بھگ نصف

گھنٹہ سے حق حقہ نوشی ادا فرما رہے ہیں، چند ثانیے قبل ایک شرارتی آتشی پتنگا آپ کی چلم سے بلند ہوکر چند لمحے ہوا میں ساکت رہا اور پھر آپ کی دستار فضیلت پر براجمان ہوگیا، اگر اس فتنہ کی بروقت اور فی الفور سرکوبی نہ کی گئی تو حضور والا کی جان کو شدید خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔"

شازیہ بٹ، جہلم

قابل دید

ایک خاتون باغ میں چہل قدمی کر رہی تھیں، وہ ایک درخت کے پاس رک کر بولیں۔

"اے حسین سرو، اگر تیرے پاس بولنے کی صلاحیت ہوتی تو، تو مجھے کیا کہتا۔"

قریب ہی ایک صاحب بولے۔

"غالباً یہ جواب دیتا کہ معاف کیجئے میں سرو کا نہیں، سفیدے کا درخت ہوں۔"

کنول عامر، جہلم

قربانی

"کیا تم محبت میں میرے لئے اپنی جان کی قربانی دے سکتے ہو۔" بیوی نے شوہر سے پوچھا، شوہر نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں! تمہیں تو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اس بات کا اظہار میں نے سب کے سامنے بھری محفل میں پہلے ہی دن تمہیں تین بار قبول کر کے کر دیا تھا۔"

شہلا خان، خانیوال

تعجب

مسز شائستہ جو کہ کافی بوڑھی تھیں، نے ڈنر پارٹی میں کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ایمنڈویو سے پوچھا۔

"کیا آپ نے گون وردی وڈی پڑھی ہے؟"

"نہیں۔" پروفیسر نے کہا۔

"تعجب ہے آپ نے پروفیسر نہیں پڑھی، اسے شائع ہوئے چھ مہینے ہو چکے ہیں۔" بوڑھی عورت مسز شائستہ بولیں۔

اگلے ہی لمحے پروفیسر نے مسز شائستہ سے دریافت کیا۔

"کیا آپ نے ڈوائن کامیڈی پڑھی ہے۔"

مسز شائستہ نے اعتراف کیا کہ یہ کتاب اس نے نہیں پڑھی ہے۔

"تعجب ہے، آپ نے یہ کتاب نہیں پڑھے، اسے شائع ہوئے چھ سو برس ہو چکے ہیں۔" پروفیسر بولا۔

رفعت ناز، بہاول پور

آگہی

"ایک صاحب اپنی بیوی کے بارے میں اپنے دوست کو بتا رہے تھے شادی سے پہلے تو مجھے معلوم تھا کہ اس کے باپ نے اسے اسکول کا منہ نہیں دیکھنے دیا، مگر مجھے یہ شادی کے بعد ہی پتا چلا کہ اس کی ماں نے بھی اسے باورچی خانے کا منہ بھی دیکھنے نہیں دیا۔"

حورین زینب، لاڑکانہ

محنتی

جج! (ملزم سے) "تم نے ایک ہی رات میں پانچ گھروں میں چوریاں کر ڈالیں۔"

ملزم: "حضور میں بچپن ہی سے محنتی ہوں۔"

انجم، لاہور

☆☆☆

حنا کی محفل

عین غین

نعیم شہزاد ---- چکوال

س: عین غین بھائی کیا آپ نے چھٹیوں کا کام مکمل کر لیا ہے؟ اگر نہیں تو چکوال آ جائیں میں آپ کی مدد کر دوں گا؟

ج: اپنا کام تو دوسروں سے کرواتے ہو اور میری مدد کرنا چاہتے ہو حیرت ہے۔

س: عین غین بھائی ایمانداری سے بتایئے دن میں کتنی نمازیں باجماعت پڑھتے ہیں؟

ج: تم نے کیا صلوۃ کمیٹی جوائن کر لی ہے۔

س: عین غین بھائی سنا ہے کہ آپ کی منگیتر نے آپ کی تصویر دیکھ کر منگنی کی انگوٹھی واپس کر دی ہے؟

ج: انگوٹھی دیکھ کر واپس کی تھی ٹھیک کروانے کے لئے۔

س: کریم لگانے کے ساتھ ساتھ گرلز کالج کے سامنے دھوپ میں کھڑے ہونے سے گریز کریں کیونکہ دوائی کے ساتھ پرہیز ضروری ہے ورنہ......؟

ج: سچ کہا آخر تجربہ بول رہا ہے۔

رابعہ زین ---- لاہور

س: حال کیسا ہے جناب کا؟

ج: کیا خیال ہے آپ کا۔

س: آخر بھینس کے آگے ہی بین کیوں بجائی جاتی ہے آپ کے آگے کیوں نہیں؟

ج: اس لئے کہ میں آپ جیسا رسپانس نہیں دے سکتا۔

س: اول فول کب بکا جاتا ہے؟

ج: جب انسان اپنے آپ سے باہر ہو۔

س: گھگھی کیوں بندھ گئی؟

ج: تمہیں دیکھ کر۔

س: کوئی اچھی سی دعا؟

ج: خوش رہو۔

رابعہ نورین ---- سیالکوٹ

س: وہ چپکے سے پیچھے کھڑی ہو کر میری آنکھوں پر نرمی سے بڑے پیار سے ہاتھ رکھ کر بولی؟

ج: اٹھو جا کر برتن دھوؤ۔

س: ذرا جلدی سے یہ بتائیں کہ زندگی کا سب سے حسین سانحہ کیا ہے؟

ج: محبت۔

س: ہمیں دیکھتے ہی ان کا رنگ زردے کی طرح پیلا کیوں ہو جاتا ہے؟

ج: سمجھ جاتے ہیں کہ اب دو تین گھنٹے آپ کی سننی پڑے گی۔

س: ان سے مل کر ہم کچھ بدل سے گئے ہیں بھلا کن سے؟

ج: جو آپ سے برتن دھلواتے ہیں۔

س: درد میٹھا ہو تو رگ رگ کے کسک ہوتی ہے؟

ج: مٹھاس زیادہ ہو جاتی ہے نا اس لئے۔

آصفہ نعیم ---- فیصل آباد

س: وہ کہتے ہیں، "موقع محل دیکھ کر بات کیا کرو" آخر وہ محل کہاں ہے جہاں موقع دیکھ کر بات کی جاتی ہے؟

ج: ان سے کہو نا کہ تمہیں ایک بار دکھلائیں، میرے ساتھ جاؤ گی تو ناراض ہو جائیں

گے۔

س: کل لوگ تمہارے سامنے لال رنگ کا رومال کیوں لہرا رہے تھے؟

ج: تمہیں جو گزارنا تھا اس لئے سڑک پہ ٹریفک روک رہے تھے۔

س: مبارک ہو تم کو یہ شادی تمہاری سدا خوش رہوں یہ دعا ہے ہماری؟

ج: کون سی شادی۔

عنایا بھٹی ---- شیخوپورہ

س: کیا دنیا واقعی گول ہے؟

ج: کون کہتا ہے نہیں ہے۔

س: کچھ تو سوچو؟

ج: سوچ ہی تو رہا ہے۔

س: اپنی ہی کیوں ہانکتے ہو؟

ج: اور کیا نہیں ہانکوں۔

س: لوگوں نے محبت کے نام کو بدنام کیوں کر رکھا ہے؟

ج: لوگوں نے محبت کے نام کو نہیں محبت کو بدنام کر رکھا ہے۔

س: آج کل لوگوں کی مسکراہٹ میں بھی طنز ہوتا ہے؟

ج: اسی کو طنزیہ مسکراہٹ کہتے ہیں۔

س: اس مطلب کی دنیا میں کوئی کسی کا نہیں؟

ج: مطلب کی دنیا سے باہر بھی جھانک کر دیکھو۔

ثوبیہ نعمان ---- لیہ

س: بوجھو تو میں کون ہوں؟

ج: نام سے صاف ظاہر ہے۔

س: دل کی دل میں ہی رہ جاتی ہے؟

ج: لیکن آنکھیں ظاہر کر دیتی ہیں۔

س: بتاؤ تو وہ کون ہے؟

ج: کس کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔

س: یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟

ج: کوئی سگریٹ سے دل بہلا رہا ہوگا۔

س: چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے؟

ج: کون سے گلشن میں آؤں۔

س: آخری بار دیکھ لو مجھ کو؟

ج: ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے۔

ثروت راؤ ---- خانپور

س: تمہیں میری حالت کی خبر نہیں کیا؟

ج: میں ڈاکٹر تو ہوں نہیں۔

س: یہ دامن چھڑا کر جانا تھا تو؟

ج: تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

س: یہ محبت کا دستور نہیں ہے؟

ج: میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتی ہو۔

س: یہ برسات کا موسم یہ رم جھم کا سماں یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا؟

ج: یہ برسات کا موسم یہ چبھتی ہوئی دھوپ اور بند ہوا۔

س: یہ دل بہلتا ہی نہیں کسی پل؟

ج: ایسے حسین موسم میں دل کیا بہلے گا۔

س: میں نے اسے پانے سے پہلے ہی کھو دیا؟

ج: اسی میں تمہاری بہتری ہے۔

☆☆☆

میری ڈائری سے

صائمہ محمود

شمازیہ بٹ: کی ڈائری سے خوبصورت نظم
''آخری بار ملو''

آخری بار ملو ایسے کہ جلتے ہوئے دل
راکھ ہو جائیں کوئی تقاضا نہ کریں
چاک وعدہ نہ سلے، زخم تمنا نہ کھلے
سانس ہموار رہے شمع کی لو تک نہ ہلے
باتیں بس اتنی کہ لمحے آ کر گن جائیں
اس ملاقات کا اس بار کوئی وہم نہیں
جس سے اک اور ملاقات کی صورت نکلے
اب نہ تجدید وفا کا نہ شکایات کا وقت
اب نہ پیمان وجنوں کا نہ حکایات کا وقت
آج تک تم سے رگ جاں کے کئی رشتے تھے
کل سے جو ہو گا اسے کون سا رشتہ کہیے
ماتمی ہیں دم رخصت در و دیوار چلو
پھر نہ ہم ہوں گے نہ اقرار نہ انکار چلو

انیقہ حمید: کی ڈائری سے ساحر لدھیانوی کی نظم
''کبھی کبھی''

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی
عجب نہ تھا کہ میں بے گانہ الم ہو کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا
پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سایہ میں چھپ کے جی لیتا
مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں ترا غم، تری جستجو بھی نہیں
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں
زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گزر رہا ہوں کچھ انجانی راہگزاروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پرہول خارزاروں میں
نہ کوئی جادہ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

عاصمہ راشد: کی ڈائری سے احمد فراز کی غزل

اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں
تو بھی میرے سے بن گیا پتھر
ہم بھی کل جانے کیا سے کیا ہو جائیں
تو کہ یکتا تھا بے شمار ہوا
ہم بھی ٹوٹیں تو جا بجا ہو جائیں
ہم بھی مجبوریوں کا عذر کریں
پھر کہیں اور مبتلا ہو جائیں
عشق بھی کھیل ہے نصیبوں کا
خاک ہو جائیں کیمیا ہو جائیں

اب کے گر تو ملے تو ہم تجھ سے
ایسے لپٹیں تری قبا ہو جائیں
بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فراز
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں
رفعت احمد: کی ڈائری سے جون ایلیا کی نظم
''اس رائیگانی میں''
سو وہ آنسو ہمارے آخری آنسو تھے
جو ہم نے گلے مل کر بہائے تھے
نہ جانے وقت ان آنکھوں سے پھر کس طور پیش آیا
مگر میری فریب وقت کی بہکی ہوئی آنکھوں نے
اس کے بعد آنسو بہائے ہیں
آنسو بہائے ہیں
میرے دل نے بہت سے دکھ رچائے ہیں
مگر یوں ہے کہ ماہ و سال کی اس رائیگانی میں
مری آنکھیں
گلے ملتے ہوئے رشتوں کی فرقت کے وہ آنسو
پھر نہ رو پائیں
اریبہ شاہ: کی ڈائری سے ایک نظم
کہیں دور دشت خیال میں
کوئی قافلہ ہے رکا ہوا
کہیں خالی آنکھ کی گود میں
کئی رتجگے ہیں پڑے ہوئے
کہیں عہد ماضی کی راہ پر
کوئی یاد سی کہیں کھو گئی
کہیں خواب زاروں کے درمیان
مجھے زندگی نے بسر کیا
میرے ماہ و سال کی گود میں
نہ وصال کا کوئی چاند ہے
کوئی آس ہے نہ امید ہے
نہ کسی ستارے کا ساتھ ہے
نہ ہی ہاتھ میں کوئی ہاتھ ہے
کئی واہمے کئی وسوسے
مجھے گھیر لیتے ہیں شام سے
وہی دن متاع حیات ہیں
جو بسر کیے تیرے نام سے
نازیہ ضیاء: کی ڈائری سے احمد فراز کی نظم
اس نے کہا تھا سن
عہد نبھانے کی خاطر مت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
مجبوری یا مہجوری کی تھکن سے لوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ
سمندر سمندر اپنی پیاس بجھاؤ
جن آنکھوں میں اترو
میری تنہائی تمہیں آواز نہ دے گی
مگر جب
میری خواہش اور چاہت کی لے
اتنی اونچی اور اتنی تیز ہو جائے
کہ دل رو دے
تو......لوٹ آنا
صائمہ رانا: کی ڈائری سے قتیل شفائی کی غزل
وہ دل ہی کیا ترے ملنے کی جو دعا نہ کرے
میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے
رہے گا ساتھ ترا زندگی بن کر
یہ اور بات میری زندگی وفا نہ کرے
یہ ٹھیک ہے نہیں مرتا کوئی جدائی میں
خدا کسی کو کسی سے مگر جدا نہ کرے
سنا ہے اس کو محبت دعائیں دیتی ہے
جو دل پہ چوٹ تو کھائے مگر گلہ نہ کرے
بجھا دیا ہے نصیبوں نے میرے پیار کا چاند
کوئی دیا میری پلکوں پہ اب جلا نہ کرے
عافیہ نعیم: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم
''محبت کی ادھوری نظم''
آ کسی شام کسی یاد کی دہلیز پہ آ
عمر گزری تجھے دیکھے ہوئے بہلائے ہوئے

یاد ہے......؟
ہم تجھے دل مانتے تھے
اپنے سینے میں مچلتا ہوا ضدی بچہ
تیرے ہر ناز کو انگلی سے پکڑ کر اکثر
نت نئے خواب کے بازار میں لے آتے تھے
تیرے ہر نخرے کی فرمائش پہ
ایک جیون کی تمناؤں کی پہنائی سے
ہم دیکھتے تھکتے ہی نہ تھے، سوچتے تھے
ایک چھوٹا سا نیا گھر
نیا ماحول
محبت کی فضا
ہم دونوں
اور کسی بات پہ تکیوں سے لڑائی اپنی
پھر لڑائی میں کبھی ہنستے ہوئے رو پڑنا
اور کبھی روتے روتے ہنس پڑنا
اور تھک ہار کے گر پڑنے کا معصوم خوش بخش خیال

یاد ہے......؟
ہم تجھے سکھ جانتے تھے
رات ہنس پڑتی تھی بے ساختہ درشن سے تیرے
دن تیری دوری سے رو پڑتا تھا

یاد ہے......؟
ہم تجھے جاں کہتے تھے
تیری خاموشی سے ہم مر جاتے
تیری آواز سے جی اٹھتے تھے
تجھ کو چھو لینے سے اک زندگی
آ جاتی تھی شریانوں میں
تھام لینے سے کوئی شہر سا بس جاتا تھا ویرانوں میں

یاد ہے......؟
ہم تجھے ملنے کے لئے
وقت سے پہلے پہنچ جاتے تھے
اور ملاقات کے بعد
ہم بہت دیر سے گھر آتے
تو کہتے کہ ہمیں کچھ نہ کہو
ہم بہت دور سے گھر آئے ہیں
اس قدر دور سے آئے ہیں
کہ شاید ہی کوئی آ پائے

یاد ہے......؟
ہم تجھے بھگوان سمجھتے تھے مگر کفر سے ڈر جاتے تھے
تیرے چھن جانے کا ڈر ٹھیک سے رکھتا تھا مسلمان ہمیں
آ کسی شام کسی یاد کی دہلیز پہ آ
تیرے بھولے ہوئے رستوں پہ
لیے پھرتا ہے ایمان ہمیں
اور کہتا ہے کہ پہچان ہمیں

یاد ہے......؟
ہم تجھے ایمان کہا کرتے تھے

فوزیہ بٹ: کی ڈائری سے میر تقی میر کی غزل

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدہ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
کب تک تظلم آہ بھلا مرگ کے تئیں
کچھ پیش آیا واقعہ رحمت کو کیا ہوا
اس کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہم نشین
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا
بخشش نے مجھ کو ابر کرم کی کیا خجل
اے چشم جوش اشک ندامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتہ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا
تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میر کو
کیا جانیے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

☆☆☆

حنا کا دسترخوان

افراح طارق

فش شاشلک

اشیاء

فش (بون لیس) آدھا کلو
نمک حسب ذائقہ
کالی مرچ تازہ کٹی ہوئی آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس دو کھانے کے چمچے
سرکہ دو کھانے کے چمچے
لال مرچ کا پیسٹ آدھا چائے کا چمچہ
تیل دو کھانے کے چمچے
شملہ مرچ کٹی ہوئی ایک عدد
ٹماٹر کٹے ہوئے دو عدد
تیل فرائنگ کے لئے حسب ضرورت

ترکیب

مچھلی کو ایک پیالے میں ڈال کر نمک، کالی مرچ، لیموں کا رس، سرکہ، چلی پیسٹ اور تیل اچھی طرح مکس کر کے بیس سے پچیس منٹ کے لئے میرینیٹ ہونے دیں، اب شاشلک اسٹک پر سب سے پہلے شملہ مرچ کا کیوب، اس کے بعد مچھلی کا کیوب پھر ٹماٹر اس کے بعد پیاز کا کیوب لگائیں، یہی ترتیب دو مرتبہ دہرائیں اور اسی ترتیب سے تمام شاشلک اسٹکس کو فل کر لیں، اب ایک نان اسٹک فرائی پین میں تقریباً دو کھانے کے چمچے تیل ڈال کر ان اسٹکس کو تل لیں، فش دونوں سائیڈوں سے گولڈن ہو جائے تو نکال لیں، اسی طرح تھوڑا تیل ڈال کر فرائی کرتی رہیں، اب فرائیڈ رائس سرونگ ڈش میں چاول ڈال کر دبائیں اور ساتھ میں فش شاشلک رکھ کر سرو کریں۔

کرسپی اینڈ اسپائسی فش

اشیاء

بڑی مچھلی کے قتلے دو عدد
کاجن مسالا ایک کھانے کا چمچہ
مکھن سالسہ کے لئے ایک چوتھائی
پپیتا ایک عدد
پیاز درمیان سے کاٹ لیں ایک عدد
تازی لال مرچ ایک عدد
ہرا دھنیا چوپ کر لیں تین کھانے کے چمچ
لیموں ایک عدد
نمک حسب ذائقہ

ترکیب

پپیتے کو درمیان سے کاٹ کر اس کے بیج نکال کر الگ کر لیں اور اس کا چھلکا اتار لیں، پپیتے کے کیوبز کاٹ کر اسے ایک باؤل میں ڈالیں، اس میں پیاز، لال مرچ، ہرا دھنیا، لیموں کا چھلکا، لیموں کا رس اور نمک ڈال کر مکس کریں، نان اسٹک فرائی پین کو گرم کر کے اس میں کاجن مسالا ڈال کر گرم کریں، مچھلی کے قتلوں پہ مکھن لگائیں اور اسے فرائی پین میں کاجن مسالا کے اوپر ڈالیں، مچھلی جب دونوں طرف سے پک کر براؤن ہو جائے تو نکال کر سرونگ پلیٹ میں رکھیں، مزے دار کرسپی اینڈ اسپائسی فش تیار ہے، تیار کیے ہوئے سالسہ کے ساتھ سرو کریں۔

تھائی گرین فش کری

اشیاء

مچھلی صاف کیوبز کاٹ لیں ایک کلو

ہری مرچیں	حسب ذائقہ
ہری پیاز چوپ کرلیں	چار عدد
پیاز چوپ کرلیں	ایک گٹھی
لہسن کے جوئے کوٹ لیں	دو عدد
لیمن گراس	دو عدد
ہرا دھنیا چوپ کرلیں	چھ کھانے کے چمچ
ثابت سیاہ مرچ	چھ عدد
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
زیرہ پاؤڈر	دو چائے کے چمچ
لیموں کا چھلکا چوپ کرلیں	دو چائے کے چمچ
ہلدی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تین کھانے کے چمچ
کوکونٹ ملک	ڈھائی کپ
ادرک کاٹ لیں	انچ کا ٹکڑا
فش سوس	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب

فوڈ پروسیسر میں ہری مرچیں، ہری پیاز، پیاز، لہسن، لیمن گراس، ہرا دھنیا، سیاہ مرچ، دھنیا پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر، لیموں کا چھلکا، ہلدی پاؤڈر، نمک اور دو کھانے کے چمچے تیل ڈال کر بلینڈر کر کے پیسٹ تیار کرلیں، سوس پین میں باقی بچا ہوا تیل گرم کریں اور اس میں تیار کیا ہوا پیسٹ ڈال کر دو منٹ تک فرائی کریں، اس کے بعد اس میں کوکونٹ ملک، ادرک اور فش سوس ڈال کر مکس کریں، مچھلی ڈال کر ہلکی آنچ پر پندرہ منٹ تک پکائیں، اس کے بعد نمک شامل کریں اور مچھلی کے گل جانے تک پکائیں، سرونگ پلیٹ میں نکال لیں۔

کریبین فش اسٹکس

اشیاء

مچھلی کے قتلے دھو کر خشک کرلیں	چار عدد
تیل	تین کھانے کے چمچ
پیاز چوپ کرلیں	چھ عدد
لہسن کا جوا کوٹ لیں	ایک عدد
ٹماٹر چوپ کیا ہوا	ایک چوتھائی کپ
تیز پات	دو عدد
لال مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
بیج پورن مسالا	ایک چائے کا چمچ
لیموں کا رس نکال لیں	ایک چائے کا چمچ
براؤن شوگر	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ضرورت
بھنڈی ڈیپ فرائی کرلیں	چھ عدد

ترکیب

نان اسٹک سوس پین میں تیل گرم کریں، اس میں پیاز ڈال کر پانچ منٹ تک فرائی کریں، اس کے بعد لہسن اور ہری مرچ ڈال کر دو منٹ تک فرائی کریں، اس کے بعد ٹماٹر، تیز پات، لال مرچ پاؤڈر، بیج پورن مسالا، نمک، براؤن شوگر اور لیموں کا رس ڈال کر چمچہ چلائیں اور پندرہ منٹ تک پکانے کے بعد اس میں مچھلی ڈال کر احتیاط سے مکس کریں، ڈھکن ڈھک کر درمیانی آنچ پر دس منٹ تک پکائیں، مچھلی کے پک جانے کے بعد اسے سرونگ ڈش میں نکال لیں اور فرائی کی ہوئی بھنڈی کے ساتھ سرو کریں۔

پران ود گرین کوکونٹ کری

اشیاء

جھینگے شیلو فرائی کرلیں	تین کپ
گرین مسالا	ایک کپ
کوکونٹ ملک	تہائی کپ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
باسمتی چاول	ایک کپ

نمک	حسب ضرورت
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ

ترکیب

گرین مسالا بنانے کے لئے ہرا دھنیا چوپ کر لیں، پودینہ کے پتے الگ کر کے چوپ کر لیں، ہری مرچوں کو چوپ کر لیں، لہسن کے جوئے کو چوپ کر لیں، فوڈ پروسیسر میں ہرا دھنیا، پودینہ، لہسن، ہری مرچ، نمک اور آدھا چائے کا چمچہ زیرہ پاؤڈر ڈال کر بلینڈر کر کے پیسٹ تیار کر لیں، گرین مسالا تیار ہے۔

نان اسٹک سوس پین میں گرین مسالا اور کوکونٹ ملک ڈال کر درمیانی آنچ پر پکائیں، پانچ منٹ کے بعد اس میں جھینگے ڈال کر پانچ منٹ تک ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں، نمک شامل کریں اور جھینگوں کے پک جانے کے بعد انہیں سرونگ باؤل میں نکالیں اور ہرا دھنیا سے گارنش کریں، مزے دار پران ود گرین کوکونٹ کری تیار ہے، ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

پران ود گارلک مایونیز

اشیاء

جھینگے دھو کر صاف کر لیں	بیس عدد
تازہ لال مرچ	ایک عدد
پیپریکا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن کا جوا کوٹ لیں	ایک عدد
لیموں	ایک عدد
زیتون کا تیل	کھانے کے چمچے
سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت

گارلک مایونیز بنانے کے لئے:

مایونیز	ایک کپ
مسٹرڈ پیسٹ	ایک چائے کا چمچ

ترکیب

گارلک مایونیز بنانے کے لئے ایک کپ میں مایونیز، لہسن اور مسٹرڈ پیسٹ ڈال کر مکس کر کے ایک طرف رکھ دیں، ایک الگ پیالے میں لال مرچ، پیپریکا پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، لہسن، لیموں کا رس، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر اور زیتون کا تیل ڈال کر مکس کر لیں، اس مکسچر کو جھینگوں پر لگائیں اور اسے ڈھک کر تیس منٹ تک لئے میرینیٹ ہونے کے لئے رکھ دیں، انگیٹھی میں کوئلے دہکا لیں، میرینیٹ کیے ہوئے جھینگوں کو سیخوں میں پروئیں اور انگیٹھی پر رکھ کر گولڈن براؤن ہو جانے تک سینک لیں، جھینگوں کے پک جانے کے بعد انہیں سرونگ پلیٹ میں نکال لیں اور تیار کیے ہوئے گارلک مایونیز کے ساتھ سرو کریں۔

"اعتراز"

کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء پر فرحت شوکت کا ناولٹ "رہا جو تیرا ہو کر ہی" اس ماہ شائع نہیں کیا جا رہا، ادارہ معذرت خواہاں ہے۔

کس قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

فروری کے شمارے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

انسانی تہذیب وتمدن نے ترقی کی تو گھر اور خاندان تشکیل پائے، اچھے خاندان سے اچھا معاشرہ اور اچھے معاشرے سے بہترین قومیں بنتی ہیں، عورت کو گھر اور خاندان میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے وہ معاشرے کی ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے جہاں عورت کا حق تسلیم کیا گیا اور اسے احترام کا درجہ دیا گیا۔

ہمارے ہاں بہت سے معاملات میں تبدیلی آئی ہے، سوچ بدلی ہے، خواتین جو پہلے صرف گھروں تک محدود تھیں، اب مختلف میدانوں میں سرگرم عمل ہیں اور اپنی صلاحیتیں منوا رہی ہیں، لیکن یہ تبدیلی ابھی بڑے شہروں تک ہی محدود ہے، خواتین کی اکثریت آج بھی اپنے جائز حق سے محروم ظلم و جبر کا شکار ہے، حقوق خواتین کے سلسلے میں جلسے اور جلوس نکالے جاتے ہیں، ان کے حق میں پارلیمنٹ میں بل منظور کیے گے، لیکن سچ یہ ہے کہ آج تک کسی پر بھی عمل درآمد نہیں ہوا۔

خواتین کو جو حقوق، جو رتبہ اور جو احترام ہمارے مذہب میں دیا گیا ہے، اس کے بعد کسی قرار یا مطالبے کی گنجائش ہی نہیں، صرف ان احکامات اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے، جو مذہب نے متعین کیے ہیں۔

لیکن شاید اصل مسئلہ یہ ہی بے عملی ہے جس میں گزرتے وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

آیئے آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے ہیں اور ایک بار پھر اس بات کو ذہن نشین کرتے ہیں کہ درود پاک، استغفار اور تیسرے کلمہ کے ورد کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا ہے اسی میں ہماری فلاح کا راز ہے۔

اپنا بہت سا خیال رکھیے گا اور ان کا بھی جو آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ کا خیال رکھتے ہیں۔

یہ پہلا خط ہمیں سرگودھا سے اُم ہانیہ کا موصول ہوا ہے وہ لکھتی ہیں۔

اف خدایا اس بار حنا اتنا لیٹ، خدا خدا کر کے دس جنوری کو ملا ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی ہم تمام شکوہ شکایت بھول کر جھوم اٹھے، ٹائٹل کے سحر سے نکل ایک نظر فہرست پر ڈالی، پھر سردار انکل کی باتیں دل لگا کر سنیں ہمیشہ کی طرح پسند آئیں، آگے بڑھے حمد ونعت اور پیارے نبی کی پیاری باتوں سے فیضیاب ہونے کے بعد انشاء جی سے ہیلو ہائے کی اور ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے اس محفل سے باہر آئے، سلسلے وار ناول سدرۃ المنتہیٰ کا ''وہ اک جہاں اور ہے'' بلاشبہ حنا کی زینت ہے، سدرۃ جی بڑی خوبصورتی سے تحریر کو آگے بڑھا رہی ہیں، اتنی اچھی تحریر قارئین کو دینے پر ہم حنا کے اور سدرۃ المنتہیٰ کے شکر گزار ہیں۔

ام مریم کا سلسلے وار ناول اپنے اختتام پر، مصنفہ نے بڑی خوبصورتی سے شروع سے آخر تک دلچسپ بنائے رکھا، اتنی طویل تحریر اور کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں، یقیناً اس کے لئے ام مریم مبارک باد کی مستحق ہیں۔

ناولٹ میں فرحت شوکت نے توجہ اپنی طرف مبذول کروائی، ناولٹ کا نام خوبصورت ہے تحریر اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے دوسری قسط میں ہی تمام کردار سامنے آگئے، یقیناً یہ آگے چل کر مزید دلچسپ ہو جائے گا، تیسری قسط کا شدت سے انتظار ہے "طوق دار کا موسم" روشانے عبدالقیوم کی تحریر کچھ خاص پسند نہیں آئی، وہی گھسا پٹا پرانا موضوع، مکمل ناول میں حیاء بخاری اس مرتبہ جلوہ گر تھیں اچھی کوشش تھی حیاء کی، ام ایمان کا مکمل ناول "بدلا رنگ" بھی پسند آئی، افسانے میں ٹاپ لسٹ پر ڈاکٹر نازش امین کی تحریر "شام شہر یاراں" اس ماہ کی بہترین تحریر تھی شروع سے اینڈ تک دلچسپی سے بھرپور تھی، الفاظ کا چناؤ اتنی خوبصورتی سے کیا گیا تھا کہ مثال نہیں، یقیناً ڈاکٹر نازش امین حنا کے لئے بہترین مصنفہ ثابت ہوں گی قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ "ماں جیسی ساس" قابل غور تحریر تھی واقعی یہ سچ ہے کہ ساس ہمیشہ ماں جیسی ہی ہوتی ہے جو روپ ماں کا اپنی بہو کے لئے مناسب ہوتا ہے وہ بیٹی کے لئے نامناسب، کاش وہ سوچ لیں کہ وہ اگر اپنی بہو کے لئے ماں نہیں تو، تو ان کی بیٹی کی ساس پھر کیسے ماں بن سکتی ہے، ایک تلخ موضوع پر قرۃ العین نے بڑی خوبصورتی سے لکھا، "بس وہی چاہیے" ام اقصیٰ کے افسانے نے بھی متاثر کیا۔

جبکہ فلک ارم ذاکر اور دعا فاطمہ نے بھی اپنی اپنی جگہ اچھی کوشش کی، مستقل سلسلے میں حاصل مطالعہ، بیاض، رنگ حنا، میری ڈائری میں بھی دوستوں نے بہترین انتخاب بھیجا۔

مجموعی طور پر جنوری کا شمارہ جو کہ سالگرہ نمبر تھا بہترین تھا۔

ام ہانیہ کیسی ہیں؟ اور کہاں رہی اتنا عرصہ، جنوری کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تعریف مصنفین کو ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہیں شکریہ قبول کیجئے ان کی طرف سے، ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

ثانیہ تقیم: دیپال پور سے لکھتی ہیں۔

اس ماہ حنا کا سرورق بے حد پسند آیا، سالگرہ نمبر کے حوالے سے ایسا ہی تر و تازہ ٹائٹل ہونا چاہیے تھا ماڈل کی مسکراہٹ اور دانت کیا غضب کے تھے۔

حمد و نعت، پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں پڑھیں، معلومات میں اضافہ ہوا، انشاء نامہ ہمیشہ کی طرح پسند آیا، اس بار نظم بے حد اچھی تھی دل میں اتر گئی۔

مبشرہ ناز نے انتہائی مختصر دن گزارہ حنا کے ساتھ، ام مریم کا ناول "تم آخری جزیرہ ہو" کی ابھی کتنی اقساط باقی ہیں فوزیہ آپی، اب تو تحریر بور ہونے لگی ہے پلیز ام مریم اب اس کا اختتام کر دیں، سدرۃ المنتہیٰ کا "اک جہاں اور ہے" واقعی کسی اور ہی جہاں کا، ہر کردار اپنی اپنی جگہ اہم، نہ لفاظی نہ بلاوجہ طنز و مزاح، انتہائی ڈیسنٹ تحریر ہے، سدرہ کی، جو کہ پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے، حیاء بخاری کا ناول "دسمبر موسم گل ہوا" ایک اچھی تحریر تھی مصنفہ نے شروع سے آخر تک پلاٹ پر گرفت مضبوط رکھی، جبکہ ام ایمان قاضی کا ناول "بدلا پھر رنگ" اپنا کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکا، فرحت شوکت کافی طویل وقفے کے بعد آئیں لیکن آپی ایک شکوہ ہے کہ فرحت بے حد

مختصر لکھ رہی ہیں پلیز فرحت ناولٹ کے صفحات بڑھائیں، روشانے عبد القیوم نے بھی اچھی کوشش کی۔ افسانے اس بار بھی بہترین تھے، ڈاکٹر نازش امین کا افسانہ بہترین تھا، ڈاکٹر نازش امین بھی دو تین سال کے وقفے سے آئی ہیں مگر جب آتی ہیں سب پر چھا جاتی ہیں، نازش صاحبہ کا انداز تحریر بے حد خوبصورت ہے، مستقل سلسلے بھی اپنی اپنی جگہ بہترین تھے۔

ثانیہ تبسم خوش آمدید، جنوری کا شمارہ آپ کے ذوق پر پورا اترا جان کر خوشی ہوئی، ام مریم کے ناول کی اس ماہ آخری قسط شائع کی جا رہی ہے، ام مریم کا ناول طویل ضرور تھا مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ مریم نے ناول کے کسی پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا، ہر کردار کو بخوبی نبھایا، ہم اگلے ماہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

عابد محمود: ملکہ ہانس سے لکھتے ہیں۔

نئے سال کے تحفے کے طور پر جنوری کا سالگرہ نمبر دیدہ زیب سرورق کے ساتھ سجا ملا تو دل کے ویران آنگن میں بہاریں رقص کناں ہو گئیں ہمیشہ کی طرح انکل سردار محمود کی باتیں دل کے نہاں خانوں میں اتر گئیں، حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر دلی طمانیت محسوس ہوئی انشاء جی کی شاعری پڑھ کر ان کی یاد تازہ ہو گئی، بشریٰ ناز سے ملاقات خوب رہی طویل تحریروں میں اس بار ''دسمبر موسم گل ہو'' حیاء بخاری کا اور ''بدلا یوں رنگ قسمت کا'' ام ایمان قاضی، ''طوق دار کا موسم'' روشانے عبد القیوم، ''شام شہر یاراں'' ڈاکٹر نازش امین، ''سراب آرزو'' فلک ارم ذاکر، بے حد پسند آئیں ان تمام رائٹرز کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں، حاصل مطالعہ میں سعدیہ عمر سرگودھا، عارفہ احمد پاکپتن، ام ایمن لاہور اور حرمت عامر سانگھڑ کا انتخاب

لاجواب تھا ''میری ڈائری سے'' سعدیہ عمر، صائمہ رانا، عارفہ احمد اور کرن عدنان کی شاعری میری ڈائری کی زینت بنی۔

بھائی عابد محمود، حنا کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے مصنفین کو مل گئی شکریہ، قبول کیجئے، اپنی رائے سے آگاہ کرتے رہیے گا شکریہ۔

سارا حبیب: چکوال سے لکھتی ہیں۔

جنوری کا شمارہ خوبصورت مسکراہٹ سے سجا ملا، موتی جیسے دانت، شاید ان ہی دانتوں کیلئے کہا گیا ہے۔

آگے بڑھے ہمیشہ کی طرح سردار محمود صاحب کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے اسلامیات کے حصے میں پہنچے، حمد و نعت میں روحی کنجاہی اور تنویر کنجاہی کے کلام سے مستفید ہوئے، پیارے نبی کی پیاری باتوں سے ہمسایوں کے حقوق کے متعلق معلومات میں اضافہ کیا، انشاء نامہ میں انشاء جی کی شاعری سے سجا تھا، بہت خوب دل میں اتر جانے والا کلام، سلسلے وار ناول ام مریم کا آخری جزیرہ ہمیشہ کی طرح شاندار تھا، ام مریم نے ناول کے کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا جس کے لئے وہ مبارک باد کی مستحق ہیں، سدرۃ المنتہیٰ کا ناول ان کی سابقہ تحریروں سے کچھ ہٹ کر ہے کچھ پراسرار سا، اپنے اندر بہت سے راز چھپائے ہوئے، ہر قسط ہی چونکا دینے والی ہوتی ہے مکمل ناول میں ''دسمبر میں موسم گل'' حیاء بخاری کی تحریر بھی بہتر تھی یہ اور بھی بہتر ہو جاتی اگر اتنی طویل نہ ہوتی، ام ایمان قاضی کا نام بھی اس بار حنا کی زینت بنا، بہت اچھی کوشش کی ایمان قاضی نے جس میں وہ کامیاب بھی رہی، ناولٹ میں فرحت شوکت کی تحریر ''رہا جو تیرا ہو کر'' اسٹارٹ اچھا ہے یقیناً آگے چل کر مزید دلچسپ ہو جائے گا، لیکن فوزیہ آپی آپ فرحت سے کہیں کہ اس کے صفحات بڑھائے، انتہائی مختصر صفحات ہیں چودہ سے سولہ صفحات، ناولٹ میں تو نہیں آتے، آگے آپ بہتر جانتی ہیں، روستانے عبد القیوم کا ناولٹ، ''طوق دار کا موسم'' کوئی خاص متاثر نہ کر سکا، جبکہ افسانوں میں ڈاکٹر نازش امین نے انتہائی خوبصورت منظر کشی کی، یوں محسوس ہوتا تھا کہ کرداروں کے ساتھ ساتھ ہم خود بھی وہیں موجود ہیں، ایک اچھے رائٹر کی یہی پہچان ہے، قرۃ العین خرم ہاشمی نے ایک احساس موضوع پر قلم اٹھایا اور ان کا لکھا ایک ایک حرف سچ ہے، جبکہ فلک ارم ذاکر اور دعا فاطمہ نے اچھا لکھا۔

مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح پسند آئے، میرا پسندیدہ سلسلہ ''کس قیامت کے یہ نامے'' ہے میں پہلی مرتبہ اس میں شرکت کر رہی ہوں۔

سارا حبیب اس محفل میں دل و جان سے آپ کو خوش آمدید، حنا سالگرہ نمبر آپ کو پسند آیا بے حد شکر گزار ہیں آپ کے، آپ لوگ جب یہ کہتے ہیں کہ حنا آپ کے معیار پر پورا اترا تو یہ پڑھ کر ہمارا حوصلہ، ہماری لگن مزید بڑھ جاتی ہے، حنا کو خوب سے خوب تر بنانے کے سلسلے میں آپ سب کی محبتوں کے ہم تہہ دل سے شکر گزار رہتے ہیں، اپنی قیمتی رائے سے ہمیں آگاہ کرتی رہیے گا تاکہ ہم حنا کو مزید بہتر بنا سکیں، آپ کی آمد کا بے حد شکریہ۔

☆☆☆